Clear Thinking

by Hy Ruchlis

ٹھنڈے دل سے سوچیے

ہائی رچلس

مشعل

Clear Thinking

by Hy Ruchlis

ٹھنڈے دل سے سوچیے

ہائی رچلس

مشعل

آر۔بی 5 ' سیکنڈ فلور، عوامی کمپلیکس

عثمان بلاک، نیوگارڈن ٹاؤن، لاہور 54600 ' پاکستان

ٹھنڈے دل سے سوچئے

ہائی رچلس

ترجمہ: قاضی جاوید

ناشر: مشعل بکس

آر۔بی ۵' سیکنڈ فلور'

عوامی کمپلیکس' عثمان بلاک' نیو گارڈن' لاہور۔54600 ' پاکستان

فہرست

پیش لفظ

دھرتی پر اس وقت کم از کم بیس لاکھ اقسام کے جاندار موجود ہیں۔ ماضی میں ان اقسام کی تعداد غالباً دو کروڑ کے لگ بھگ تھی۔ گویا جانداروں کی اکثر اقسام اب ناپید ہو چکی تھی۔ ہمارے علم کی شہادت یہ ہے کہ ان لاکھوں قسم کے جانداروں میں سے صرف انسان ہی پیچیدہ بلکہ تجریدی اور مدلل فکر کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ صلاحیت ہم سب کو نصیب ہوئی ہے۔ یہ شرف انسانی کا حصہ ہے۔ صرف یہی صلاحیت ہمیں دوسرے جانداروں سے ممتاز کرتی ہے۔

آپ پوچھیں گے کہ ایسا ہے تو پھر ہمیں سوچنے کے طریقے سکھانے والی کسی کتاب کی ضرورت کیوں ہے؟ ہمارے پاس اس سوال کا جواب موجود ہے۔ ہم یہ کہیں گے کہ اگرچہ سب انسان سوچ سکتے ہیں لیکن سب کی سوچ واضح اور صحیح نہیں ہوتی۔ اسی لیے اس کتاب کا موضوع سوچنا نہیں بلکہ واضح طور پر سوچنا ہے۔

بدقسمتی سے چند لوگ ہی واضح انداز میں سوچتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ واضح اور صحیح انداز میں سوچنے والے بھی کسی نہ کسی وجہ سے بسا اوقات احمقانہ سوچ کے جال میں پھنس جاتے ہیں۔ دوسروں کی مثال دینے کی ضرورت نہیں' خود ہمارا حال بھی یہی ہے۔

منگل کے روز میں صبح ۹ بجے سے سہ پہر ۳ بجے تک ناشرین سے ملتا ہوں اور ایک لنچ کلب جاتا ہوں۔ میں اس کلب کا صدر ہوں۔ یہ روٹین مجھے اچھی لگتی ہے۔ لیکن تمام منگل ایک جیسے نہیں ہوتے' کبھی دھوپ ہوتی ہے' کبھی بادل' بارش اور آندھی طوفان' بعض منگل خوش گوار ہوتے ہیں اور بعض بہت سرد یا گرم۔

کوئی منگل خوش گوار ہو تو میں اس پر کوئی توجہ نہیں کرتا۔ وہ میرے حواس پر سوار

نہیں ہوتا۔ البتہ موسم ناگوار ہو تو فوراً متوجہ کر لیتا ہے۔ کبھی غصہ آتا ہے اور کبھی افسوس ہوتا ہے۔ یکے بعد دیگرے دو منگل اس انداز میں گزر جائیں تو خرابی کا احساس بڑھ جاتا ہے اور اگر تیسرا منگل بھی یونہی آ جائے تو میں کہنے لگتا ہوں کہ ''کم بخت ہر منگل ہی خراب ہوتا ہے''۔ کوئی روشن اور خوش گوار منگل آ جائے تو فریب کا احساس ہوتا ہے۔ گویا میرے نزدیک منگل کو خراب ہی ہونا چاہیے وگرنہ میرے اس اعتقاد کو ضعف پہنچتا ہے کہ ''ہر منگل ہی خراب ہوتا ہے''۔

خیر، ہم سب جانتے ہیں کہ ہفتے کے ایام ہم انسانوں نے ایجاد کیے ہیں اور یہ کہ موسم کا تعین کرنے والی فطری قوتیں دنوں کی تقسیم سے بے نیاز ہیں۔ یہ بھی معلوم ہے کہ اگر ہم گزشتہ برسوں کے موسم کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ ہفتے کے سبھی ایام میں اچھے برے موسم تقریباً یکساں تعداد میں رہے ہیں۔ یہ نہیں کہ ہفتے کا ایک دن بارش کے لیے مخصوص رہا ہو اور دوسرے کے مقدر میں حواس باختہ کرنے والی دھوپ لکھی ہو۔

اچھا تو پھر میں یہ گلہ کیوں کرتا ہوں کہ ہر منگل ہی خراب ہوتا ہے؟ غالباً مجھے یہ طرزِ احساس اچھا لگتا ہے۔ اس سے تاثر ملتا ہے کہ کائنات مجھے تنگ کرنا چاہتی ہے۔ یہ عجیب وغریب اور ڈرامائی قسم کا تاثر ملتا ہے۔ اس میں ایک قسم کی آشنائی بھی ہے۔ میں کسی منگل کو بیدار ہوتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ موسم بالکل واہیات ہے۔ تب میں سینہ پھلا کر کہہ سکتا ہوں ''ہاں لو خود ہی دیکھ لو، دیکھو ذرا''۔

گویا صحیح سوچ کی راہ پر چلتے چلتے کبھی کبھی ہم مسرت سے محروم بھی ہو جاتے ہیں۔

ایک اور مثال لیجیے۔

فرض کیجیے کوئی صاحب آپ کو کسی کاروباری معاملے میں الجھانا چاہتے ہیں۔ آپ انہیں نہیں جانتے۔ یہ اندازہ بھی نہیں کہ ان پر بھروسہ کرنا چاہیے یا نہیں اس الجھن کو دور کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ان صاحب کے جاننے والوں سے مشورہ کیا جائے۔ ان کی معاشی حیثیت اور دیگر کاروباری معلومات حاصل کی جائیں۔ وکیل سے بھی مشورہ کیا جائے۔ ان وسائل سے حاصل ہونے والی معلومات کی روشنی میں آپ بہترین لائحہ عمل کا تعین کر سکتے ہیں۔

ہاں، اس وقت اس سارے بکھیڑے کی ضرورت نہیں رہتی اگر آپ ان صاحب

کی آنکھیں پڑھ سکیں اور جان لیں کہ وہ بھروسے کے قابل نہیں۔ ان کی مونچھیں آپ کو شاطرانہ لگتی ہیں۔ آپ سوچتے ہیں ''نا بابا' ان صاحب سے دور رہنا ہی بہتر ہے۔'' یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ صاحب کسی بڑے ہیرو جیسے دکھائی دیتے ہوں۔ یوں شاید آپ آنکھیں بند کر کے ان پر اعتماد کرنے پر آمادہ ہوں گے۔ بہرحال اس قسم کے طرزِ عمل سے معاملات آسان ہو جاتے ہیں۔

دیکھا آپ نے! صحیح سوچ کے لئے کیسے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ حقائق اور معلومات اکٹھی کرنا پڑتی ہیں' چھان پھٹک کرنا پڑتی ہے' دلائل اور استدلال سے کام لینا پڑتا ہے۔

اس کے برخلاف بلا سوچے سمجھے' جھٹ سے کوئی نتیجہ اخذ کرنا بہت آسان ہوتا ہے۔

نئے زمانہ کی خودساختہ فلسفی فلم ایکٹریس شرلے میکلین کا کہنا ہے کہ سچائی موضوعی ہوتی ہے۔ اس کا مطلب کیا ہے؟ بس یہی نا کہ آپ کسی اوٹ پٹانگ بات کو سچ مان لیتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ وہ دوسروں کی سچائی سے ہم آہنگ ہو۔ یہ نقطۂ نظر فکر کی عظیم الشان انسانی صلاحیت کو پلک جھپکتے ہی رد کر دیتا ہے۔ سوچ کو بے وقعت بنا دیتا ہے اور ہم اشرف المخلوقات کے درجے سے گر جاتے ہیں۔

کبھی آپ نے محسوس کیا کہ ہماری دنیا میں نفرتوں' دکھوں اور جبر و ستم کی بہتات اس لیے ہے کہ بہت سے لوگ صحیح انداز میں نہیں سوچتے۔ ان کے فکری انداز بوسیدہ ہیں۔ ان کی سوچ جذباتی ہے۔ وہ صرف دوسروں کو یہ وطیرہ اپنانے پر آمادہ کرتے ہیں لیکن خود ایسا نہیں کرتے۔

فریب کار اور نیم حکیم عام لوگوں کو آسان فکر کی راہ پر ڈال دیتے ہیں۔ لوگ بھی ان کے پیچھے چلنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ ہماری دنیا کے لاکھوں کروڑوں لوگ پیروں' فقیروں' نجومیوں' جوتشیوں اور حماقت فروشوں کے دیوانے ہیں۔ آسان' جذباتی اور جھوٹی فکر کی عادت ان لوگوں کو اس حماقت سے بچانے کے کام کو اور بھی مشکل بنا دیتی ہے۔

اس قسم کے حماقت فروش بہت سا مال و زر سمیٹ لیتے ہیں۔ ان کے پیروکار اپنی پونجی لٹا دیتے ہیں لیکن فریب کے سوا ان کو کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

شاید کسی حماقت' مثلاً نجوم پر ایمان لانے سے روزمرہ کے معمولات میں آپ کو

ایک طرح کی خوداعتمادی میسر آتی ہے۔ کسی بزرگ کے حضور سر جھکانے سے احساس ہوتا ہے کہ خدا آپ سے محبت کرتا ہے۔ گویا بات بنی ہوئی ہے۔ اب آپ پوچھنا چاہیں گے کہ پھر آخر اس جادونگری سے کیوں نکلا جائے؟

لیکن آپ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ منشیات سے سکون ملتا ہے۔ تو کیا اس طرح منشیات کے استعمال کو جائز ثابت کیا جا سکتا ہے؟

جھوٹا خیال اطمینان بخش ہوسکتا ہے لیکن بالاخر وہ دنیا میں دکھ درد بڑھاتا ہے۔ اس کو قبول کیے رکھنے سے ہماری ذات اور معاشرہ دونوں کو نقصان ہوگا۔ جھوٹا خیال منشیات سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔

نجات کی واحد راہ صحیح اور واضح فکر ہے۔ چنانچہ اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ آپ کو صحیح، واضح اور موثر فکر کے طریقے بتاتی ہے۔

یہ کتاب آپ کی زندگی بدل سکتی ہے۔ سب لوگ اسے پڑھیں تو معاشرہ بدل سکتا ہے۔ دونوں صورتوں میں تبدیلی مثبت ہوگی۔

آئزک ایسی موف

صحیح سوچ کی اہمیت

قطب شمالی میں ایٹمی میزائلوں کے امریکی اڈے پر ایک سارجنٹ نے ریڈار کی سکرین کو غور سے دیکھا اور پھر پریشان ہو کر اپنے کیپٹن سے کہا، لگتا ہے شمال کی طرف سے کئی میزائل ہماری طرف بڑھ رہے ہیں''۔

کیپٹن تیزی سے آگے بڑھا۔ سکرین پر ایک نگاہ ڈالی۔ پھر اپنے کمانڈنگ آفیسر کو اطلاع دینے کے لیے ٹیلی فون کی طرف لپکا۔ اسی دوران میں بہت سے اعلیٰ آفسر سکرین کے گرد جمع ہو چکے تھے۔

ان میں سے کسی نے ٹیلی فون پر ہیڈ کوارٹرز سے رابطہ کرنا چاہا۔ رابطہ نہ ہوا تو اس کا رنگ اڑ گیا۔ ''سر، کال نہیں مل رہی''۔

کیا رابطہ اس لیے نہیں ہو رہا تھا کہ واشنگٹن پہلے ہی ایٹمی حملے کی زد میں آ چکا تھا؟ کیا ریڈار سکرین پر نظر آنے والے متحرک نقطوں کا مطلب یہ تھا کہ ایٹمی میزائل اس اڈے اور دوسرے ٹھکانوں کو تباہ کرنے کے لیے چلے آ رہے تھے؟

اس دور افتادہ اڈے پر موجود چند افراد، کیا وہ بٹن دبانے کی خوفناک ذمہ داری قبول کر سکتے تھے جن کے ذریعے سوویت اڈوں اور شہروں پر جوابی حملہ شروع ہو سکتا تھا؟

فرض کیجئے وہ غلط فہمی میں بٹن دبا دیتے تو کیا ہوتا؟ اس طرح تیسری عالمی جنگ چھڑ جاتی۔ لاکھوں کروڑوں افراد موت کا لقمہ بن جاتے۔ ایک لمحے کے لئے ہماری دنیا کا مقدر ان چند افراد کی صحیح سوچنے کی صلاحیت میں سمٹ آیا تھا۔

کمانڈنگ آفیسر نے اچانک تین سادہ سے الفاظ کہے۔ جنہوں نے یہ معمہ حل کر دیا۔

''(سوویت وزیراعظم) خروشیف کہاں ہیں؟'' کمانڈنگ آفیسر نو پوچھا۔

''جناب وہ نیویارک میں اقوامِ متحدہ کے اجلاس میں شریک ہیں''۔ جواب ملا۔

اس نئی اطلاع نے بلا ٹال دی۔ دنیا تباہی سے بچ گئی۔ سب نے جان لیا کہ روسی اس وقت امریکہ پر حملہ کرنے کی حماقت نہیں کریں گے جب خود ان کا وزیراعظم امریکہ میں موجود ہو۔

یہ منطقی نتیجہ انسانی حافظے میں محفوظ حقائق سے' استدلال کے ذریعے اخذ کیا گیا تھا۔ منطقی سوچ کی صلاحیت نے دور دراز امریکی اڈے پر موجود افسروں کو حقیقت کے قریب پہنچا دیا۔ وہ جان گئے کہ سکرین پر دکھائی دینے والے نقطے میزائلوں کی نشاندہی نہیں کر رہے تھے' ان کا مطلب کچھ اور تھا۔

بعدازاں ان واقعات کی چھان بین ہوئی۔ تب یہ بھید کھلا کہ سکرین پر نظر آنے والے نقطے غالباً چاند پر ریڈار لہروں کے انعکاس سے پیدا ہوئے تھے۔ اچھا تو پھر ہیڈکوارٹرز کے ساتھ رابطہ کیوں منقطع ہوگیا؟ اس کی وجہ کمیونیکیشن کے نظام میں وقتی خرابی تھی۔ روزمرہ کی زندگی میں بھی کبھی کبھار یوں ہوتا ہے کہ دو غیرمعمولی واقعات بیک وقت رونما ہو جاتے ہیں۔

یہ غیرمعمولی واقعہ ہمیں بتاتا ہے کہ بسا اوقات ایک غلط فیصلہ کس قدر تباہی کا باعث بن سکتا ہے۔ اس سے ہم صحیح سوچ کی اہمیت جان سکتے ہیں۔

خیر' چند فیصلے ہی ایسے ہوتے ہیں جو اس قسم کے تباہ کن مضمرات کے حامل ہوتے ہیں۔ تاہم روزانہ ہمیں کئی ایسے فیصلے کرنے پڑتے ہیں جو ہمارے لیے بہت اہم ہوتے ہیں۔ اس کتاب کا مقصد صحیح سوچ کے چند بنیادی اصول پیش کرنا ہے۔ ہم یہ بھی دیکھیں گے کہ ان اصولوں کو استعمال کر کے ہم کئی قسم کے غلط استدلال سے بچ سکتے ہیں۔ ان اصولوں کو سیکھنے اور برتنے سے سوچ بچار کی صلاحیت نکھاری جا سکتی ہے۔ ان سے روزمرہ کے معاملات میں پیش آنے والے مسائل حل کرنے میں خاص طور پر مدد لی جا سکتی ہے۔

استدلال کی انسانی قوت:

چیتا انسان سے تیز بھاگ سکتا ہے۔ شیر بندوق یا کوئی اور ہتھیار استعمال نہیں کر

سکتا لیکن وہ انسان سے بہتر لڑ سکتا ہے۔ پرندے انڈے کی غیر معمولی صلاحیت رکھتے ہیں لیکن ایک معاملے میں انسان کو دوسری تمام مخلوقات پر واضح برتری حاصل ہے...... وہ یہ ہے کہ انسان اعلیٰ تر دماغی صلاحیت رکھتے ہیں۔

اپنی اعلیٰ دماغی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر ہم آوازوں کو بامقصد گفتگو میں ڈھال سکتے ہیں اور اپنے ہم جنسوں تک پیچیدہ خیالات پہنچا سکتے ہیں۔ اسی طرح اپنی تیز انگلیاں استعمال کر کے ہم ان خیالات کو کاغذ پر منتقل کر سکتے ہیں' کمپیوٹر میں ڈال سکتے ہیں اور یوں تیزی سے دوسرے لوگوں تک پہنچا سکتے ہیں۔ ہمارے خیالات کتابوں میں درج ہیں۔ کتابیں کتب خانوں میں محفوظ رہتی ہیں اور مدرسوں میں پڑھائی جاتی ہیں تاکہ ورثے کے طور پر یہ خیالات ہر نئی نسل تک پہنچ جائیں۔ یوں ہم بے شمار علم حاصل کر لیتے ہیں جس کو سمیٹنا کسی ایک فرد کے بس کا روگ نہیں۔

یہ بھی ہے کہ ہر شخص ان خیالات کے بارے میں سوچ سکتا ہے اور نئی معلومات اخذ کرنے کے لئے انہیں مختلف طریقوں سے اکٹھا کر سکتا ہے۔ ان سے ایسی چیزوں کے بارے میں نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں جن کو ہم دیکھ سکتے ہیں' نہ سن سکتے ہیں اور نہ ہی چھو سکتے ہیں۔ اس طریقے سے ہماری قوت استدلال جانوروں کے مقابلے میں بے حد بڑھ جاتی ہے۔

انسانی استدلال' بولنے کی صلاحیت اور ہاتھوں کے ہنرمندانہ استعمال نے ہمیں موٹریں بنانے کے قابل بنا دیا ہے جو کسی بھی چیتے سے تیز دوڑتی ہیں۔ طیارے تیز ترین پرندوں کو بھی پیچھے چھوڑ جاتے ہیں۔ کرینیں اور دوسری مشینیں کسی بھی لادو جانور سے زیادہ وزن اٹھا سکتی ہیں۔ استدلال کی قوت نے ہمیں کئی قسم کے کھانے تیار کرنے کے بھید بتائے ہیں۔ اس کے ذریعے ہم نت نئے کپڑوں سے نئے نئے انداز کے لباس تیار کرتے ہیں۔ پل' فلک بوس عمارتیں' کارخانے' گھر اور کئی قسم کی عمارتیں تعمیر کرتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک عمارت کوئی نہ کوئی مقصد پورا کرتی ہے۔

زمین سے کچی دھاتیں نکال کر ہم انہیں لوہا' المونیم' سکہ' تانبا' ٹین اور کئی دوسری دھاتوں کی صورت دیتے ہیں۔ ہم نے زمین کی گہرائیوں سے کوئلہ' تیل اور گیس نکالنے کے طریقے جان لیے ہیں اور ان ایندھنوں کو گھروں کو گرم کرنے' بجلی پیدا کرنے

اور بہت سی مشینیں اور موٹریں چلانے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

کسی زمانے میں سمندر یا براعظم کو پار کرنے کے لیے کئی مہینے درکار ہوتے تھے۔ اب چند گھنٹوں میں ہزاروں لوگ یہ سب کچھ پار کرتے ہیں۔ ٹیلی فون کے ذریعے ہم دنیا کے کسی بھی کونے میں پلک جھپکتے ہی خود بات کر سکتے ہیں۔ ٹیلی وژن کے ذریعے ہم دنیا کے کسی بھی حصے میں رونما ہونے والے واقعات کو دیکھ سکتے ہیں۔ نیپچون ہماری زمین سے دو ارب میل دور ہے۔ لیکن ہمارے سیٹلائٹ بارہ برس میں وہاں پہنچ کر مفصل تصاویر بھیج سکتے ہیں تاکہ ہم ان کا مطالعہ کریں اور لطف بھی اٹھائیں۔

استدلال کی قوت نے بہت سے حیاتیاتی اصولوں کی دریافت کو ممکن بنا دیا ہے۔ اس طرح ہم بہت سی مہلک بیماریوں کا علاج کرنے کے قابل ہو گئے ہیں۔ ہم نے ایسے پیچیدہ آلات تیار کر لیے ہیں جن کے ذریعے ایٹم کے بھید معلوم کیے جا سکتے ہیں۔ اس طرح حاصل ہونے والی معلومات کو ہم نے بجلی پیدا کرنے کا ایک نیا طریقہ وضع کرنے کے لیے استعمال کیا ہے۔

سوچ بچار کی پیچیدہ صلاحیت اور اس کے ذریعے بہت سے مسائل حل کرنے کے باوجود خوب سے خوب تر زندگی کی جستجو نت نئے مسائل پیدا کرتی رہتی ہے۔ مثلاً ایٹم کے بھید افشا ہونے سے مثبت توانائی کے وسائل حاصل ہوئے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ تباہ کن ہتھیار بھی وجود میں آئے ہیں جو دیکھتے ہی دیکھتے پوری تہذیب کو فنا کر سکتے ہیں۔ دھرتی کے وسائل قابو کرنے سے آلودگی کا مسئلہ پیدا ہوا ہے۔ قدرتی وسائل کا بحران پیدا ہو رہا ہے اور کئی قسم کے جانوروں کی زندگی خطرے میں آ گئی ہے۔ کئی اور ماحولیاتی مسائل بھی سر اٹھا رہے ہیں۔ ہماری اپنی ٹیکنالوجی نے جو مسائل پیدا کیے ہیں، انہیں حل کرنے کے لیے استدلال کی صلاحیت ناگزیر ہے۔

روزمرہ کی زندگی میں بھی یہ صلاحیت بے حد ضروری ہے۔ ہمارے چاروں طرف اشتہار بازی کا ہجوم رہتا ہے۔ اگر ہم سوچ بچار سے کام نہ لیں تو روپے پیسے کے زیاں کو نہ روک سکیں گے۔

جب ووٹ دینے کا وقت آتا ہے تو ہمیں اخباروں اور سیاست دانوں کے بیانات کا جائزہ لینے کی خاطر واضح سوچ کی حاجت ہوتی ہے۔ وقت کے اہم مسائل پر

بحث و مباحثہ ضروری ہوتا ہے اور مناسب فیصلوں تک پہنچنے کی خاطر درست استدلال ناگزیر ہو جاتا ہے۔ صحت مند جمہوری نظام بھی اس وقت پیدا ہوتا ہے جب شہری سیاسی شعور رکھتے ہوں اور صحیح طور پر سوچ سکتے ہوں۔

کئی قسم کی ملازمتوں میں استدلال کی اہمیت ناگزیر ہوتی ہے۔ انجینئر' تاجر' استاد' ڈاکٹر' مستری' دندان ساز' ٹرک ڈرائیور...... غرضیکہ روزی کمانے والے تمام لوگوں کو اپنے کام میں قوت استدلال کی ضرورت پڑتی ہے۔ سائنس' ریاضی اور دیگر علوم میں اعلیٰ قسم کی عقلی صلاحیتیں درکار ہوتی ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ ایسے افراد کا تناسب بڑھتا چلا جائے گا جن کو اپنے فرائض ادا کرنے کے لیے پیچیدہ استدلال کی ضرورت پڑتی ہے۔

گزشتہ چار صدیوں کے صنعتی انقلاب نے ہماری دنیا کو مکمل طور پر تبدیل کر دیا ہے۔ اب وہ ایک عالمی گاؤں جیسی صورت اختیار کر گئی ہے جس میں ہر قوم کے لیے خام مال' مصنوعات' توانائی' نقل و حمل اور مواصلات کے لیے دوسرے ملکوں پر انحصار بتدریج بڑھتا جا رہا ہے۔ قوموں کے باہمی جھگڑے بھی عالمی صورت اختیار کر گئے ہیں۔ لہٰذا پر امن بقائے باہمی کے لیے ذہنی قوتوں کو زیادہ موثر طور پر بروئے کار لانے کی ضرورت بھی بڑھ گئی ہے۔

ایک عملی مثال

روزمرہ کے امور میں صاف اور واضح سوچ کی اہمیت کو کم کرنا دشوار ہے۔ اس سے کامیابی یا ناکامی کا تعین ہوتا ہے اور کبھی کبھی تو بات زندگی اور موت کے فرق تک جا پہنچتی ہے۔ مثال کے لیے دس سالہ لڑکے جانی کی مثال لیجئے۔ اس نے ایک کمزور سی چڑیا کو ایک زیرِ تعمیر عمارت کی بنیاد کے تیس انچ گہرے تنگ سوراخ میں گرا دیکھا۔ مستریوں نے اسے بچانے کی پوری کوشش کی لیکن چڑیا باہر نہ نکالی جا سکی۔ جانی نے پرندے کی نجات کا ایک عمدہ طریقہ ڈھونڈ نکالا۔ اس نے ریت اٹھائی اور آہستہ آہستہ سوراخ میں ڈالنے لگا۔ اس طرح ایک گھنٹے کی کوشش سے سوراخ ریت سے بھر گیا اور چڑیا باہر کے کنارے تک پہنچ گئی۔ جانی نے ہاتھ بڑھا کر اسے اٹھایا اور آزاد کر دیا۔ جیسے جیسے وہ سوراخ میں آہستہ آہستہ ریت ڈالتا تھا ویسے ویسے پرندہ کو ریت کی بڑھتی ہوئی سطح سے پاؤں نکال کر

اوپر چڑھنے کا موقع مل جاتا تھا۔ اس طرح وہ مسلسل کنارے کی طرف بڑھتا گیا۔

آیئے ہم دیکھیں کہ چڑیا کے مسئلے کا یہ حل تلاش کرتے ہوئے جانی کے ذہن میں کس قسم کے خیالات آئے ہوں گے۔ پہلے اس نے چڑیا کو بچانے کے مختلف طریقوں پر غور کیا ہوگا۔ چڑیا کو رسی یا فیتہ باندھ کر باہر کھینچا جا سکتا تھا۔ لیکن اسے رسی کیسے باندھی جائے؟ جانی نے شاید اس حل پر چند لمحے سوچا ہوگا اور پھر اسے مسترد کر دیا ہوگا کیونکہ پرندے کو رسی باندھنا مشکل تھا۔ دیکھنے والی بات یہ ہے کہ جانی کے ذہن میں اس قسم کا خیال آنے پر اس نے پرندے کو واقعی رسی باندھ کر اسے آزمانے کے بجائے خیالوں ہی خیالوں میں اس نے اس طریقے کو آزمایا ہوگا۔ یہ فکر کا ایک بنیادی پہلو ہے۔ دل ہی دل میں ہم کہتے ہیں کہ ''اگر یہ ہوا' تو پھر وہ ہوگا''۔ پھر جو حل ہم منتخب کرتے ہیں اسے پہلے اپنے تخیل میں آزماتے ہیں۔ اس کے بعد ہی حقیقی دنیا میں اس کا استعمال کرتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس قسم کے ''ذہنی تجربات'' سے بہت سا وقت بچ جاتا ہے۔ بعض معاملات میں عملی مسائل کے حل' وقت بچانے والے اس تعجب انگیز طریقہ کار کے بغیر کم و بیش محال ہی ہوتے ہیں۔

خیر' آیئے ہم جانی سے پھر رجوع کرتے ہیں۔ رسی والے حل کو مسترد کرنے کے بعد شاید اسے چھڑی استعمال کرنے کی تدبیر سوجھی ہوگی۔ تاہم اسے فوراً ہی اس طریقہ کار کی مشکلات کا اندازہ ہو گیا ہوگا۔ کسی سکے کو سوراخ سے باہر نکالنے کے لیے تو یہ طریقہ شاید کارآمد ہوتا لیکن پرندے کے معاملے میں یہ بالکل نامناسب تھا۔ پرندہ اس سے زخمی ہوسکتا تھا لہٰذا کوئی اور طریقہ سوچنا ضروری ہو گیا تھا۔

اس بات پر غور کیجئے کہ ذہن ان حقائق کی کس طرح جستجو کرتا ہے جن کا اطلاق موجود مسئلے پر ہو سکے۔ ہر واقعہ کو ذہن میں لاتے ہوئے مسئلے پر اس کا اطلاق کیا جاتا ہے اور تخیل میں اس کے نتیجے کو پرکھا جاتا ہے۔ اس قسم کی ذہنی جستجو فنکاروں' ادیبوں' سائنس دانوں' ریاضی دانوں' موجدوں' کامیاب تاجروں اور سیاست دانوں جیسے تخلیقی افراد کی کامیابی کا ایک راز ہے۔ دانش مندی کی بات یہ ہے کہ مسائل حل کرنے کی اپنی صلاحیت بڑھانے کی خاطر ہم اپنے ذہن میں اس قسم کی منظم جستجو کو ترقی دیں۔

چلئے' ہم جانی اور اس کے مسئلے کی طرف ایک بار پھر توجہ کریں۔ ہوسکتا ہے کہ اس کو رسی کے سرے پر مقناطیس باندھ کر پرندے کو باہر کھینچنے کا بھی خیال آیا ہو۔ لیکن جانی

کو اس بات کا تجربہ تھا کہ مقناطیس لوہے اور فولاد جیسی چند دھاتوں کو ہی کھینچ سکتا ہے۔ شاید پھر اس نے سوچا ہو کہ چڑیا کے پاؤں کے نیچے لوہے کا کوئی ٹکڑا رکھ کر مقناطیس کی مدد سے اسے باہر نکالا لیا جائے لیکن اس طریقے میں پیش آنے والی نئی مشکلات کا فوراً ہی اسے احساس ہو گیا ہو گا۔ چنانچہ کسی اور طریقے کی جستجو شروع ہو گئی۔

شاید وہ سوراخ میں پانی ڈال کر چڑیا کو باہر نکال سکتا تھا لیکن پانی کیا سوراخ میں ٹھہرتا؟ پرندہ کیا پانی میں ڈوب نہ جاتا؟

کیونکہ نہ ریت استعمال کی جائے؟ جانی سوراخ میں ریت ڈال کر چڑیا کو باہر نکالنے کے امکان کا جائزہ لے سکتا تھا۔ تخیل کی آنکھ سے وہ دیکھ سکتا تھا کہ ریت چڑیا کے پاؤں پر گرے گی اور وہ پاؤں اوپر اٹھا کر ریت سے بچنا چاہے گی۔ اس طرح رفتہ رفتہ وہ باہر کی طرف بڑھتی جائے گی۔ جانی یہ بھی جان سکتا تھا کہ اگر زیادہ ریت ایک ہی بار ڈال دی گئی تو پرندہ اس میں دب بھی سکتا ہے۔ یوں دم گھٹنے سے وہ مر سکتا ہے۔ چنانچہ اس نے تھوڑی تھوڑی ریت ڈال کر پرندے کو باہر نکالنے کا فیصلہ کیا۔

مسائل حل کرنے کا بنیادی انداز:

جانی نے جس طریقے سے اپنا مسئلہ حل کیا' وہ ہمیں دوسرے مسائل حل کرنے میں ایک نمونے کا کام دے سکتا ہے۔ آیئے ہم اس طریقے کی بنیادی خصوصیات طے کر لیں۔

۱۔ یہ حل ماضی کے تجربے اور ذہن نشین ہو جانے والے حقائق پر مبنی ہے۔

۲۔ جن حقائق کا اطلاق مسئلے پر ہوتا ہے' ان کو دماغ میں موجود یادداشتوں کے بڑے ڈھیر سے ایک ذہنی تلاش کے ذریعے اکٹھا کیا جاتا ہے۔ ایک ایسے طریقے سے جس کو ابھی تک پوری طرح سمجھا نہیں جا سکا ہے' ہم اپنے ذہنوں کو صرف وہ حقائق فراہم کرنے پر آمادہ کرتے ہیں جن کا اطلاق موجودصورتِ حال پر ہوتا ہے۔ اس طرح وہ بے شمار حقائق نظر انداز کر دیئے جاتے ہیں جن کا زیرِ توجہ مسئلے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

۳۔ مختلف امکانی حل مرتب کرنے کے لیے قابلِ اطلاق حقائق کی ذہن میں چھان

پھٹک کی جاتی ہے۔ ذہنی تجربوں کا جائزہ لینے کے لیے مختلف حقائق کو اکٹھا کرنا' درست طور پر استدلال کرنا اور پھر ان سے نتائج اخذ کرنا واضح سوچ کا جوہر ہے۔

۴۔ اس قسم کی فکری سرگرمیوں کا سلسلہ' امکانی حلوں کی تخلیق کی طرف رہنمائی کرنے والے مسئلہ کے حل کے ساتھ مل کر بالآخر ایک مجموعی نتیجہ پر ختم ہوتا ہے۔ ہر صورتِ حال کا ہم ذہنی طور پر جائزہ لیتے ہیں اور کوئی فیصلہ دیتے ہیں۔ پھر ہم بہت سے امکانی حلقوں میں سے کسی ایک کو بہترین سمجھتے ہوئے چن لیتے ہیں۔

۵۔ آخرکار ہم مسئلے کو حل کرنے کی خاطر عمل شروع کر سکتے ہیں۔ یہ واضح سوچ کا بنیادی مقصد اور اچھے استدلال کا حتمی امتحان ہے۔ عمل کا مقصد مسئلے کو حل کرنا ہوتا ہے۔ مسئلہ حل نہ ہو تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ کھیل ختم ہو گیا۔ ہم اس کے نتیجے کو' چاہے وہ کامیابی ہو یا ناکامی' ایک تجربے کے طور پر ذہن میں محفوظ کر لیتے ہیں۔ چنانچہ آئندہ جب کبھی ویسی ہی صورتِ حال پیدا ہوتی ہے تو مناسب فیصلے کے لیے اس تجربے سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔

بعض مسائل محض ذہنی ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر ریاضی کا کوئی مسئلہ کوئی عملی قدم اٹھانے کی ضرورت کے بغیر ہی ذہن میں ختم ہو سکتا ہے۔ اسی طرح سیاسی امور اور دوسرے لوگوں کے بارے میں ہمارے اکثر فیصلے ذہنی حد تک ہی رہتے ہیں۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ بعدازاں جب ہم ووٹ دینے جائیں' کسی مسئلے پر اپنی رائے کا اظہار کریں یا کسی فرد کو جواب دے رہے ہوں تو عمل تک بھی نوبت پہنچ جائے۔

تاہم اکثر مسائل کا تعلق خارجی حالات سے اس طرح ہوتا ہے کہ وہ ہم سے اپنے حل آزمانے کا تقاضا کرتے ہیں۔ بسا اوقات ہمیں اپنے حل کو فوراً آزمانے کی ضرورت ہوتی ہے' وگرنہ وہ بے کار ہو جاتا ہے۔ اس کی مثال ہم جانی اور چڑیا کے قصے میں دیکھ سکتے ہیں۔ بعض دوسری صورتوں میں فوری عمل درکار نہیں ہوتا اور ہم اسے ملتوی کر سکتے ہیں۔

اس دوسری قسم کے معاملات میں اہم بات یہ ہے کہ ہم اپنے حل کو آزمائیں اور اسے پرکھ لیں۔ ورنہ ہو سکتا ہے کہ جو طریقہ کار ہم نے سوچا ہے وہ غلط ثابت ہو۔ فیصلے

چونکہ دوسروں تک بھی پہنچتے ہیں' اکثر اوقات تو وہ کئی نسلوں تک منتقل ہوتے ہیں' لہٰذا یہ اہم بات ہے کہ جس قدر جلد ممکن ہو' ان کو پرکھ لیا جائے۔

جانی کی مثال پر ایک بار پھر توجہ کیجئے۔ اگر وہ اپنے تجویز کردہ حل پر عمل نہ کرتا اور معاملے کو صرف سوچ تک رہنے دیتا تو یہ ایک لغوسی بات ہوتی۔ اسکی سوچ عملی اہمیت کی حامل تھی کیونکہ جب اس نے عمل کیا تو اس کا حل کامیاب رہا اور چڑیا کی زندگی بچ گئی۔ اب مطبوعہ لفظ کی قوت کے ذریعے اس کا حل ہزاروں لوگوں تک پہنچ رہا ہے۔ اب لوگ اس قسم کی صورتِ حال پیش آنے پر زیادہ سرعت سے مسئلہ حل کرسکیں گے۔ ہوسکتا ہے اس طریقے سے وہ کسی پرندے کے بجائے کسی بچے کی زندگی بچالیں۔

اس طریقے سے حقائق جمع ہوتے رہتے ہیں اور لوگوں کو ایسے بہت سے مسائل حل کرنے کے قابل بنادیتے ہیں جن کو وہ محض اپنے طور پر شاید حل نہ کرسکتے ہوں۔

اس کتاب کا مقصد کیا ہے؟

ظاہر ہے کہ یہ کتاب ہمیں ہر قسم کے مسائل حل کرنے کے قابل نہیں بناسکتی۔ لیکن اگر اس کے مطالعہ سے ہماری زیرکی اور دانائی میں ذرا سا بھی اضافہ ہوسکے تو اس کتاب کا مقصد پورا ہوجائے گا۔ شاید اس کے ذریعے ہم فکر و استدلال کے طریقوں کے گہرے مطالعے سے متعارف ہوسکیں۔ اس طرح یہ کتاب زندگی کے کئی قسم کے مسائل حل کرنے کی ہماری اہلیت میں بہت اضافہ کرسکتی ہے۔

کتاب کے دوسرے باب کا عنوان ''حقائق کی نوعیت'' ہے۔ اس میں اکثر حقائق کی فریب کار نوعیت پر بحث کی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ مسائل پر غور و فکر کرتے ہوئے اکثر حقائق کے بہت سے استثنا کو نظر انداز کرنے سے ہم بری طرح گمراہ ہوسکتے ہیں۔

''توہمات اور سائنس'' اس کتاب کے تیسرے باب کا عنوان ہے۔ اس میں ہم دیکھیں گے کہ سائنسی فکر نے ہماری استدلال کی صلاحیت کو بہتر بنانے میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ علاوہ ازیں ہم یہ بھی دیکھیں گے کہ بہت سے لوگوں کی سوچ پر آج بھی قدیم توہمات کا گہرا اثر ہے۔ یوں وہ سوچ بہت سے نجی مسائل حل کرنے میں رکاوٹ بنتی ہے۔

''استدلال کا عمل'' چوتھے باب کا موضوع ہے۔اس باب میں ہم اپنے فکر کے طریقوں کے بارے میں بہت کچھ سیکھیں گے۔ اس میں استقرائی اور استخراجی دونوں طریقے زیرِ بحث لائے گئے ہیں۔

''زبان اور استدلال'' کے عنوان سے پانچویں باب میں استدلال میں زبان کا اہم کردار زیرِ بحث لایا گیا ہے۔علاوہ ازیں ان مختلف طریقوں کی وضاحت بھی کی گئی ہے جن سے مختلف سیاق وسباق میں الفاظ کے مختلف مفاہیم پیشِ نظر نہ رکھنے سے مفہوم میں کنفیوژن پیدا ہوتا ہے۔

چھٹے باب میں ''استدلال کی عمومی غلطیاں'' زیرِ بحث لائی گئی ہیں۔ یہ باب استدلال کی عام غلطیوں کی وضاحت کرتا ہے' جو مسائل کے حل تلاش کرنے میں رکاوٹ پیدا کرتی ہیں۔

ساتویں باب کا عنوان ''نجوم: غلط استدلال کی ایک کیس سٹڈی'' ہے۔اس میں ایک ایسے مقبول عام توہم کے تجزیے کی مشق فراہم کی گئی ہے جس سے بہت سے لوگ اپنی زندگیوں میں رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔

آٹھواں باب ''متصادم آرا'' رائے عامہ کے جائزہ کو کم یقینی بنانے میں ''گمشدہ حقائق'' کے کردار پر بحث کرتا ہے۔اس میں رائے عامہ کے جائزوں کے اہم کردار کی وضاحت بھی کی گئی ہے اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ وہ عوام کو کیسے متاثر کرتے ہیں۔

نویں باب میں ''انسانی تعلقات میں متعصبانہ آرا کے نقصان دہ اثرات'' پر بحث کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ انہیں کم کیسے کیا جا سکتا ہے۔

دسواں باب اس بارے میں ہے کہ رائے عامہ کیونکر متاثر ہوتی ہے۔ یہ باب ہمیں ان مختلف طریقوں سے خبردار کرتا ہے جن کو استعمال کر کے اشتہار باز رائے عامہ پر اثرانداز ہوتے ہیں۔

گیارہویں باب میں ''اشتہار بازی میں استدلال کی غلطیوں'' کو موضوعِ سخن بنایا گیا ہے۔ یہ باب ہمیں مشتبہ خوبیوں کی مصنوعات یا زیادہ قیمت پر اشیاء فروخت کرنے کے لیے استعمال ہونے والے اشتہاری کرتبوں سے آگاہ کرتا ہے۔

بارہواں باب اس کتاب کا آخری باب ہے۔اس آخری باب میں کتاب میں

پیش کیے جانے والے اہم تصورات کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے اور واضح سوچ کے بنیادی اصول تجویز کیے گئے ہیں۔

آیئے ہم حقائق کی ماہیت کے تجزیئے سے آغاز کریں۔ حقیقی دنیا کے تمام مسائل حل کرنے کی اساس یہی ہے۔ آئندہ باب میں ہم استدلال کے عمل کے بعض اہم پہلو زیرِ بحث لائیں گے اور خاص طور پر یہ جاننے کی کوشش کریں گے کہ امر واقعہ سے کیا مراد ہے؟ ہم کس طرح یہ جان سکتے ہیں کہ فلاں حقائق درست ہیں؟ غیر واضح حقائق کی وہ حدود کون سی ہیں جن کو نظر انداز کرنے سے کئی مغالطے پیدا ہوتے ہیں؟

حقائق کی ماہیت

۱۹۰۳ء میں ممتاز فرانسیسی طبیعات دان رینے بلاندلو کی ''دریافت'' سے لگتا تھا کہ سائنس کی ایک اور نئی شاخ وجود میں آنے کو ہے۔ اس نے اپنی دریافت کو ''این ریز'' کا نام دیا تھا جو ایکس ریز سے خارج معلوم ہوتی تھیں۔ بہت سے فرانسیسی سائنس دانوں نے اس نئے مظہر کی چھان بین شروع کر دی۔ چند ہی برسوں میں لگ بھگ ایک سو تحقیق کاروں نے اس موضوع پر تین سو سے زیادہ سائنسی مقالات لکھ دیئے۔ ان میں سے اکثر فرانسیسی تھے۔

لیکن ان ''این ریز'' کے معاملے میں ایک الجھن درپیش تھی۔ ان ''ریز'' کی موجودگی کا پتہ دونوکیلی تاروں کے درمیان برقی شرارہ میں معمولی اضافہ سے ملتا تھا۔

برقی شرارہ کی چمک میں اضافے کا تعین آنکھ سے کیا جاتا تھا جو ظاہر ہے کہ زیادہ قابلِ اعتماد نہیں ہوتی۔ تاہم اس امر کو بالکل ہی نظرانداز کر دیا گیا اور دوسرے طبیعات دان بھی جلد ہی بلاندلو کے نتائج کو دہرانے اور انہیں وسعت دینے لگے۔

نینسی یونیورسٹی سے تعلق رکھنے والے ایک رفیق کار نے یہ دریافت کیا کہ ''این ریز'' صرف ایکس ریز سے ہی خارج نہیں ہوتیں بلکہ انسانی جسم کے اعصابی نظام سے بھی نکلتی ہیں۔

سوربون یونیورسٹی کے ایک طبیعات دان نے یہ دیکھا کہ ''این ریز'' دماغ کے ایک خاص حصے سے خارج ہوتی ہیں۔ یہ حصہ بولتے ہوئے انسان کی گفتگو کو کنٹرول کرتا ہے۔ دوسرے لوگوں نے گیسوں اور کیمیکلز میں بھی این ریز کو دریافت کر لیا۔ این ریز کی جستجو جلد ہی فرانسیسی سائنس دانوں کا محبوب مشغلہ بن گئی۔

سائنس کی ایک نئی شاخ کا آغاز کرنے پر فرانس کی اکیڈمی آف سائنسز نے بلاندلو کو ایک بڑے ایوارڈ سے بھی نوازا۔ لیکن یہ سارا معاملہ اس وقت خراب ہو گیا جب آر ڈبلیو ووڈ نامی ایک امریکی ماہرِ طبیعات نے اندھیرے میں این ریز کے ایک تجربے کا مشاہدہ کرتے ہوئے ایک ایسا طیف ہٹا دیا جس کو بلاندلو این ریز کی ایک مفروضہ خاص خصوصیت کی نشاندہی کے لیے استعمال کر رہا تھا۔ ہوا یہ کہ طیف اگرچہ تجربے کا اہم جز وتھی' لیکن اس کو ہٹانے سے کوئی فرق نہ پڑا۔ بلاندلو کو پہلے جیسے ہی نتائج دکھائی دیتے رہے۔ اس سے یہ واضح ہو گیا کہ بلاندلو محض خیالی ''این ریز'' کے اثرات کا ''مشاہدہ'' کر رہا تھا۔ غیر موجود این ریز کے بارے میں ووڈ کی رپورٹ نے بالاخر ''سائنس کی اس نئی شاخ'' کا قصہ تمام کر دیا۔ تاہم فرانسیسیوں کو چونکہ اس دریافت پر فخر تھا اسلیے کچھ عرصے تک اس کا چرچا ہوتا رہا۔ این ریز کو فرانسیسی سائنس کی کامیابی سے تعبیر کیا جا رہا تھا جو اس زمانے میں جرمن سائنس کے آگے دھندلائی ہوئی تھی۔ لگتا ہے کہ ایکس ریز کے مقابلے میں خود اپنی دریافت کو قبول کرنے پر فرانسیسی سائنس دانوں کی خواہش نے ان میں سے اکثر کو وہ کچھ دیکھنے پر آمادہ کر دیا تھا جس کا کوئی وجود ہی نہیں تھا۔

یہ اپنی نوعیت کی واحد مثال نہیں اور بھی ایسی مثالیں ملتی ہیں۔ سوال اب یہ ہے کہ اگر سائنس دان بھی اپنے حقائق کا تعین مناسب طور پر نہیں کر سکتے تو پھر ہم جیسے عام لوگوں کا کیا حال ہوگا۔ یہ مثال ہمیں بتاتی ہے کہ اکثر اوقات واقعات ویسے نہیں ہوتے جیسے وہ رپورٹ کیے جاتے ہیں۔ لوگ ان پر تعین کر سکتے ہیں اور انہیں درست تسلیم کرتے ہوئے ان پر عمل پیرا ہو سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں معاملہ یہ بھی ہے کہ بہت سے ''حقائق'' محض جزوی طور پر سچے ہوتے ہیں' لیکن لوگ انہیں ہر حال میں درست سمجھتے لگتے ہیں۔ اس قسم کے مکمل طور پر غلط یا جزوی طور پر درست حقائق ہماری پیچیدہ تہذیب کے کئی نجی اور سماجی مسائل حل کرنے کی ہماری کوششوں کی بری طرح متاثر کرتے ہیں۔ لہٰذا حقائق کی ماہیت سے آگاہ ہونا بے حد ضروری ہے۔ یہ بھی جاننا چاہئے کہ ہم یہ کیسے جان سکتے ہیں کہ حقائق ممکنہ حد تک درست اور صحیح ہیں۔

اوپر بیان کی جانے والی مثال کو ایک بار پھر ذہن میں لائیے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کرنا چاہئے کہ ہم حقائق پر کبھی بھروسہ نہیں کر سکتے۔ اصل بات یہ ہے کہ این ریز

کے معاملے میں تبدیلی بہت معمولی تھی اور اس کو جانچنے کے لیے سائنس دان اپنی آنکھوں پر بھروسہ کر رہے تھے۔ یہ طریقہ کار مغالطہ آمیز تھا' کیونکہ اس صورت میں مشاہدہ کرنے والوں کی شہرت حاصل کرنے یا قومی وقار میں اضافہ کرنے کی خواہش نتائج پر اثر انداز ہو سکتی تھی۔

فرانسیسی سائنس دانوں کے مغالطے میں یہ درس پوشیدہ ہے کہ حقائق کو درست تسلیم کرتے وقت ہمیں بہت زیادہ احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ اختلاف کرنے والوں کی بات ہمیں پوری توجہ سے سننی چاہیے اور چھان پھٹک کے بعد حقائق کو قبول کرنا چاہیے۔

امر واقعہ کیا ہوتا ہے؟

امر واقعہ کی تعریف میں بنیادی لفظ ''حقیقت'' ہے۔ واقعہ کی بنیاد افسانے پر ہو سکتی ہے اور نہ ہی تخیل پر۔ یہاں ''حقیقت'' سے ہماری مراد یہ ہے کہ امر واقعہ کا جائزہ دیکھنے' سننے' چھونے' سونگھنے اور چکھنے کے حواس سے لیا جائے۔ ساتھ ہی ساتھ ان آلات سے بھی مدد لینی چاہیے جو غیر واضح چیزوں کی نشاندہی کرنے یا انہیں ناپنے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔

حقائق کے گروپوں کی عمومی حقائق میں صورت گری بھی کرنی چاہیے (چوتھے باب میں یہ موضوع زیرِ بحث لایا جائے گا) اس طرح ہمیں مسائل حل کرنے میں بہت زیادہ مدد ملتی ہے۔ تاہم ایسے حقائق کے معاملے میں بہت احتیاط سے کام لینا چاہیے کیونکہ جب حالات پیدا ہوتے ہیں تو استثنائی صورتیں بھی رونما ہوتی ہیں۔ اس کتاب میں ہم ایسی کئی مثالوں کا ذکر کریں گے۔

ہمارے ذہن خلا میں نہیں سوچ سکتے۔ مسائل حل کرنے کے خاطر حقائق کو بروئے کار لایا جاتا ہے۔ لہٰذا حقائق کا ممکنہ حد تک درست ہونا ناگزیر ہے۔ بسا اوقات ہمارے پاس ٹھوس حقائق موجود نہیں ہوتے' لیکن ہمیں اہم فیصلے کرنے پڑتے ہیں۔ اس صورت میں ہم جس راہ کو بہترین سمجھتے ہیں اس کو اختیار کر لیتے ہیں۔ تاہم ہمیں جلد سے جلد حقائق کے حصول کا خیال رہتا ہے۔

یہ بات ایٹمی میزائلوں کے اس واقعہ کے حوالے سے بالکل بجا تھی جس کا ذکر ہم

نے اس کتاب کے آغاز میں کیا تھا۔ ریڈار کی سکرین پر نقطے واقعی دکھائی دے رہے تھے۔ ان کا مشاہدہ کیا گیا تھا۔ تاہم یہ امر واقعہ نہیں تھا کہ میزائل اس اڈے پر حملہ کرنے کے لیے بڑھ رہے تھے۔ حالانکہ سکرین پر دکھائی دینے والے نقطوں سے بظاہر یہی نتیجہ اخذ ہوتا تھا۔ اصل میں یہ سکرین پر نظر آنے والے نقطوں کی غیر محتاط تعبیر تھی۔

گمشدہ حقائق

قطب شمالی کے ریڈار اڈے والا ماجرہ جب شروع ہوا' تو اس وقت عملی قدم اٹھانے سے متعلق فیصلہ کرنے کے لیے حقائق ناکافی تھے۔ گویا یہ ''گمشدہ حقائق'' والا معاملہ تھا۔ اکثر حل طلب مسائل میں اس قسم کی صورتِ حال پیش آیا کرتی ہے۔

بنیادی مشکل ریڈار کی نوعیت سے پیدا ہوئی تھی۔ یہ آلہ میزائلوں کو ''دیکھتا'' نہیں۔ حقائق کی نشاندہی میں مدد دینے والے دوسرے تمام آلات کی طرح ریڈار بھی انسانی حواس کی توسیع ہے۔ اس کے کام کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ وہ لہریں باہر کی طرف بھیجتا ہے اور دور دراز کی اشیاء کے انعکاسات کا سراغ لگاتا ہے۔ ان اشیاء کا تعین انسانی توجیہ سے ہوتا ہے اور یہیں سے مشکلات پیدا ہوتی ہیں۔

جزیرہ ''تھری مائل'' میں ایٹمی توانائی کے مرکز کی تباہی' چرنوبل کے ایٹمی پلانٹ کا حادثہ' چیلنجر شٹل کی تباہی' الاسکا کے ساحل پر تیل کا بڑا حادثہ اور چند سال پہلے بھوپال میں کیمیائی مواد کی وسیع پیمانے پر ہلاکت آفرینی جیسے حادثوں کے اسباب پر غور کیجئے۔ یہ تمام حادثے تعبیر و توجیہ' انتظام کاری اور آلات کی ڈیزائننگ جیسے امور میں انسانی غلطیوں کا نتیجہ ہیں۔ آلات عام طور پر دھوکہ نہیں دیتے۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ کسی وقت وہ کام درست طور پر نہ کریں۔ اعداد شمار کو درست طور پر پڑھا جائے تو آلات عموماً درست اطلاعات مہیا کرتے ہیں۔ یہ اور معاملہ ہے کہ افراد ان معلومات کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔

ہمارے ایٹمی دور کا ایک مہیب خطرہ یہ ہے کہ تیسری عالمی جنگ کسی بھی انسانی غلطی کے نتیجے میں شروع ہوسکتی ہے۔ یہ غلطیاں کئی قسم کی ہوسکتی ہیں۔ قطب شمالی کے فوجی اڈے کی مثال ہم نے اس کتاب کے آغاز میں پیش کی تھی جہاں حواس اور آلات کے

ذریعے حاصل ہونے والی معلومات کی تعبیر غلط کی گئی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی غلطی نہایت خطرناک ثابت ہوسکتی ہے۔

تاریخ میں اس قسم کی غلطیوں کے انتہائی نقصان دہ نتائج کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ بسا اوقات ان کے نقصان دہ مضمرات صدیوں تک جاری رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر امریکہ کے جنوبی علاقوں میں غلامی کا رواج سترہویں اور اٹھارہویں صدیوں میں ہوا اور غلامی اس علاقے کی کپاس کی کاشت پر مبنی معیشت کا ایک اہم حصہ بن گئی۔ اس بدی کا جواز اس مقبول عام نظریئے کے ذریعے فراہم کیا گیا کہ افریقہ کے سیاہ فام لوگ انسانوں کی کمتر نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس نظریئے کے ذریعے غلامی کو امریکہ اور خصوصاً اس کے جنوبی علاقوں میں مستحکم بنا دیا گیا تھا۔

سفید فام لوگوں کی برتری اور سیاہ فاموں کی کمتری پر یقین' ایک مغالطہ یا یوں کہئے کہ ایک غلط ''واقعہ'' پر یقین تھا۔ امریکہ کے لیے اس سے نہایت ہی خوفناک نتائج پیدا ہوئے۔ اس نے سماجی اور سیاسی تضاد میں شدت پیدا کی جو بالاخر امریکی خانہ جنگی پر منتج ہوئی۔ اس خانہ جنگی میں دس لاکھ سے زیادہ انسان ہلاک ہوئے تھے اور ستم ظریفی یہ ہے کہ ان میں سے اکثریت کا تعلق سیاہ فام نسل سے نہیں تھا۔

اس غلط عقیدے کے نتائج ابھی تک امریکی معاشرے میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ وہاں ابھی تک نسلی امتیاز کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے۔

اسی طرح ۱۹۳۰ء کے عشرے میں ہٹلر اور اس کے پیروکاروں نے جرمنی میں یہ نظریہ پھیلایا تھا کہ جرمن لوگ اعلیٰ آریائی نسل سے تعلق رکھتے ہیں جبکہ یہودیوں' جپسیوں اور دوسری اقلیتوں کا تعلق بدنسلوں سے نہیں تو کم از کم کمتر نسلوں سے ضرور ہے۔ ''کاذب حقائق'' پر مبنی یہ عقیدہ نہ صرف دوسری جنگ عظیم کا ایک سبب بنا بلکہ لاکھوں یہودیوں کو اس کے باعث اذیت کا نشانہ بنایا گیا اور لاکھوں کو قتل بھی کیا گیا تھا۔

''گمشدہ حقائق'' سرد جنگ کے زمانے میں امریکہ اور سوویت یونین کے درمیان تجدید اسلحہ کے معاہدوں کی راہ میں بڑی رکاوٹ بنا کرتے تھے۔ ان معاہدوں کے لیے کام کرنے والے سفارت کار بہت سا وقت ''حقائق'' کی تصدیق کرنے والے نظاموں کی تشکیل پر صرف کرتے تھے۔ ان کی توجہ کا مرکز اس قسم کے مسائل رہتے تھے کہ

دونوں ملکوں کے پاس کس قدر میزائل ہیں، کس قسم کے میزائل ہیں اور وہ کہاں رکھے گئے ہیں۔ یا یہ کہ اس بات کا تعین کیونکر ہوگا کہ کتنے میزائل واقعی تباہ کیے گئے ہیں۔

خیر، یہ خطرہ اب بھی موجود ہے کہ دہشت گرد کسی ایٹمی ہتھیار کا دھماکہ کر دیں اور اس سے جنگ شروع ہو جائے۔

حقائق کی معروضی تصدیق لازمی ہے

نام، پتہ، ٹیلی فون نمبر یا سوشل سیکورٹی کارڈ کے نمبر جیسے سادہ حقائق کی تصدیق کے لیے عموماً کوئی بڑی دشواری پیش نہیں آتی۔ ان کو ریکارڈ کرنے میں غلطی نہ کی گئی ہو، فریب کاری نہ ہو یا پھر ایک ہی نام کے دو افراد نہ ہوں تو ان امور کے معاملے میں کم ہی مشکلات پیش آتی ہیں۔ ان کے مقابلے میں زیادہ پیچیدہ یا عمومی حقائق کا معاملہ مختلف ہے۔ ان کی تصدیق مشکل ہوا کرتی ہے۔ مثال کے طور پر یہ جملہ دیکھئے کہ ''سیارے ایسے اجرام فلکی ہیں جو آسمان میں مستحکم ستاروں کے پسِ منظر میں حرکت کرتے ہیں''۔ سوال یہ ہے کہ آیا ہم اس بیان کو درست تسلیم کر سکتے ہیں؟

اس باب میں آگے چل کر ہم دیکھیں گے کہ اس بیان کی آسانی سے غلط تعبیر کی جا سکتی ہے۔ اس قسم کے واقعہ کی تصدیق کرنا اور ان حدود کا تعین کرنا جن میں وہ درست یا غلط ہو سکتا ہے، بہت دشوار کام ہے۔

بہرطور درست ہونے کا دعویٰ کرنے والا کوئی واقعہ اس وقت تک قبول نہیں کرنا چاہیے جب تک کسی معروضی طریقہ سے اس کی تصدیق نہ ہو جائے۔ لفظ ''معروضی'' مشاہدہ کرنے والے کے رویے کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اس کو حقائق کی صداقت یا کذب کا جائزہ لیتے وقت غیر جذباتی اور غیر متعصّب ہونا چاہیے۔ تصدیق سے پہلے ہی کسی واقعہ کو درست تسلیم نہیں کرنا چاہیے۔

موضوعی ہونے سے مراد یہ ہے کہ ''حقائق'' کی چھان بین کرتے ہوئے جذباتی اور متعصّبانہ رویہ اختیار کیا جائے۔

تصدیق سے مراد یہ ہے کہ واقعہ کی جانچ کرتے ہوئے زیادہ تر مشاہدے کے ذریعے ایسی شہادت فراہم کی جائے جو زیرِ توجہ واقعہ کو درست ثابت کر دے۔ اکثر

اوقات حقائق درست ثابت ہوتے ہیں۔ تاہم اس امر کی حدود موجود ہوتی ہیں کہ مختلف حالات میں ان کا اطلاق کب، کہاں اور کیسے ہوتا ہے۔ معروضی تصدیق کا تصور سائنس کی ایک بڑی عطا ہے۔ دنیا کے بارے میں حقائق کی فراہمی میں یہ تصور بہت کامیاب ثابت ہوا ہے۔ اب ان تصورات کا علم کے سماجی، معاشی اور سیاسی شعبوں میں زیادہ سے زیادہ اطلاق کیا جا رہا ہے۔

سائنس میں حاصل ہونے والی کامیابیوں کے پیشِ نظر ناپ تول کو حقائق کی فراہمی کا ایک اہم وسیلہ سمجھا جاتا ہے۔ ہمارے حواس سادہ اشیاء کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لینے میں بھی عام طور پر ناکافی ثابت ہوئے ہیں۔ رولر، سکیل، کلاک، تھرمامیٹر، بیرومیٹر اور سپیڈومیٹر جیسے پیمائش کے آلات استعمال کر کے ہم مشاہدوں کو بڑی حد تک بہتر بنا سکتے ہیں۔ نفسیات اور علم الانسان جیسے علوم کی ترقی سے پیمائش کے نئے طریقے وجود میں آئے ہیں۔ ان میں انسانی رویے اور اندازے اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

مشاہدے کے لیے حواس پر بھروسہ کرنے سے جو بنیادی مسائل جنم لیتے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ کئی اقسام کے التباس ہمارے اندازوں کو بگاڑ دیتے ہیں۔

پیمائش کے معیار بھی بہت اہم ہوتے ہیں۔ جب کوئی شخص دنیا کے ایک حصے میں ۵ سینٹی میٹر کی لمبائی یا ۲ گھنٹے ۳۴ منٹ کی طوالت ناپتا ہے تو یہ بات بے حد اہم ہے کہ دنیا کے کسی اور حصے میں کوئی دوسرا شخص بھی اس پیمائش کو دہرانے، بلکہ یوں کہیے کہ صحیح طور پر دہرانے کے قابل ہو۔

انسانی ردِعمل ایک دوسرے سے بہت مختلف اور پیچیدہ ہوتے ہیں۔ اس لیے فطری علوم کے مقابلے میں سماجی علوم میں پیمائش کے معیار طے کرنا زیادہ دشوار ہوتا ہے۔ پھر بھی حالیہ برسوں کے دوران ان علوم میں اس حوالے سے ترقی ہوئی ہے۔

تغیر پذیر حقائق

حقائق کے سچے یا جھوٹے ہونے کا تعین ہم کس طرح کرتے ہیں؟ آیئے اس امر کی وضاحت کے لیے ہم دیکھیں کہ نظامِ شمسی کے بارے میں ہمارا نظریہ صدیوں کے دوران کس طرح تبدیل ہوا ہے۔ اگر ہم ۱۳۰۰ عیسوی میں زندہ ہوتے تو دوسروں کی طرح

ہم بھی دو ''واضح'' حقائق کو قبول کرنے سے گریز نہ کرتے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ زمین چپٹی ہے اور دوسرے یہ کہ سورج زمین کے گرد گھومتا ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ یہی دکھائی دیتا ہے اور ۱۳۰۰ عیسوی میں انسان کے پاس جس قدر علم تھا' اس سے منطقی استدلال کے ذریعے یہی نتیجہ نکلتا تھا۔ جب کبھی ہم ہموار گلیوں والے کسی شہر یا قصبے سے گزرتے ہیں تو ہمارے مشاہدے سے اس بات کی تصدیق ہوتی محسوس ہوتی ہے کہ زمین چپٹی ہے۔ جب ہم کس پرسکون اور ساکت جھیل میں کشتی چلاتے ہیں تو لگتا ہے کہ پانی قطعی طور پر ہموار ہے۔ گویا ''چپٹا'' ہے۔ سالہا سال کے ذاتی تجربے کی بناء پر ہم ''جانتے'' ہیں کہ جھیل کا پانی اگر چپٹا نہ ہوتا تو وہ گہرائی کی طرف بہنے لگتا اور بالکل ہموار ہو جاتا۔

تجربے پر مبنی منطقی استدلال سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ سمندر کی کوئی نہ کوئی حد ہوتی ہے۔ بھلا وہ بے حد وحساب کیونکر ہوسکتا ہے؟ اس کا کوئی نہ کوئی کنارا تو ہونا چاہیے جس سے آگے قدم بڑھانے پر ہم گر جائیں گے۔ کسی پراسرار شگاف میں یا شاید جہنم میں جا گریں گے۔

پرانے وقتوں میں زمین کا گول ہونا نا قابلِ تصور تھا۔ ذاتی تجربے کی بنیاد پر ہم جانتے تھے کہ زمین اگر گول ہے تو نیچے کی طرف رہنے والے لوگ گر جائیں گے۔ کوئی اگر یہ دلیل دیتا کہ کشش ثقل ہم سب کو زمین سے چپکائے رکھتی ہے تو حیرت سے ہم پوچھتے ''اچھا! وہ ہے کون؟''

کسی شکی مزاج کو کشش ثقل کی خصوصیات سمجھانے کی ذرا کوشش تو کیجیے۔ ان کڑے سوالوں کا آخر کون کامیابی سے جواب دے سکتا ہے۔ کششِ ثقل ہمیں زمین کی طرف کیسے کھینچتی ہے؟ وہ رسیاں کہاں ہیں جن سے ہمیں زمین کی طرف کھینچا جاتا ہے؟ کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ میرے اور زمین کے درمیان دس فٹ موٹی کنکریٹ کی سل ہو تب بھی کششِ ثقل ویسے ہی مجھے اپنی طرف کھینچتی ہے؟ زمین کے اندر چار ہزار میل کی گہرائی میں دبی ہوئی شے کو کیونکر پتہ چلتا ہے کہ مجھے کتنے زور سے کھینچنا ہے؟

ہم روزانہ سورج کو مشرق سے نکلتا اور مغرب میں ڈوبتا دیکھتے ہیں۔ پھر ایسا کیوں ہے کہ اگر زمین اپنے محور کے گرد ہر روز اپنا چکر مکمل کرنے کے لیے ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے حرکت کرتی ہے' تو ہمیں اس کا احساس ہی نہیں ہوتا؟ البتہ آسمان ہمیں

گنبد سا دکھائی دیتا ہے جس میں ستارے جڑے ہوئے ہیں اور وہ زمین کے گرد گھومتے ہیں۔

گویا چودھویں صدی کے لوگوں کے لیے یہ وہ حقائق تھے جن کی مفروضی طور پر تصدیق ہوتی تھی۔ اس لحاظ سے وہ درست قرار پاتے تھے۔ جو لوگ اس بات کو واضح ''حقیقت'' سمجھتے تھے کہ سورج زمین کے گرد گھومتا ہے' ان کے لیے اس امر کو تسلیم کرنا بہت دشوار تھا کہ زمین سورج کے گرد چکر لگاتی ہے۔ دیکھنے کی ہماری حس اس کے برعکس صورتِ حال کی تائید کرتی محسوس ہوتی تھی۔

نظامِ شمسی اور کائنات کے بارے میں ہمارا موجود تصور اصل میں علم میں بتدریج اضافے کا نتیجہ ہے۔ یہ علم مشاہدات کے باہمی عمل سے حاصل ہوا ہے جو عموماً آلات پیمائش اور منطقی استدلال' خصوصاً ریاضیاتی قسم کے استدلال کی عطا ہے۔ یوں پرانی اور معقول دکھائی دینے والی ''حقیقتوں'' کی جگہ بالآخر نئے حقائق نے لے لی ہے جو زیادہ معقول اور پیچیدہ ہیں اور قطعی طور پر متضاد تصور پر مبنی بھی ہیں۔

بنیادی طور پر اکثر علم اسی طرح وجود میں آتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حقائق اور تصورات وقت کے ساتھ تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔

جذبات اور موجوعیت حقائق کو مسخ کر دیتے ہیں

تحقیق و تفتیش کے عمل سے گزرتے ہوئے جذبات کے اثرات سے محفوظ رہنا آسان نہیں ہے۔ کسی تصویر یا نظریئے پر پختہ ایمان ہو تو پھر لوگ اس پر شبہ کرنے کے بجائے حقائق کو توڑ مروڑ کر اس کے مطابق ڈھال لیتے ہیں۔ اس قسم کا تعصّب عموماً غیر شعوری ہوا کرتی ہے۔ اس لئے لوگ اپنے استداس کے اثرات سے بے خبر رہتے ہیں۔

دغاباز ''حقائق''

جھوٹ' دغابازی اور فراڈ اس دنیا میں کوئی نئی چیز نہیں ہیں۔ تاہم سائنس کو ہم اس قسم کی حیلہ بازیوں سے محفوظ خیال کرتے ہیں کیونکہ وہ سب سے زیادہ اہمیت حقائق کو دیتی ہے۔ سائنس دان خود بھی فریب کاری کے امکان کو کم سے کم کرنے کی بھرپور کرشش کرتے ہیں۔ پھر بھی سائنس کی دنیا تک کبھی کبھار فریب کاری کی رسائی ہو ہی جاتی ہے۔

سائنس کو سب سے زیادہ نقصان پہنچانے والا واقعہ غالباً برطانیہ میں ''پلٹ ڈاؤن مین'' کی جعلی دریافت سے تعلق رکھتا ہے۔ اس نے چالیس برس تک انسانی ارتقاء کے مطالعات کو گمراہ کیے رکھا۔ یہ قصہ یوں ہے کہ چارلس ڈاؤسن نامی ایک وکیل اور شوقیہ ماہرِ آثارِ قدیمہ نے ۱۹۱۲ء میں یہ دعویٰ کیا کہ اسے ایک قدیم انسانی کھوپڑی اور اس کے پاس پڑا ہوا جبڑا ملا ہے۔ یہ آثار زمین کی اتنی گہرائی سے دستیاب ہوئے تھے کہ جس سے ان کی قدامت کا تعین پانچ لاکھ سال تک کیا گیا تھا۔ کھوپڑی اور جبڑا دونوں مسخ شدہ تھے۔ گویا وہ یہ پتہ دیتے تھے کہ عرصہ دراز تک وہ دفن رہے ہیں۔

علم تشریح الاعضا کی رو سے جدید انسان سے مشابہ کھوپڑی اور بوزنے جیسے جبڑے میں مطابقت دکھائی نہ دیتی تھی۔ دوسری طرف دریافت شدہ جبڑے میں دانت ویسے تیز نہ تھے جیسے بوزنے کے ہوا کرتے ہیں۔ وہ انسانی دانتوں جیسے لگتے تھے۔ بعض ماہرین نے ان آثار کا جائزہ لینے کے بعد یہ رائے دی کہ کھوپڑی اور جبڑا انسان جیسے کسی ایک وجود سے تعلق نہیں رکھتے۔ البتہ کسی نے انہیں ایک ہی جگہ دفن کر دیا تھا۔ اس وقت کسی نے بھی اس دریافت کاری کا شبہ ظاہر نہ کیا۔

خیر، چارلس ڈاؤسن کی اس ''دریافت'' کو عام طور پر قبول کیا جانے لگا۔ یہاں تک کہ نصابی کتب میں بھی اسے ایک ''حقیقت'' کے طور پر داخل کر دیا گیا۔ تاہم وہ ابتدائی انسان کی اس تصویر میں مناسب دکھائی نہیں دیتی تھی جو آثارِ قدیمہ کی دیگر دریافتوں سے مرتب ہو رہی تھی۔ اس ''دریافت'' کے چالیس سال بعد سائنس دانوں کے ایک گروہ نے فریب کاری کے امکان کے حوالے سے اس کو جانچنے کا فیصلہ کیا۔ جب انہوں نے ''پلٹ مین'' کے مختلف ٹیسٹ شروع کیے تو جلد ہی معلوم ہو گیا کہ کھوپڑی اور جبڑا دونوں کو کیمیکلز کے ذریعے مسخ کیا گیا تھا تاکہ وہ قدیم دکھائی دیں۔ آثار کے زمانے کا تعین کرنے والے نئے طریقے نے ظاہر کر دیا کہ کھوپڑی اور جبڑے کا تعلق زمانہ قدیم سے نہیں تھا۔ بوزنے جیسے جبڑے پر ریتی کے نشان بھی معلوم کر لیے گئے جن سے ظاہر ہوا کہ دانتوں کو رگڑ کر انہیں انسانی دانتوں جیسا بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔ چارلس ڈاؤسن کی جعل سازی کا بھید آخر سب پر کھل گیا۔

بہرطور یہ جعل سازی سائنس کے لیے بہت نقصان دہ ثابت ہوئی۔ اس سے نہ

صرف انسانی ارتقاء کا علم حاصل کرنے میں رکاوٹیں پیدا ہوئیں بلکہ بعض دیگر تحقیقات سے کئی سائنس دانوں کی توجہ ہٹ گئی۔

ایسی ہی ایک اور نقصان دہ فریب کاری برطانوی نفسیات دان کائرل برٹ نے کی۔ وہ لگ بھگ مسلسل بیس برس تک ایک جیسے جڑواں افراد کی ذہانت کے بارے میں تحقیقی نتائج ''گھڑتا'' رہا۔ یہاں تک کہ اس کی قابلیت کا بڑے پیمانے پر اعتراف کیا جانے لگا۔ برطانوی حکومت نے اسے ''سر'' کے خطاب سے نوازا اور امریکن سائیکلوجیکل ایسوسی ایشن نے اسے اپنا سب سے بڑا انعام دیا۔ اس نے ایسے کئی خیالی جڑواں بچوں کو موضوع تحقیق بنایا جو بچپن میں جدا ہو گئے تھے اور ان کی پال پوس مختلف گھرانوں میں ہوئی تھی۔ برٹ نے ان خیالی بچوں کی ذہانت کے جعلی ٹیسٹ تیار کیے اور نتائج بھی اخذ کیے۔ اس طرح برٹ نے جعلی اعداد وشمار پر مبنی کئی جدول پیش کیں اور تجزیے بھی رقم کیے۔ لگتا ہے کہ برسوں پر پھیلی ہوئی اس جعل سازی کا مقصد محض یہ تھا کہ برٹ اپنی اس پختہ رائے کو ثابت کرنا چاہتا تھا کہ ذہانت عام طور پر ورثے میں ملتی ہے۔ برٹ اپنی چالبازیوں میں اس حد تک بڑھ گیا کہ اس نے اس قسم کے موضوع پر کام کرنے والے دو جعلی ساتھی بھی تخلیق کیے اور ان کے نام سے مقالات شائع کروائے۔ اس طرح وہ یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ دوسرے ماہرین نفسیات کی تحقیقات بھی اس کے نتائج کی تصدیق کرتی ہیں۔

ممکن ہے کہ برٹ کے فراہم کردہ اعداد وشمار پر بعض لوگوں کو شک ہوا ہو' لیکن کسی نے بھی اس کے ان ''تجربات'' کو جانچنے یا چیلنج کرنے کی زحمت گوارا نہ کی' جن سے اس نے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ ذہانت زیادہ تر موروثی ہوتی ہے۔ تاہم برٹ کی موت کے ایک سال بعد' ۱۹۷۲ء میں' پرنسٹن کے ماہرِ نفسیات لیون کیمن کو یہ ثابت کرنے میں صرف دس منٹ لگے کہ برٹ کے مقالات میں سے ایک مقالہ فراڈ تھا۔ برٹ اس لیے قابو آ گیا کہ اس نے ایک ہی اعداد وشمار دہرائے تھے۔

خیر' ہوسکتا ہے کہ ذہانت کے پیدائشی ہونے کے بارے میں برٹ کی رائے درست ہو۔ یہ رائے غلط بھی ہوسکتی ہے۔ اب برٹ کا تمام کام بے وقعت ہو چکا ہے کیونکہ کوئی اچھا محقق اس کے کسی حصے پر اعتماد نہیں کرسکتا۔ برٹ کی تحقیقات کا کوئی حصہ درست

ہوتو بھی وہ قابلِ اعتماد نہیں رہا۔ گویا اپنی چالبازیوں کے ذریعے برٹ نے اپنی عمر بھر کی کاوشوں کو برباد کر ڈالا۔

اس قسم کے سارے فراڈ انسانی علم کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ وہ اعتماد کو بھی ضعف پہنچاتے ہیں۔ ہمیں جان لینا چاہیے کہ جھوٹ اور فریب کاری سے مسائل حل نہیں ہوا کرتے۔

برٹ کی فریب کاری خاص طور پر نقصان دہ ثابت ہوئی کیونکہ اس کے نتائج کی اساس پر نسل پرستوں کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ بعض تعلیمی ماہرین نفسیات نے بھی یہ کہنا شروع کر دیا کہ حکومت کی امداد پر غریب کالے اور سفید فام بچوں کو تعلیم دینے کا کام بند کر دیا جائے۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ اس قسم کے بچوں کو تعلیم دینا فضول ہے کیونکہ پیدائشی طور پر ان میں سیکھنے کی صلاحیت بہت کم ہوتی ہے۔

خوش قسمتی سے سائنس کے طریقہ کار میں شامل جانچ پڑتال کے عمل نے آخرکار چارلس ڈاؤسن اور کائرل برٹ کی فریبکاروں کا پردہ چاک کر دیا۔ تاہم ہمیں ماننا چاہیے کہ جانچ پڑتال کے عمل میں بعض خرابیاں موجود ہیں۔ اس لیے برٹ کئی برس تک لوگوں کو دھوکہ دینے میں کامیاب ہوا تھا۔ بہرحال اس عمل کو بہتر اور موثر بنایا جا رہا ہے۔ پھر بھی چالبازوں کی راہ مکمل طور پر روکنا مشکل ہی ہے۔

غلطیاں صرف دھوکہ دہی سے پیدا نہیں ہوتیں۔ نئی معلومات حاصل کرنے کی دیانت داری سے کوشش کی جائے تو بھی ان کا امکان رہتا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ہر اچھے تحقیق کار سے کئی غلطیاں ہو جاتی ہیں۔ البتہ جان بوجھ کر علم کے شعبے میں دھوکہ دینا بہت بڑی بات ہے اور جب کوئی شخص اس قسم کی دھوکہ بازی کا مرتکب ہو تو پھر کوئی اہم جریدہ اس کی تحقیقات شائع نہیں کرتا۔ محقق کے طور پر اس شخص کا کیرئیر ایک طرح سے ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ دھوکہ باز کے پھیلائے ہوئے مغالطّوں کو ختم کرنے کا عمل شروع ہو جاتا ہے اور سائنسی جرائد اس شخص کے تحریر کردہ مقالات کی فہرستیں شائع کرتے ہیں اور قارئین سے کہا جاتا ہے کہ وہ ان تحریروں کو کوئی وقعت نہ دیں۔

خوشی کی بات یہ ہے کہ سائنس کی دنیا میں اس قسم کی چالبازیاں اکا دکا ہی ہوتی ہیں۔ پیشہ ور تحقیق کار حقائق کی فراہمی میں معروضی رویہ اختیار کرنے کی کوشش کرتے

ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتو اس نئے علم کو فروغ دینے والوں کے لیے سنگین مسائل پیدا ہو جائیں جس پر آج ہماری دنیا کا دارومدار ہے۔

واقعاتی غلطیاں کیونکر دور کی جاتی ہیں

۱۹۴۰ء کے عشرے میں اخبارات و جرائد میں ایسے مضامین شائع ہوتے رہتے تھے جن میں انسانوں اور حیوانوں کی رفتار کا موازنہ طیاروں اور تیز رفتار موٹروں سے کیا جاتا تھا۔ اس زمانے کے حیران کن ''حقائق'' میں سے ایک ''تیز ترین زندہ شے'' یعنی ''ڈیر فلائی'' تھی جس کے بارے میں دعویٰ کیا گیا تھا کہ وہ تقریباً سات سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اڑتی ہے۔ اس زمانے میں کوئی طیارہ بھی اس رفتار سے سفر نہیں کرتا تھا۔

اروِنگ لینگ میور نامی ایک ممتاز سائنس دان نے جب کئی اخبارات میں اس فلائی (مکھی) کا ذکر دیکھا تو اسے بہت تعجب ہوا۔ یکم جنوری ۱۹۳۸ء کو اس نے ''السٹریٹڈ لنڈی نیوز'' میں ڈیر فلائی کی حیرت انگیز رفتار کے بارے میں ایک مضمون دیکھا۔ اخبار کا کہنا تھا کہ مادہ ڈیر فلائی کی رفتار ۶۱۴ میل فی گھنٹہ ہوتی ہے جبکہ نر ڈیر فلائی ۸۱۸ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اڑ سکتا ہے۔ اخبار نے اس اطلاع کا ذریعہ ڈاکٹر چارلس ایچ ٹی ٹاؤن سینڈ نامی شخص کو قرار دیا تھا۔ اخبار کا کہنا تھا کہ ان صاحب نے نیویارک اینٹومولوجیکل سوسائٹی کے لیے اپنے مقالہ میں یہ معلومات مہیا کی ہیں۔ اخبار کے بقول اس مقالہ میں ڈاکٹر صاحب نے لکھا تھا کہ انہوں نے نیومیکسیکو میں ایک نر ڈیر فلائی کو اتنی تیزی سے اڑتے ہوئے دیکھا تھا جو ان کے اندازے کے مطابق چار سو گز فی سیکنڈ کی رفتار تھی۔

آپ چار سو گز فی سیکنڈ کی رفتار کا حساب لگائیں تو یہ ۸۱۸ میل فی گھنٹہ ہی بنتی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ڈاکٹر ٹاؤن سینڈ نے اس مکھی کی رفتار کی واقعی پیمائش کی تھی یا محض اندازہ لگایا تھا۔ اگر اندازہ لگایا تھا تو اس کی بنیاد کیا تھی۔

خیر' لینگ میور کو ڈاکٹر صاحب کی باتوں کا یقین نہ آیا۔ چنانچہ اس نے ڈیر فلائی کی رفتار کے بارے میں دعویٰ کی پڑتال کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس سلسلے میں اس نے پہلے اپنے طور پر حساب کتاب کیا اور یہ دیکھنا چاہا کہ شدت سے مزاحمت کرنے والی ہوا ۸۱۸ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اڑنے کے لیے ڈیر فلائی کو کس قدر توانائی درکار ہو گی۔ لینگ میور

اس نتیجے پر پہنچا کہ اس قدر سرعت سے سفر کرنے کے لیے ڈیر فلائی کو نصف ہارس پاور یا یوں کہیئے کہ چار انسانوں کے برابر توانائی کی ضرورت ہوگی۔ یہ توانائی حاصل کرنے کے لیے ڈیر فلائی کو کتنی خوراک کھانا ہوگی؟ آپ کو شاید یقین نہ آئے گا' لیکن نصف ہارس پاور توانائی کے حصول کے لیے ڈیر فلائی کو ہر سیکنڈ میں اپنے وزن سے ڈیڑھ گنا زیادہ خوراک درکا ہوگی!

ڈاکٹر ٹاؤن سینڈ نے ڈیر فلائی کی شرح رفتار کا تعین کرتے ہوئے ایک بات یہ کہی تھی کہ انہوں نے ڈیر فلائی کو اس قدر تیزی سے اڑتے دیکھا تھا کہ وہ صرف ایک دھبہ سا دکھائی دیتی تھی...... لینگ میور نے ڈیر فلائی کا ایک چوبی ماڈل بنوایا اور اسے رسی سے باندھ کر تیزی سے گھمایا۔ تب انہوں نے دیکھا کہ صرف ۲۶ میل فی گھنٹہ کی رفتار پر مادل متحرک شے کے طور پر مشکل ہی سے پہچانا جاتا تھا۔ ۹۳ میل فی گھنٹہ کی رفتار پر اس کی جگہ بس ایک لکیر سی رہ گئی تھی۔ اس سادہ سے تجربے سے لینگ میور نے بجا طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ڈیر فلائی کی رفتار کو آٹھ سو میل فی گھنٹہ قرار دینا محض بے ہودہ گپ ہے۔ البتہ اس کی رفتار ۲۵ میل فی گھنٹہ کے لگ بھگ ہوسکتی ہے۔

یوں لینگ میور نے ڈیر فلائی کے بارے میں بڑھا چڑھا کر بیان کیے جانے والے ''واقعہ'' کی تردید کر دی۔ بدقسمتی سے غلطیاں اس قدر آسانی سے ختم نہیں ہوا کرتیں۔ چنانچہ اگلے کئی سال تک اخباروں اور رسالوں میں آٹھ سو میل فی گھنٹہ کی ڈیر فلائی کی رفتار کا چرچا ہوتا رہا۔ تاہم بعد ازاں جب لینگ میور نے اس موضوع پر ایک مقالہ لکھ کر ایک مشہور سائنسی جریدے میں شائع کروایا تو سائنسی حلقوں میں ڈیر فلائی کے بارے میں اس مغالطے کا خاتمہ ہوگیا۔

مشتبہ حقائق سے متعلق لینگ میور کے طریقہ کار میں ایک اہم سبق پوشیدہ ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہر مشتبہ حقیقت کا حساب کتاب اور تجربات سے جائزہ لینا چاہیے اور دیکھنا چاہیے کہ آیا وہ درست ہے یا غلط۔ یہ اس امر کو یقینی بنانے کا واحد طریقہ ہے کہ انسانی علم کی بنیاد کے طور پر پیش کیے جانے والے حقائق ممکنہ حد تک درست رہیں۔ بصورت دیگر علم کا ڈھانچہ مسمار ہو جاتا ہے اور اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں رہتی۔

معروضیت اور جمہوریت

حقائق کی معروضی جانچ پڑتال اور تصدیق کا تصور جدید تہذیب میں ارباب سائنس کے اہم ترین اضافوں میں سے ایک ہے۔ یہ تصور انسانی امور کے تمام شعبوں میں قابلِ اعتماد حقائق کی فراہمی کے لیے ایک بے انتہا طاقتور آلہ...... بلکہ یوں کہیئے کہ ''انجن''...... کے طور پر کام کرتا ہے۔

مثال کے طور پر کسی جمہوری نظام میں خفیہ رائے دہی کے ذریعے عوامی نمائندوں کو ووٹ دینے کے بنیادی طریقہ کار پر ایک نگاہ ڈالیے۔ تاریخی حوالے سے دیکھئے تو یہ عوام کی طرف سے حکمرانوں کے انتخاب وتعین کی طرف ایک اہم پیش رفت ہے۔ خفیہ رائے دہی اور ووٹوں کی غیر جانبدارانہ گنتی اس امر کو یقینی بنا دیتی ہے کہ رائے دہندگان کسی خوف یا دباؤ کے بغیر اپنی رائے کا اظہار کریں۔ خفیہ رائے دہی کسی بھی جمہوری نظام کی روح ہے۔ اس کو نکال دیجئے تو جمہوریت باقی نہ رہے وہی کسی بھی جمہوری نظام کی روح ہے۔ اس کو نکال دیجئے تو جمہوریت باقی نہ رہے گی۔ اس کے بعد صرف آمریت کا راج ہوگا اور آزادی ختم ہو جائے گی۔

ہمارے ہاں بہت سے لوگ ووٹ کی اہمیت کا احساس نہیں کرتے۔ انتخابات کے وقت وہ ووٹ نہیں دیتے اور اس طرح اپنی رائے ضائع کر دیتے ہیں۔ وہ ووٹ دینے کے حق اور جمہوری آزادیوں کے مابین موجود سادہ رشتے سے بے خبر ہیں۔ یاد رکھئے کہ ووٹ دینے کا حق ان آزادیوں کی علامت ہے۔

حقائق میں شامل ابہام کا تجزیہ کیسے کیا جائے؟

بتایئے تو ذرا پتے سبز ہوتے ہیں یا نہیں؟ غالباً اکثر لوگ کہیں گے کہ پتے سبز ہوتے ہیں۔ تاہم قدرے توقف کیا جائے تو اس واضح جواب پر کئی شبہات پیدا ہونے لگتے ہیں۔ خزاں کے دنوں میں پتے ملے جلے رنگوں کے ہوتے ہیں۔ مثلاً وہ سبز اور پیلے ہو سکتے ہیں۔ خشک موسموں میں کئی قسم کی گھاس کا رنگ بدل جاتا ہے۔ بعض درخت ایسے بھی

ہیں کہ جن کے پتے تانبے جیسے رنگ کے ہوتے ہیں۔

یوں ہم دیکھتے ہیں کہ ''پتے سبز ہوتے ہیں'' جیسا سادہ بیان بھی مکمل طور پر درست نہیں ہے۔ اگرچہ سال کے اکثر ایام میں زیادہ تر پتے سبز ہی ہوتے ہیں' تاہم بعض مکمل طور پر سبز نہیں ہوتے اور بعض پتے سبز ہوتے ہی نہیں۔ ایسے پتے بھی ہیں جو صرف تھوڑا عرصہ ہی سبز رہتے ہیں۔

گویا امر واقعہ یہ ہے کہ ''پتے عموماً سبز ہوتے ہیں''۔ اس سے ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ بعض پتے غیر سبز بھی ہوتے ہیں۔ اکثر لوگ رنگوں کے اس فرق کی پرواہ نہیں کریں گے' لیکن کبھی کبھار ان کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے۔

اب ایک اور مثال دیکھئے۔ جب یہ کہا جائے کہ ''۱۰۰ پیسے ایک روپے کے مساوی ہوتے ہیں'' تو اس قسم کی حقیقت شبہ سے بالاتر رہتی ہے۔ اس کی وجہ الفاظ ''روپے'' اور ''پیسے'' کی تعریف ہے۔ روپے کی قیمت کا تعین حکومت پاکستان کرتی ہے اور اس نے یہ طے کر رکھا ہے کہ ۱۰۰ پیسے ایک روپے کے مساوی ہوں گے۔ اب کیا کوئی معقول شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ ''نہیں صاحب ایک روپے میں ۸۰ پیسے ہوتے ہیں''۔

ہاں شاید یہ بات کہی جا سکتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ پیسہ دھات کا بنا ہوا ہوتا ہے جبکہ روپیہ کاغذی کرنسی ہے اور اس کی اپنی کوئی قدر نہیں ہوتی۔ لہٰذا ایسی صورت حال پیدا ہو سکتی ہے جس میں اگر پیسوں کو ان کی دھات کی قیمت کے حساب سے فروخت کیا جائے تو ایک روپے کے بدلے ۸۰ پیسے ملیں۔ ایسی صورت حال میں لوگ ایک روپے کے بدلے سو سے کم پیسے وصول کرنے پر تیار ہو سکتے ہیں اور پیسوں کو ڈھال کر دھات کے طور پر فروخت بھی کر سکتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اس قسم کا کام غیر قانونی قرار پائے گا۔

امریکہ میں ۱۹۸۱ء میں اس قسم کی صورتحال پیدا ہوئی تھی۔ وہاں سونا' چاندی اور تانبا جیسی دھاتوں کی قیمت اچانک اس قدر بڑھ گئی تھی کہ بعض لوگوں نے سکوں کو پگھلا کر ان کی دھات کو سرکاری قیمت سے زیادہ پر فروخت کرنا شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ پینی کا سکہ بازار سے غائب ہو گیا تھا اور تانبے کے طور پر فروخت ہونے لگا تھا۔

اس رجحان کو روکنے کی خاطر امریکی محکمہ خزانہ کو ۱۹۸۲ء میں پینی میں استعمال ہونے والی دھات بدلنی پڑی۔ مستقبل میں اس قسم کے حالات کسی اور جگہ بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ ''۱۰۰ پیسے ایک روپے کے مساوی ہوتے ہیں''۔ جیسا بیان بھی ایسا نہیں کہ ہم اسے ہر قسم کے حالات پر مکمل طور پر درست قرار دے سکیں۔

ایک اور مانوس حقیقت کی مثال لیجئے۔ وہ یہ ہے کہ ''زمین گول ہے''۔ خلا سے ہمارے سیارے کی جو تصاویر اتاری گئی ہیں ان سے اس واقعہ کی تصدیق ہوگئی ہے۔ اس کے باوجود ہمارے ہاں ایسے لوگ موجود ہیں جو مذہبی دلائل سے ثابت کرتے رہتے ہیں کہ زمین چپٹی ہے۔ اس موضوع پر ایک دو کتابیں بھی شائع ہو چکی ہیں۔

مانا کہ زمین کا گول ہونا ثابت ہو چکا ہے' لیکن یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ اس کی گولائی کس قسم کی ہے؟ کیا وہ مکمل طور پر گول ہے؟ ان سوالات کا تعلق اس امر سے ہے کہ ہم کس حد تک درست ہونا چاہتے ہیں۔ خلا سے دیکھنے والا کوئی خلا باز زمین کی گولائی میں نقص تلاش نہیں کر سکتا۔ پھر بھی خلائی سائنس دانوں کو زمین کی گولائی میں چھوٹے بڑے نقائص کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے جو یقیناً موجود ہیں۔ صریح پیمائش کے اعداد و شمار مکمل گولائی سے زمین کے فرق کو ظاہر کر دیتے ہیں۔ علاوہ ازیں زمین پر پہاڑ بھی موجود ہیں جن میں سے بعض پانچ میل سے بھی زیادہ اونچے ہیں۔ سب سے اونچے پہاڑ' ماؤنٹ ایورسٹ' کی چوٹی سے دیکھنے والوں کو زمین کسی طرح بھی گول دکھائی نہیں دیتی۔ گویا ہم یہ کہیں گے کہ زمین کم و بیش گول ہے۔ وہ مکمل طور پر گول نہیں ہے۔

اس بیان پر ہمیں شبہ نہیں ہوتا کہ ''دو اور دو چار ہوتے ہیں''۔ مگر فرض کیجئے کہ محض اعداد کے بجائے ہم اس تصور کا اطلاق حقیقی دنیا پر کرتے ہیں۔ دو سیب اور دو مالٹے ہوں تو ہم کیا کہیں گے؟ کیا ہم انہیں دو سیب۔ مالٹے قرار دیں گے؟ اچھا تو یوں کہہ لیجئے کہ ''یہ چار پھل ہیں''، لیکن اب ہمیں نئے لفظ کے استعمال کے بارے میں سوچنا ہوگا۔ یوں یہ سلسلہ دراز ہی ہوتا جائے گا۔ پانچویں باب میں ہم اس قسم کے مسائل زیرِ بحث لائیں گے۔

اگر ہم یہ کہیں کہ ''توانائی کے دو پاؤنڈ اور توانائی کے دو پاؤنڈ'' تو کیا اس کا مطلب توانائی کے چار پاؤنڈ ہوگا؟ یقیناً یہ جواب درست ہے۔ شرط بس یہ ہے کہ توانائی کا رُخ ایک ہی طرف ہو۔ اگر اسے متضاد سمتوں میں استعمال کیا جا رہا ہو تو پھر ہمارا جواب درست نہ رہے گا۔

ان ساری مثالوں سے ہم یہ واضح کرنا چاہ رہے ہیں کہ حقیقی زندگی کے بیشتر ''حقائق'' ہر جگہ اور ہمیشہ لازماً درست نہیں ہوا کرتے۔ ان میں استثنائی صورتیں اور تغیر و تبدل کی گنجائش ہوتی ہے۔ اس کا دارومدار اس بات پر ہوتا ہے کہ ہم حقائق کو کیسے دیکھتے ہیں اور کن مقاصد کے لئے بروئے کار لاتے ہیں۔ گویا ہم کہہ سکتے ہیں کہ ''حقائق مبہم ہوا کرتے ہیں''۔

بعض لوگوں کو اس قسم کے غیر یقینی پن سے نمٹنے میں دشواری پیش آتی ہے۔ وہ چیزوں کو کامل دیکھنے کے آرزومند ہوتے ہیں۔ وہ بھلا دیتے ہیں کہ ہم ایک حقیقی دنیا میں جی رہے ہیں جس میں حقائق صراحت کے آئیڈیل سے قریب تر ہو سکتے ہیں، لیکن کامل طور پر نہیں ہو سکتے۔ زندگی کے غیر یقینی پن کو قبول کرتے ہوئے ہم اپنی حد تک بہترین کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ ہمارے لیے بس یہی کافی ہے۔

حقائق کی مختلف قسمیں

ہماری دنیا میں بے شمار حقائق ہیں۔ ان کو مندرجہ ذیل اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(ا) نشاندہی کرنے والے حقائق: اس قسم میں انسانوں، جانوروں، پودوں، تجارتی اداروں، قوموں، شہروں، دریاؤں، سمندروں، قیمتوں، آلات کے ماڈلز کی نشاندہی کرنے والے اعداد اور دیگر مصنوعات کے نشاندہی کرنے والے حقائق، ہمارے اپنے نام، پتے اور شناختی کارڈ نمبر وغیرہ شامل ہیں۔ یہ حقائق اتنے ہی ٹھوس ہوتے ہیں جتنے کہ ہم انہیں بنا سکیں۔ اگر کوئی شخص ایک خاص پتے پر رہتا ہے اور ایک خاص نام سے پہچانا جاتا ہے تو کسی کو اس واقعہ پر شبے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ اور بات ہے کہ وہ شخص دغاباز ہو اور پولیس سے چھپنے کے لیے دو نام یا پتے استعمال کر رہا ہو۔ اس صورت میں اس کی شناخت مشتبہ ہو جاتی ہے۔

اس قسم کے خاص شناختی حقائق کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ریکارڈ تیار کرنے خصوصاً کمپیوٹر ریکارڈز کے لیے ان کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس قسم کے شناختی حقائق کے بغیر جدید تہذیب کا کاروبار نہیں چل سکتا۔

(۲) مشاہدات: حقائق کی یہ قسم بیشتر علم کی اساس ہے۔ اس کی مثالوں میں اس قسم کے بیانات شامل ہیں جیسے ''اس بلی کا وزن دس پاؤنڈ ہے''......جعفر کو ریاضی میں سب سے زیادہ نمبر ملے ہیں''...... ''اقصٰی بہت شرمیلی ہے''......

اس قسم کے حقائق میں جو ابہام ہو سکتا ہے وہ تمام مشاہدات میں مضمر غیر یقینی پن سے پیدا ہوتا ہے۔ ہم اپنے پانچ بنیادی حواس کے ذریعے مشاہدہ کرتے ہیں اور اس سلسلہ میں معلومات حاصل کرنے اور ان کی پیمائش کرنے کے بہت سے آلات کی مدد بھی حاصل کرتے ہیں۔ کئی قسم کے مشاہداتی مغالطے ہمارے حواس اور آلات دونوں کی حدود' مشاہدہ کرنے کے ہمارے طریقہ کار یا آلات کے غلط استعمال سے پیدا ہو سکتے ہیں۔

لفظ ''ڈیٹا'' کا مطلب مشاہدے کے ذریعے حاصل ہونے والی معلومات ہیں جن کے تجزیئے کے لیے موزوں جدول تیار کی جاتی ہے۔ ڈیٹا عددی صورت میں ہو تو اسے اعداد و شمار کہا جاتا ہے۔ ڈیٹا اور اعداد و شمار کئی قسم کی تحقیقات میں استدلال کی بنیاد بنتے ہیں۔ ان میں' مثال کے طور پر' طبیعات اور حیاتیاتی علوم' سماجی علوم' بزنس اور اکاؤنٹنگ شامل ہیں۔ کمپیوٹر کے ذریعے انفارمیشن پروسیسنگ کے لیے بھی ڈیٹا کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس قسم کے حقائق کی صراحت کا زیادہ تر انحصار اس امر پر ہوتا ہے کہ مشاہدہ کرنے والوں نے اپنے مشاہدات کے اندراج اور ریکارڈنگ میں کس قدر احتیاط سے کام لیا ہے۔

مشاہدات کرنے اور ڈیٹا کی جدول سازی کے لیے اب کئی قسم کے آلات وجود میں آ چکے ہیں۔ ان میں پیمائش کے سادہ آلات سے لے کر ٹیلی سکوپس' مائیکروسکوپس اور کئی دیگر اقسام کے برقی آلات شامل ہیں۔ مشاہدات کے ذریعے حاصل ہونے والی معلومات کو تصویروں' چارٹوں یا اعداد کی جدول کے ذریعے ریکارڈ کیا جا سکتا ہے۔ اس ریکارڈ کی نقلیں تیار ہو سکتی ہیں اور بعد ازاں دلچسپی رکھنے والے افراد اس کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر ماہر فلکیات اب ستاروں اور سیاروں کا مطالعہ دوربینوں کے ذریعے نہیں کرتے۔ اس کے بجائے وہ تصاویر اتار لیتے ہیں جو فضا کے کسی حصے کا مستقل ریکارڈ بن جاتی ہیں۔ ان تصاویر کی نقلیں تیار ہو سکتی ہیں اور بعد میں محقق ان کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان تصاویر کی قدر و قیمت بڑھتی چلی جاتی ہے کیونکہ وہ عرصے پر پھیلی

ہوئی تبدیلیوں کی نشاندہی میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔ اس قسم کا مشاہدہ کئی شعبوں میں کیا جاتا ہے۔ ماہرین حیاتیات چھوٹے چھوٹے عضویات کی تصاویر اسی طریقے سے استعمال کرتے ہیں۔ جرم کے منظر کا واقعاتی ریکارڈ تیار کرنے کے لیے سراغ رساں بھی تصاویر سے کام لیتے ہیں۔

جنرل سٹورز سے لے کر سائنس کی اعلیٰ ترین تجربہ گاہوں تک میں اب کمپیوٹر ٹیکنالوجی سے کام لیا جا رہا ہے۔ ان سہولتوں نے مشاہدات اور ڈیٹا کے حصول کے طریقوں کو مکمل طور پر بدل دیا ہے۔ یہ سہولتیں اس ''اطلاعاتی انقلاب'' کی بنیاد ہیں جو دنیا بھر میں پھیل رہا ہے۔

ان جدید طریقوں سے حاصل ہونے والا ڈیٹا عام طور پر براہِ راست انسانی مشاہدے کے ذریعے حاصل ہونے والے ڈیٹا سے بہت بڑھیا قسم کا ہوتا ہے۔ پھر بھی آلات اور کمپیوٹرز سے بھی کبھی کبھار غلطی ہو ہی جاتی ہے اور جب وہ غلطی کرتے ہیں تو وہ سنگین قسم کی ہوسکتی ہے۔ بسا اوقات کوئی سرکش کمپیوٹر اعداد کے آگے صفروں کا اضافہ کرنے لگتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دس روپے کے چیک کو دس لاکھ روپے میں بدل دیتا ہے۔ پھر ہوتا یہ ہے کہ کمپیوٹر پر کام کرنے والے افراد چونکہ کمپیوٹر اور دوسرے خودکار آلات پر بھروسہ کرنے کے عادی ہوتے ہیں' اس لیے چیک ان کے ہاتھوں سے پڑتال کے بغیر نکل جاتا ہے۔

(۳) تعریفات: ہر قسم کے استدلال کے لیے الفاظ یا اعداد کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان کی تعریف لازم ٹھہرتی ہے تاکہ سب لوگ انہیں ایک ہی طریقے سے استعمال کرسکیں۔ تعریفات عموماً مشاہدات پر مبنی ہوتی ہیں۔ تاہم وہ بنیادی حقائق کی ایک خاص طور پر اہم تقسیم کا کام بھی دیتی ہیں جو بہت سے انسانی استدلال کے نقطہ آغاز کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔

دوسرے تمام حقائق کی مانند تعریفات کی حدود بھی عموماً مبہم ہوا کرتی ہیں...... چنانچہ اگر آپ چار پان افراد سے ''قدامت پرست'' اور ''آزاد خیال'' جیسے الفاظ کے معنی دریافت کرلیں تو زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ وہ سب آپ کو مختلف معنی بتائیں گے۔ اس قسم کے الفاظ کے معاملے میں لغات بھی متفق نہیں ہوتیں۔ اگر آپ کوئی پرانی

ڈکشنری کھول کر معانی ڈھونڈیں تو فرق اور بھی بڑھ جائے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ معنی بھی بدلتے رہتے ہیں۔

بعض تعریفات دیکھنے میں سہل معلوم ہوتی ہیں لیکن ذرا سی توجہ دی جائے تو وہ پیچیدہ محسوس ہونے لگتی ہیں۔ مثلاً ۱۷۹۰ء میں ایک میٹر کی لمبائی کی تعریف یوں کی گئی تھی کہ ایک میٹر خط استوا سے قطب شمالی تک پیرس میں سے گزرنے والے خط کے لاکھویں حصے کے مساوی ہوتا ہے۔ ۱۹۰۰ء میں میٹر کی زیادہ عملی تعریف پیش کی گئی۔ چنانچہ میٹر کو دھات کی ایک خاص سلاخ پر موجود دو نشانوں کے درمیانی فاصلے کے مساوی قرار دے اگیا۔ یہ سلاخ پیرس میں بہت اہتمام سے رکھی گئی ہے اور اسکے لئے ایک مستقل درجہ حرارت کا انتظام کیا گیا ہے تاکہ گرمی سے اس کی لمبائی میں کوئی تبدیلی نہ آئے۔ خیر' ساٹھ برس بعد ۱۹۶۰ء میں بے حد چھوٹے فاصلوں کو درستگی سے ناپنے کی سائنس دانوں کی ضروریات پوری کرنے کی غرض سے اس تعریف میں ایک بار پھر تبدیلی کی گئی۔ اس کا مطلب بس یہ ہے کہ ہمارے علم میں اضافے کے ساتھ ساتھ تعریف کرنے کی ہماری اہلیت بھی بڑھتی جاتی ہے۔

وقت کے ساتھ جب خیالات بدلتے ہیں تو اکثر اوقات تعریفیں بھی ان کے ساتھ بدل دی جاتی ہیں۔ ۱۵۰۰ عیسوی میں جبکہ کوپرنیکس نے ابھی نظام شمسی سے متعلق اپنا نظریہ پیش نہ کیا تھا تو لفظ ''سیارہ'' سے مراد ہر وہ فلکی شے لی جاتی تھی جو بظاہر اپنی جگہ پر جامد نظر آنے والے ستاروں کے پس منظر میں متحرک معلوم ہوتی تھی۔ اس تعریف میں سورج اور چاند کے علاوہ عطارد' وینس' مریخ' مشتری اور زحل جیسے سیارے آجاتے تھے۔ بقیہ سیارے اس زمانے میں معلوم نہ تھے۔

کوپرنیکس کے نظریئے نے جب نظام شمسی کے بارے میں ہمارا تصور بدل دیا تو لفظ ''سیارے'' کی از سرِ نو تعریف کی گئی اور اس سے مراد صرف وہ اجرام فلکی لیے جانے لگے جو سورج کے گرد گھومتے ہیں۔ چنانچہ اب سورج کو سیارہ نہیں سمجھا جاتا۔ یہی حال چاند کا ہے۔ چاند کو اب ''سیٹلائٹ'' خیال کیا جاتا ہے' جو زمین کے گرد چکر لگاتا ہے۔ زمین کو ماضی میں کائنات کا مرکز سمجھا جاتا تھا' اب اس کے سیارکا درجہ دیا جاتا ہے' اگرچہ وہ خلا کی وسعتوں میں محوِ خرام محسوس نہیں ہوتی۔ اسی طریقے سے اکثر دوسری تعریفات بھی بدل جاتی

ہیں۔

(۴) بیانیہ عمومی حقائق: جن اقسام کا ہم نے ابھی ذکر کیا ہے' ان میں انفرادی حقائق جمع ہو کر استقرائی استدلال کے ذریعے عمومی حقائق کا روپ دھار لیتے ہیں۔ ان عمومی حقائق کے لیے تعمیمات کی اصلاح استعمال کی جاتی ہے۔ (استقرائی استدلال کو ہم چوتھے باب میں موضوع بحث بنائیں گے) اس قسم کے عمومی حقائق کی ایک مثال یہ جملہ ہے کہ ''کتے بھونکتے ہیں''۔ یہ جملہ بہت سے کتوں کے بھونکنے کے مشاہدے پر مبنی ہے۔

جب نئے مشاہدے کیے جاتے ہیں تو عمومی بیانات میں تغیر و تبدیل ہوتا ہے اور ترقی بھی۔ اس طرح انسانی علم آگے کی طرف رواں دواں رہتا ہے۔

(۵) منطقی استدلال: منطقی استدلال کی ایک قسم کو استخراجی طریقہ کار کا عنوان دیا جاتا ہے۔ اس طریقے کی مدد سے معلوم حقائق کے نتائج کے طور پر نئے حقائق تک رسائی حاصل کی جاسکتی ہے۔ اس طریقہ کار کی وضاحت بھی ہم چوتھے باب میں کریں گے۔

استخراجی طریقہ کار کی مدد سے جن حقائق یا مقدمات سے نئے حقائق اخذ کیے جاتے ہیں اگر وہ مبہم ہوں تو نئے حقائق میں بھی ابہام رہتا ہے۔ ریاضی بنیادی طور پر استخراجی نوعیت کی حامل ہے۔ ریاضی میں اگر منطقی استدلال درست ہو تو پھر ابہام صرف ان تعریفات اور اولیات میں اختلاف کے سبب پیدا ہوتا ہے جن پر ریاضیاتی نظام مبنی ہے۔ اس مسئلے پر بھی چوتھے باب میں بحث کی جائے گی۔

ریاضی کے اکثر حقائق استخراج کے ذریعے اخذ کیے جاتے ہیں۔ تحقیق' انجینئرنگ اور شماریاتی تجزیئے میں ان ریاضیاتی اضافتوں کی بڑی اہمیت ہے۔

نئی واقعاتی معلومات حاصل کرنے کے لیے انسانی امور کے ہر شعبے میں منطقی استدلال کو بھی بروئے کار لایا جاتا ہے۔ (وضاحت کے لیے چوتھا باب ملاحظہ فرمایئے)

(۶) مشاہدے میں آنے والی اضافتیں: مشاہدات پر عمل پیرا منطقی استدلال سے ''مشاہدہ شدہ اضافتوں'' کے فراخ بیانات تک رسائی ہوتی ہے جو مختلف صفتوں یا کمیتوں کو غیر متوقع لیکن باثمر طریقوں سے منسلک کر دیتے ہیں۔ ان

اضافتوں کو عموماً سادہ انداز میں بیان کیا جاتا ہے' لیکن درحقیقت ان کو ''کتے بھونکتے ہیں'' جیسے بیانیہ عمومی حقائق کے مقابلے میں دریافت کرنا زیادہ مشکل اور پیچیدہ کام ہے۔ مثال کے طور پر رسد اور طلب کا قانون اشیاء کی قیمتوں میں کمی بیشی کا تعین کرنے والی مشاہدہ شدہ بنیادی حقیقت کو بیان کرتا ہے۔ یہ معاشی سرگرمیوں کی پیش گوئی کا طاقتور آلہ ہے۔

کشش ثقل کا قانون ایک ایسی مشاہدہ شدہ اضافیت کو بیان کرتا ہے جو دو اجسام کے درمیان فاصلہ معلوم ہونے پر طبیعات دانوں کو ان کے درمیان کشش کی قوت کا تعین کرنے کے قابل بناتی ہے۔ مشہور سائنس دان نیوٹن نے کشش ثقل کا قانون دریافت کیا تھا۔ یہ دریافت اعلیٰ درجے کے تخلیقی منطقی استدلال' تیز زمین پر زاویوں اور فاصلوں کی پیمائش پر مبنی چاند کی حرکت کے بہت سے مشاہدوں کے ذریعے ممکن ہوئی تھی۔

آیئے ایک اور مثال دیکھیں۔ چیچک' خناق' ٹائیفائیڈ اور کئی دوسری بیماریاں جراثیم سے پیدا ہوتی ہیں۔ تاہم بیماری کے جراثیمی نظریئے کو حقیقت سمجھنے کے لیے ہمیں اکثر اوقات مختلف قسم کے حالات میں مشاہدات اکٹھے کرنے کے لمبے عمل سے گزرنا پڑتا ہے۔ پھر ان مشاہدات کی جانچ پڑتال اور تصدیق کی جاتی ہے۔

حقائق کی ہم جتنی احتیاط سے بھی جانچ پڑتال کریں' ان میں تھوڑا بہت ابہام رہ ہی جاتا ہے۔ مثلاً ۱۹۰۰ء میں نیوٹن کے قانو حرکت اور قانون کشش ثقل کو مکمل طور پر درست سمجھا جاتا تھا' کیونکہ ان کی اچھی طرح جانچ پڑتال اور تصدیق ہو چکی تھی۔ اس کے باوجود ۱۹۰۵ء میں آئن سٹائن کے نظریہ اضافیت نے ایک ایسا عمل شروع کر دیا جو نیوٹن کے قوانین میں کئی بنیادی درستگیوں کا موجب بنا۔ ہوسکتا ہے کہ مستقبل میں ایک اور نیوٹن یا ائن سٹائن پیدا ہو جائے جو نظریہ اضافیت میں ایسی ہی تصحیح کا موجب بنے۔

حقائق مسائل حل کرنے میں کیسے مدد کرتے ہیں

حقائق کا اہم استعمال یہ ہے کہ وہ زندگی کے ہر مرحلے میں پیش آنے والے مسائل حل کرنے میں مدد دیں۔ کوئی مسئلہ حل کرنے کے لیے دماغ میں جو عمل شروع ہوتا ہے' ابھی تک اس کو سمجھا نہیں جا سکا ہے۔ البتہ ہم یہ بات ضرور جانتے ہیں کہ مسائل حل کرنے کے لیے بعض طریق ہائے کار مددگار اور اکثر اوقات ناگزیر ہوا کرتے ہیں۔ ان

طریقوں کو گزشتہ چند صدیوں کے دوران میں سائنس دانوں نے بہت ترقی دی ہے۔

سائنس دان جس طریقے سے مسائل حل کرتے ہیں اور نئی دریافتیں عمل میں لاتے ہیں، اس کو عموماً سائنسی طریقہ کار کا نام دیا جاتا ہے۔ تاہم مسائل کے حل کے لیے کوئی ایک ''طریقہ'' معین نہیں ہے۔ مختلف لوگ اپنے اپنے طریقے استعمال کرتے ہیں۔ پھر بھی بعض عمومی اصول ایسے ہیں کہ جن کو جاننا اور بروئے کار لانا سب کے لیے اہم ہے۔ یہاں ہم ایسے ہی چند عمومی اصول پیش کرتے ہیں۔

(۱) مسئلے کا تعین کیجئے: مسئلہ حل کرنے کا عمل مسئلے کے ساتھ شروع ہوتا ہے۔ لہٰذا سب سے پہلے ضرورت اس امر کی ہوتی ہے کہ مسئلے کی حقیقی نوعیت کو بخوبی سمجھا جائے۔ مثال کے طور پر شرابی اکثر اوقات اس بات کو تسلیم نہیں کرتے (یا تحت الشعوری طور پر اسے تسلیم نہیں کرنا چاہتے) کہ وہ شراب کے عادی ہیں۔ یہ اعتراف کرنے کے بجائے وہ لڑاکا بیویوں یا شوہروں، غیر ہمدرد ساتھیوں یا پھر افسر کے خلاف الزام تراشی شروع کر دیتے ہیں جو ان کی تاخیر یا غیر حاضری پر گرفت کرتے ہیں۔

یہ معاملہ صرف افراد کا نہیں بلکہ معاشروں اور قوموں کا بھی یہی حال ہے۔ پیچیدہ حالات اکثر اوقات بنیادی معاشی، سماجی اور سیاسی مسائل کو دھندلا دیتے ہیں۔ مثلاً ہمارے ملکی بجٹ کا خسارہ سال بسال بڑھتا جارہا ہے۔ اس کا حل بس یہ ہے کہ حکومت اپنے اخراجات کم کرے یا پھر مزید ٹیکس عائد کر کے اپنے وسائل بڑھائے۔ یہ دونوں طریقے ایک ساتھ بھی استعمال کیے جاسکتے ہیں لیکن یہ مشکل حل ہیں۔ حکومت انہیں اختیار کرنے کی اپنے اندر سکت کیے جاسکتے ہیں لیکن یہ مشکل حل ہیں۔ حکومت انہیں اختیار کرنے کی اپنے اندر سکت نہیں پاتی۔ نتیجہ یہ ہے کہ بجٹ کا خسارہ کم ہونے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا اور عوام کے مصائب بڑھتے جارہے ہیں۔

بغور دیکھئے تو یہ مسئلہ سیاسی معلوم ہوتا ہے۔ ہمارا معاشرہ کئی گروپوں مثلاً محنت کشوں، ٹیکس دینے والوں، تاجروں اور صارفین پر مشتمل ہے۔ ہم نے بجٹ کا خسارہ کم کرنے کے جو دو حل ابھی تجویز کیے ہیں، ان سے یہ گروپ مختلف انداز میں متاثر ہوتے ہیں۔ ہر گروپ مسائل اور ان کے حلوں کو اپنے اپنے نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے۔ سیاست بھی زیادہ تر اس قسم کی ہوتی ہے۔ کشمکش زیادہ تر اس امر پر ہوتی ہے کہ مسئلے کا تعین کون سا

گروپ کرے گا۔ ظاہر ہے کہ حل کا تعین بھی مسئلے کے حوالے سے ہوتا ہے۔

اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ہمارے ہاں ایک طرف جاگیردار ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ہمارے ملک کا بنیادی مسئلہ عوام کو قابو میں رکھنا ہے کیونکہ وہ بے قابو ہوتے جا رہے ہیں، امن و امان برباد کر رہے ہیں اور انتشار پھیلا رہے ہیں۔ دوسری طرف عوام ہیں، ان کا کہنا ہے کہ بنیادی مسئلہ جاگیرداری اور ناجائز مراعات کو ختم کرنا ہے تاکہ سب لوگوں کو باوقار زندگی کا موقع مل سکے۔ اب چونکہ جاگیردار طاقتور ہیں، اس لیے ان کا مسئلہ ''قومی مسئلہ'' قرار پاتا ہے اور ریاست کے تمام ادارے اسے حل کرنے کے لیے بروئے کار لائے جاتے ہیں۔

سائنسی تحقیق عموماً انسانی حیرت سے شروع ہوتی ہے یا پھر آجروں یا حکومتوں کی ضروریات سے جنم لیتی ہے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ایٹمی فیوژن کے ذریعے توانائی پیدا کرنے کی ساری دنیا میں کوششیں ہو رہی ہیں۔ اس معاملے میں مسئلہ بالکل واضح ہے اور وہ یہ ہے کہ گھروں اور کارخانوں کے لیے زیادہ توانائی درکار ہے۔ لہٰذا اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے سائنس دانوں کی خدمات حاصل کی گئی ہیں۔ لیکن سائنس دان محض اس قسم کی ضروریات پوری کرنے کے لیے ہی کام نہیں کرتے بلکہ کبھی کبھی فطرت کا کوئی معمہ ان کی توجہ کا مرکز بن جاتا ہے اور وہ اس کو حل کرنے کے لیے تحقیق شروع کر دیتے ہیں۔ گویا ان کے سامنے کوئی مسئلہ آتا ہے اور وہ کسی کی ہدایت کے بغیر ہی اسے حل کرنے کے لیے سرگرم کار ہو جاتے ہیں۔ ایک زمانے میں سائنس دان اسی طور کام کیا کرتے تھے۔ اب ایسا کم ہی ہوتا ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ سائنسی تحقیق بہت مہنگی اور پیچیدہ ہو گئی ہے اور اس کے لیے اکثر اوقات ماہرین کی بڑی بڑی جماعتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

اس ضمن میں برطانوی سائنس دان جیمز سی میکسویل کا ذکر کیا جا سکتا ہے جس نے انیسویں صدی کے پہلے عشرے میں روشنی کو سمجھنے کے لیے پانچ سال تک تحقیق کی تھی۔ اس تحقیق کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ روشنی ایک ''الیکٹرومیگنیٹک ویو'' ہے۔ اس کا یہ بھی خیال تھا کہ اس قسم کی مزید لہریں بھی ہو سکتی ہیں جو اس کے زمانے میں دریافت نہ ہوئی تھیں۔

بیس برس بعد جرمن سائنس دان ہنرک برٹز نے میکسویل کی اس خیال آرائی پر کام کرنے کا ارادہ کیا۔ یوں اس نے اولین ریڈیو ویوز دریافت کر لیں۔

روشنی کی ماہیت کو جاننے کی یہ اولین کاوشیں اب دنیا بھر میں ٹیلی وژن اور مواصلاتی مصنوعات کی صنعتوں کے عظیم الشان جال کا سبب بن چکی ہیں۔ انہوں نے ہماری دنیا کو عالمی معاشرے کا روپ دے دیا ہے۔ ہمارے زمانے میں لاکھوں کروڑوں انسان میکسویل، برٹز اور بہت سے دوسرے سائنس دانوں، انجینئروں، سرمایہ کاروں اور ایجاد کنندگان کی واضح سوچ اور مسائل حل کرنے کی اعلیٰ اہلیت کی بدولت روزی کما رہے ہیں۔

(۲) مسئلہ حل کرنے کے لیے حقائق جمع کیجئے: اس کتاب میں ہم نے قطب شمالی کے امریکی فوجی اڈے پر رونما ہونے والے ایک واقعہ کی مثال پیش کی تھی۔ ہم نے بتایا تھا کہ ریڈار کی سکرین پر مشتبہ نقطے دکھائی دینے پر اڈے کے حکام، ہیڈکوارٹرز سے ٹیلی فون پر رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی تھی لیکن رابطہ کسی فنی نقص کے سبب نہ ہو سکا تھا۔ یوں ان کے پاس ناکافی حقائق رہ گئے تھے جن کی بنیاد پر انہیں فیصلہ کرنا تھا۔ انہیں مزید حقائق کی ضرورت تھی۔ اس قسم کے حقائق انہیں ہیڈکوارٹرز سے رابطہ ہونے کی صورت میں دستیاب ہو سکتے تھے۔ ہیڈکوارٹرز والے ریڈار کے دوسرے اڈوں سے معلومات حاصل کر کے اس امر کی تصدیق یا تردید کر سکتے تھے کہ دشمن کے میزائل امریکہ کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

(۳) مزید حقائق اکٹھے یا تیار کرنے کے لیے انسانی یادداشت، منطقی استدلال اور قابل اعتماد معلومات سے کام لیجئے:

قطب شمالی کے اس ریڈار اڈے کے حکام نے مسئلے کو حل کرنے میں مدد دینے کے قابل نئے حقائق کے حصول کے لیے اپنے حافظوں سے مدد لی۔ اڈے کے کمانڈنگ آفیسر کو ایک اچھا سوال سوجھا۔ اس نے پوچھا کہ اس وقت سوویت وزیراعظم کہاں ہیں۔

اکثر حالات میں جب اس اڈے جیسا دباؤ نہیں ہوتا تو حقائق جمع کرنے اور منطقی استدلال سے کام لینے کا عمل انسانی دماغ میں خاموشی سے جاری رہتا ہے۔ مثلاً ہم ماہرین کے ساتھ گفتگو کرتے ہیں، ان کا مشورہ لیتے ہیں، متعلقہ مسئلے سے متعلق کتابیں پڑھتے

ہیں' سوچ بچار بھی جاری رہتا ہے' یہاں تک کہ حقائق حاصل کرنے کے لیے ہم اپنے طور پر تجربے بھی کرتے ہیں۔ یوں بالآخر ایک ایسا مقام آ جاتا ہے جب ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے پاس اس قدر حقائق جمع ہو گئے ہیں جن کی اساس پر فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔

(۴) نتیجہ اخذ کیجیے: چوتھے باب میں ہم بعض منطقی عملوں پر بحث کریں گے۔ اس قسم کے منطقی اعمال کی مدد سے ہم حقائق کی بنیاد پر کسی نتیجے تک پہنچ سکتے ہیں اور شاید اپنا مسئلہ حل کرنے کے لیے کوئی قدم اٹھانے کا فیصلہ بھی کر سکتے ہیں۔

ریڈار اڈے کے حکام نے اس سوال سے بہت اہم منطقی نتیجہ اخذ کیا تھا کہ ''خروشیف کہاں ہیں؟'' اس سوال کا جواب یہ تھا کہ وہ امریکہ میں ہیں۔ گویا اس کا مطلب یہ تھا کہ اگر سوویت وزیراعظم امریکہ میں ہیں تو اس وقت سوویت یونین امریکہ پر حملہ نہیں کر سکتا۔ اس طرح ریڈار اڈے کے حکام نے اپنا مسئلہ حل کر لیا اور انہوں نے جان لیا کہ دشمن کے میزائل امریکہ پر حملے کے لیے نہیں آ رہے ہیں۔ اکثر مسائل کے حل میں اس قسم کی صورتِ حال پیش نہیں پڑتی۔ اکثر اوقات ہمیں کسی نتیجے تک پہنچے کے لیے بہت سے حقائق جمع کرنے پڑتے ہیں اور سوچ بچار سے کام لینا پڑتا ہے۔

آئندہ باب میں ہم ان طریقوں کا جائزہ لیں گے جن کے سبب تخیل کو غلطی سے حقیقت سمجھ لیا جاتا ہے۔ یوں بہت سے توہمات جنم لیتے ہیں اور وہ حقیقی مسائل حل کرنے کی ہماری کوششوں کو نقصان پہنچاتے ہیں۔

توہم پرستی اور سائنس

۴۸۰ سال قبل مسیح میں ایران کے بادشاہ کخسر و نے ایتھنز کے قریب یونانیوں پر حملہ کرنے کے لیے ایک ہزار جہازوں پر مشتمل بحری بیڑہ روانہ کیا۔ جوابی تدابیر سوچنے کے لیے یونانی شہری ریاستوں کے نمائندوں کا ایک اجلاس ہوا۔ اس اجلاس میں بعض نمائندوں کا کہنا تھا کہ انہیں اطاعت قبول کر لینی چاہیے۔ جبکہ بعض دوسرے' حالات سازگار نہ ہونے کے باوجود ایرانیوں کا مقابلہ کرنے پر زور دے رہے تھے۔

یونانیوں نے اپنے زمانے کے رواج کے مطابق ڈیلفی کے ''ہاتف غیبی'' سے رجوع کیا۔ ڈیلفی کے مندر کی کاہنہ نے مقدس کنویں کا پانی پیا' لاریل پودے کی پتیاں چبائیں اور لارل شاخ کو چھو کر تیار ہوئی۔ جب اس پر وجد طاری ہو گیا تو ایرانی حملے کا مسئلہ اس کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس پر کاہنہ نے مفروضہ طور پر دیوتا اپالو کی طرف سے یہ جواب دیا کہ لوگوں کو ''چوبی دیواروں'' پر بھروسہ کرنا چاہیے۔

خیر' دیوتا نے ان دیواروں کا اتا پتا نہیں بتایا تھا۔ بعض لوگوں کا کہنا تھا کہ ان الفاظ کے ذریعے دیوتا نے شہر کے پرانے قلعے میں چوبی مورچہ بنانے کا حکم دیا ہے۔ تھیمسٹو فلیز یونانی فوج کا سردار تھا۔ اس نے ایرانیوں کے مقابلے کے لیے بحری جنگ کا ایک منصوبہ تیار کر رکھا تھا۔ چنانچہ وہ اپنی اس توجیہ پر زور دے رہا تھا کہ ''چوبی دیواروں'' سے دیوتا کی مراد بحری جہازوں کے ڈھانچے ہیں۔ آخر کار اس کی توجیہ مانی گئی اور اس

نے تین سو چھوٹے جہازوں کے ایک بیڑے کو چابکدستی سے استعمال کرتے ہوئے ایرانیوں کو شکست دے دی۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ایک لحاظ سے دیوتا ''اپالو'' کی پیش کردہ تجویز درست ثابت ہوگئی تھی۔ یوں اس طریقے سے مسائل حل کرنے میں لوگوں کا اعتماد بڑھ گیا۔ تاہم ہمیں تعریف تھیمسٹوفلیز کی کرنی چاہیے جس نے ہاتف غیبی کی مبہم بات کو ایک مناسب تعبیر عطا کی اور یوں اسے ایک موثر عملی منصوبے میں ڈھال دیا۔

ماضی میں توہم پرستی:

یہ واقعہ قدیم اقوام کے مقبول عام طرزِ فکر کی نشاندہی کرتا ہے۔ ادوار گزشتہ کے لوگوں کو ان پر اثر انداز ہونے والی فطرت کی قوتوں کا بہت کم علم تھا۔ ان کے خیال میں طوفان بظاہر کسی سبب کے بغیر اٹھتے تھے اور ان کے گھروندوں کو روند ڈالتے تھے۔ ناقابلِ یقین قوت کے ساتھ آسمانی بجلی اچانک لپکتی تھی اور پل بھر میں درختوں اور عمارتوں کو راکھ کر دیتی تھی۔ طاعون حملہ کرتا تھا اور ہزاروں لاکھوں کی جان چلی جاتی تھی۔ کسی برس خشک سالی فصلوں کو تباہ کر دیتی تھی اور دوسرے ہی برس بارشوں سے کھیت لہلہانے لگتے تھے۔

لوگ ان تباہ کن واقعات کے سبب جاننا چاہتے تھے۔ اگر انہیں اسباب کا علم ہوتا تو وہ نقصان کو روکنے یا کم کرنے کے طریقے تلاش کر سکتے تھے۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان بربادیوں کی مختلف تعبیریں کی جانے لگیں۔ لوگ یہ سوچنے لگے کہ فطری واقعات پر مختلف دیوتاؤں یا ماورائے فطرت روحوں کی حکمرانی ہے اور وہ اپنی مخصوص محبتوں یا نفرتوں کے تحت عمل پیرا ہوتے ہیں۔

یہ بات قابلِ فہم تھی کہ آسمانی بجلی کا کوندا اس امر کا اشارہ ہے کہ عطارد دیوتا لوگوں یا ان کے کسی سردار کی کرتوت پر ناراض ہے۔ اگر کوئی شخص سیڑھیوں سے گر کر اپنی ٹانگ تڑوا لیتا تو یہ سمجھنا آسان تھا کہ اس کو اس گھر میں پہلے کبھی رہنے والے کسی مرحوم شخص کی روح نے کسی بات پر ناراض ہو کر سیڑھیوں سے دھکا دے دیا ہوگا۔ بیماری کی ذمہ داری چڑیلوں پر ڈالی جاتی تھی اور بہت سی مردہ عورتوں کی روحوں کو چڑیلیں سمجھا جاتا تھا۔ حالیہ زمانوں تک اس قسم کا اندازِ فکر بہت مقبول تھا۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ

۱۶۹۲ء میں امریکی ریاست میسوچیوسٹس میں ایک مقدمہ درج ہوا جس کے تحت ڈیڑھ سو بے گناہ مردوں اور عورتوں کو جادوٹونے کے الزام میں گرفتار کیا گیا۔ ان میں سے ۱۹ پر خصوصی عدالت میں مقدمہ چلایا گیا اور گنہگار ثابت کر کے پھانسی پر چڑھا دیا گیا تھا۔ ان کا جرم کیا تھا؟ یہ قصہ دسمبر ۱۶۹۱ء میں شروع ہوا جب سلیم کے مقام پر آٹھ لڑکیوں کو عجیب و غریب حرکات کرتے دیکھا گیا۔ ان کی گفتگو بے ترتیب تھی' انداز اور جسمانی حرکات بے ہنگم تھیں اور ان پر تشنج کی کیفیت طاری تھی۔ معالج بلائے گئے' لیکن وہ اس طرز عمل کی توجیہ نہ کر سکے۔ ان میں سے ایک ڈاکٹر نے جادوٹونے کا خدشہ ظاہر کیا۔ اس پر بعض لڑکیوں نے ''بری'' شہرت رکھنے والی دو بوڑھیوں کے علاوہ اپنے خاندان کی کنیزوں میں سے ایک پر جادوگری کا الزام لگایا۔ ان تینوں کو گرفتار کر لیا گیا۔

ان ملزموں کو سزا دینے کے لیے دو نمایاں شہادتیں بروئے کار لائی گئیں۔ مثلاً متاثرہ لڑکیوں میں سے کوئی یہ کہہ دیتی کہ اس نے ملزم کا آسیب دیکھا تھا تو اس سے ملزم کی گرفتاری اور مقدمے کا جواز مہیا ہو جاتا۔ دوسری طرف اگر کوئی تشنج زدہ لڑکی ملزم کے چھونے سے تشنج سے نجات پا لیتی تو گویا یہ ثابت ہو جاتا کہ ملزم نے اس پر جادو کر رکھا تھا۔

اس زمانے میں جادوٹونے کا یہ ''ٹیسٹ'' عام تھا اور اس کی کئی صورتیں تھیں۔ مثلاً اس کی ایک صورت یہ تھی کہ جس شخص پر جادوٹونا کرنے کا شک ہوتا' اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر پانی میں پھینک دیا جاتا۔ اگر وہ پانی پر تیرتا رہتا تو وہ جادوگر ''ثابت'' ہو جاتا۔ اگر وہ ڈوب جاتا تو اسے بے گناہ خیال کیا جاتا۔ اس بات کی پرواہ نہ کی جاتی تھی کہ ایک بے گناہ شخص ڈوب کر ہلاک ہو گیا ہے۔ اس کے بجائے ''سچائی'' کو جاننا زیادہ اہم سمجھا جاتا تھا۔

تو کیا جن آٹھ لڑکیوں کا ہم نے ذکر کیا ہے' وہ ہسٹریا یا کسی اور ذہنی عارضے میں مبتلا تھیں۔ غالباً ان کی عجیب و غریب حرکات کا کوئی اور سبب بھی تو ہو سکتا ہے۔

اچھا تو کیا ہم خوش نصیب نہیں کہ آج کے زمانے میں زندہ ہیں جب بھوت پریت' جادوٹونا' کالا جادو اور ایسی ہی دیگر خرافات پہلے جیسی عام نہیں ہیں۔

آج کے توہمات

خیر، ہمارے زمانے میں بھی دنیا توہمات سے پوری طرح پاک نہیں ہوئی۔ سوچ کے پرانے طریقوں کے بہت سے نشان ابھی تک باقی ہیں۔ ہمارے گردوپیش بہت سے لوگ اب بھی روحوں، بھوتوں اور چڑیلوں پر یقین رکھتے ہیں۔ بہت سی دوسری توہمات بھی ختم نہیں ہوئیں۔ گلی میں چلتے ہوئے سیاہ بلی راستہ کاٹ جائے تو اسے نحوست کا نشان سمجھنے والوں کی آج بھی کمی نہیں۔ کالی بلی کو اب بھی چڑیل سمجھا جاتا ہے، جو نحوست لانے کے لیے بھیس بدل کر آتی ہے۔ برطانیہ میں البتہ کالی بلی مختلف انداز کی مثال ہے۔ چنانچہ برٹش ایئرویز کے ایک اشتہار میں ایک برطانوی تھیٹر کی تصویر پر یہ الفاظ دکھائے گئے ہیں کہ ''خوش قسمتی کو یقینی بنانے کے لیے لندن کے اکثر تھیٹروں میں کم از کم ایک کالی بلی پالی جاتی ہے''۔

دوسری توہمات کا بھی یہی حال ہے۔ مختلف علاقوں اور ملکوں میں ان کے معانی بدل جاتے ہیں۔ عموماً توہمات کے معنی ایک جگہ کے مقابلے میں دوسری جگہ بالکل متضاد ہو جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہی دیکھیے کہ ہمارے ہاں کالی بلی نحوست کی علامت ہے جبکہ برطانیہ میں اسے خوش بختی کا پیامبر خیال کیا جاتا ہے۔

ہمارے ہاں آج بھی بہت سے لوگ اپنے دشمنوں کو نیچا دکھانے اور انہیں ساز دینے کے لیے کالے جادو سے کام لیتے ہیں۔ اکثر اوقات وہ اپنے دشمن کی شبیہ بنا کر اس میں سوئیاں چبھو دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس طرح ان کے دشمن کو تکلیف پہنچے گی۔ بعض دوسرے لوگ قسمت کا حال جاننے کے لیے نجومیوں کے پاس جاتے ہیں یا دست شناسوں سے رجوع کرتے ہیں۔ مغرب میں اب بھی رواج ہے کہ ۱۳ کے ہندسے کو منحوس خیال کرتے ہوئے ہوٹلوں میں ۱۳ نمبر کا کمرہ نہیں رکھا جاتا یا اونچی اونچی عمارتوں میں منزلوں کے نمبر لگاتے وقت ۱۳ کا ہندسہ غائب کر دیا جاتا ہے۔ لوگوں کو یہ خیال ہوتا ہے کہ ۱۳ کے ہندسے کو منحوس سمجھنے کا وہم درست ہو سکتا ہے، لہٰذا خواہ مخواہ کوئی مصیبت کیوں مول لی جائے۔ دفتر کے لیے جگہ تلاش کرنے والے اس عمارت کو نظرانداز کر دیتے ہیں جس میں تیرہویں منزل موجود ہو۔ وجہ یہ ہے کہ چاہے وہ خود توہم پرست نہ ہوں، لیکن ان کے گاہک تو ہو سکتے ہیں۔

بعض توہمات بہت مہلک ثابت ہوتے ہیں۔ اخبارات میں اکثر اس قسم کی

خبریں شائع ہوتی رہتی ہیں کہ کسی پیر نے جادو کا اثر ختم کرنے کے لیے مریض کا گلا گھونٹ ڈالا یا کسی آسیب زدہ شخص کو اتنا پیٹا گیا کہ وہ بے چارا جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ اس قسم کے واقعات صرف ہمارے ہاں نہیں ہوتے بلکہ ترقی یافتہ ملکوں سے بھی اس قسم کی خبریں آتی رہتی ہیں۔ چنانچہ ۱۹۸۹ء میں ایک امریکی عدالت نے اپنے چار سالہ بیٹے کو بھوکا مارنے کے جرم میں ایک عورت کو سزا دی تھی۔ اس عورت نے دراصل اپنے مذہبی فرقہ کے سربراہ کی ہدایت پر عمل کیا تھا' جس کا کہنا تھا کہ بچے کو بھوکا رکھنے سے بدروحیں اس کے جسم سے نکل جائیں گی۔ میکسیکو میں بدمعاشوں کا ایک گروہ' بدقسمتی سے بچنے کی خاطر نوجوانوں کو پکڑ کر ہلاک کر دیا کرتا تھا۔

اس قسم کے واقعات آج کی دنیا میں بھی کم وبیش روزانہ ہی رونما ہوتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قدیم اور وحشیانہ اندازِ فکر ابھی ختم نہیں ہوا۔

مافوق الفطرت جادو پر ایمان

توہمات کی نوعیت بنیادی طور پر آج بھی ویسی ہی ہے جیسی کہ ماضی میں ہوا کرتی تھی۔ اس کے عناصر میں غیر مرئی اور پراسرار قوتوں کی سحر انگیز قوتیں' بدروحیں' جن بھوت اور سیاروں اور ستاروں کے اثرات وغیرہ شامل ہیں۔ پرانے زمانے میں لوگ دیوتاؤں' جنوں بھوتوں' بدروحوں وغیرہ کو اکثر واقعات کا ذمہ دار خیال کرتے تھے۔ یہ مافوق الفطرت عامل دکھائی نہیں دیتے تھے۔ یہ موٹی موٹی دیواروں سے گزر جاتے تھے۔ اپنی شکلیں بدل سکتے تھے۔ انسانوں کی خوش قسمتی یا بدبختی کا سبب بنتے تھے۔ مستقبل کے واقعات کی پیش گوئی کرتے تھے اور پیش گوئیوں کو سچا بھی بنا دیتے تھے۔

آج کل کے وہم مافوق الفطرت عاملوں پر زیادہ منحصر نہیں ہیں۔ اس کے بجائے وہ تجریدی' ساحرانہ کارپردازی اور دوسرے طریقوں پر زیادہ انحصار رکھتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ ہمارے شہروں میں بعض نجومی قسمت کا حال بتانے کے لیے طوطے استعمال کرتے ہیں۔ اسی طرح کارڈ' پتے اور گیند بھی استعمال کیے جاتے ہیں۔ جب کوئی نجومی آپ سے کہے کہ وہ خوش قسمتی کو آپ کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ رہا ہے تو اس سے پوچھنا چاہئے کہ ''بھئی عالمِ غیب کی یہ خبر آپ تک کیسے پہنچی ہے'' کوئی طوطا' کارڈ' پتہ یا

گیند، کوئی ستارہ یا ہاتھ کی لکیریں آپ کو خوش بختی کی خبر کیونکر دے سکتی ہیں؟ لاکھوں کروڑوں میل دور سے کوئی ستارہ آپ کے روٹھے ہوئے محبوب کو آپ سے کیسے ملوا سکتا ہے؟ کسی کمرے کے دروازے پر ۱۳ کا ہندسہ لکھے جانے سے وہ نحوست اور بدبختی کا مرکز کیسے بن جاتا ہے؟

یاد رکھیئے کہ جونہی اس قسم کے سوالات اٹھائے جائیں تو مافوق الفطرت عقیدوں کی نامعقولیت نمایاں ہونے لگتی ہے۔

نجوم ہمارے زمانے کا مقبول ترین توہم ہے۔ یہ اندازہ آپ اس امر سے لگا سکتے ہیں کہ ہر سال اس موضوع پر سینکڑوں کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ ہر روز دنیا میں ہر جگہ سینکڑوں اخبارات میں نجومیوں کے کالم شائع ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں بازاروں میں، پارکوں اور بے شمار دوسرے مقامات پر آپ کو جا بجا نجومیوں کے اڈے بھی دکھائی دیتے ہیں۔ اس عام مقبولیت کے پیشِ نظر ہم نے اس کتاب کے ساتویں باب میں نجوم کا مفصل تجزیہ پیش کیا ہے اور اس امر کی وضاحت کی ہے کہ اسے کیوں توہم پرستی کی ایک صورت سمجھنا چاہیے۔

۱۹۶۰ء کے عشرے میں توہم پرستی کا زور بڑھنے لگا تھا۔ اس کے کئی اسباب تھے۔ لیکن ایک بڑا سبب یہ تھا کہ لوگ سائنس سے مایوس ہونے لگے تھے۔ ان کو امید تھی کہ سائنس کی ترقی سے خوشحالی اور امن کا دور شروع ہوگا۔ بلاشبہ سائنس خوشحالی لے کر آئی۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ تباہ کن ایٹمی ہتھیاروں کو بھی اس نے جنم دیا، جو دیکھتے ہی دیکھتے ساری دنیا کو تباہ کر سکتے ہیں۔ اس عشرے میں ویت نام کے علاوہ کئی اور مقامات پر لڑائیاں ہو رہی تھیں اور نوجوان ان سے متنفر تھے۔ یہاں تک کہ وہ اتھارٹی اور حکومتوں کے بھی خلاف ہو گئے۔ سائنس کو وہ حکومتوں کے ہاتھ میں خوفناک ہتھیار خیال کرنے لگے۔

سائنس سے مایوسی نے اس کی مخالف سمت یعنی توہم پرستی کی طرف توجہ کا رخ کر دیا۔ اس طرح انہوں نے سائنس کے طریقوں کو بھی مسترد کر دیا جو نسل انسانی کے لیے بہت مفید ثابت ہو چکے تھے۔ ان سائنسی طریقوں کی مدد سے کئی مہلک بیماریوں کا خاتمہ کیا جا سکتا تھا، خوراک کی پیداوار میں اضافہ ہوا تھا، اوسط عمر تقریباً ہر جگہ بڑھ گئی تھی اور زندگی کا معیار بہتر ہوا تھا۔ یہی نہیں بلکہ ۱۹۶۰ء کے عشرے کی ناراض نسل نے معروضیت،

معقولیت اور غور و فکر کے ان تمام طریقوں کو رَد کر دیا جن کی مدد سے سائنس دان بہت سے مشکل مسائل حل کرنے کے قابل ہوئے تھے۔

سائنس، مسائل حل کرنے والا ''انجن'' ہے

سائنس کے طریق ہائے کار اور خاص طور پر اس کے طرزِ فکر کو کئی قسم کے مسائل حل کرنے کے لیے ایک طاقتور ''انجن'' خیال کیا جا سکتا ہے۔ مسائل حل کرنے والے اس انجن کو جن مقاصد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، ان کی بنیاد حکومتوں اور عام لوگوں کے فیصلوں پر ہوتی ہے۔ خود یہ انجن اپنے مقاصد کا تعین نہیں کرتا۔ اگر کوئی ڈرائیور اپنی کار کو بھیڑ میں گھسیڑ دیتا ہے تو ہم کار کے انجن کو برا بھلا نہیں کہتے بلکہ ڈرائیور پر الزام لگاتے ہیں۔ اسی طرح سائنسی فکر کے انجن کو بھی اچھائی اور برائی دونوں کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ یہ فیصلہ ہمیں کرنا ہوتا ہے کہ اسے کس مقصد کے لیے بروئے کار لایا جائے۔

ہماری دنیا کے بہت سے مسائل سائنس اور اس کے اندازِ فکر کو بروئے کار لائے بغیر حل نہیں کیے جا سکتے۔ دور جانے کی کیا ضرورت ہے، ماحولیاتی مسائل کو ہی لیجیے، جن کا ہمیں سامنا ہے۔ کاربن ڈائی آکسائیڈ میں اضافہ سے عالمی حدت کاری کا مسئلہ، اوزون کی تباہی، آبادی میں بے تحاشا اضافہ اور جنگلات کی بربادی جیسے مسائل بہت سنگین ہیں۔ ان مسائل سے موثر طور پر عہد برآ ہونے کے لیے درست معلومات درکار ہوتی ہیں۔ اس قسم کی معلومات تحقیق کے صرف سائنسی طریقوں کی مدد سے حاصل کی جا سکتی ہیں۔ نجوم، جادو ٹونا یا شاعرانہ تخیل کے ذریعے درست معلومات حاصل نہیں کی جا سکتیں۔

بہرطور سائنس کافی نہیں۔ وسائل کا تعین کرنے، تحقیق کے لیے مالی وسائل مہیا کرنے، اخراجات پورے کرنے کے لیے ٹیکس لگانے، زمین کے ماحول کے بارے میں نئی اقدار کو فروغ دینے کی خاطر تعلیم کا انتظام کرنے اور ایسے ہی دیگر کئی امور کے لیے حکومتوں اور ماہرین کو پیچیدہ اور مشکل سیاسی اور معاشی فیصلے کرنے پڑتے ہیں۔

سائنس کی بیشتر سرگرمیوں کا مرکز ہمارے ماحول میں رونما ہونے والے مختلف واقعات کے درمیان علتی رابطوں کی تلاش ہے۔ زمانہ قدیم کے لوگ بھی مختلف مظاہر کے اسباب معلوم نہ ہوتے تو وہ ان واقعات کی ذمہ داری دیوتاؤں، جن بھوتوں، بلاؤں اور کئی

قسم کی روحوں پر ڈال دیتے۔ یوں واقعات پر اپنی مرضی کے مطابق اثر انداز ہونے کے لیے پرانے زمانے کے لوگ ان مافوق الفطرت عاملوں کو نت نئے طریقوں سے خوش کرنے کی کوشش کرتے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح ان کے حالات بہتر نہ ہوتے' البتہ ممکن ہے کہ کسی حد تک ان کی تسلی ہو جاتی ہو۔

آج کے سائنس دانوں نے بتہ سے پراسرار مظاہر کے حقیقی اسباب تلاش کر لیے ہیں۔ یوں انہوں نے ہم کو ان مظاہر سے عہدہ برآ ہونے بلکہ کسی حد تک انہیں کنٹرول کرنے کے قابل بنا دیا ہے۔

علت اور معلول

سائنسی تحقیق کا ایک بنیادی مقصد واقعات کے اسباب دریافت کرنا ہے۔ روزمرہ استدلال کا زیادہ تر مقصد بھی یہی ہوتا ہے۔ اچھا تو جب ہم کسی واقعہ کے رونما ہونے کے ''سبب'' کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے ہماری مراد کیا ہوتی ہے؟ یوں کہہ لیجئے کہ اس سے ہماری مراد کسی عمل کا تو تر ہوتا ہے۔ پہلے کوئی عمل ہوتا ہے' پھر ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے بعد کوئی اور عمل وجود میں آتا ہے۔ کبھی یہ عمل پہلے کے فوراً بعد اور کبھی کچھ وقت کے بعد وجود پذیر ہوتا ہے۔ جب کبھی ہم پہلے عمل کو دیکھتے ہیں تو دوسرا بھی مشاہدے میں آتا ہے۔ یوں ہم پہلے کو دوسرے عمل کا سبب یا علت سمجھنے لگتے ہیں جبکہ دوسرے کو پہلے کا نتیجہ یا معلول قرار دیتے ہیں۔

خیر' ہمیں یہ بات بھی پیش نظر رکھنی چاہیے کہ جب کوئی واقعہ ہمیشہ دوسرے کے بعد رونما ہوتا ہے تو ضروری نہیں کہ پہلا واقعہ علت اور دوسرا معلول ہو۔ مثال کے طور پر اگر ایک خاص قسم کا بادل ہمیشہ بارش سے پہلے دکھائی دیتا ہے تو ہم اس سے یہ نتیجہ اخذ انہیں کر سکتے کہ وہ بادل بارش کا سبب ہے۔ اصل میں سائنس دانوں نے یہ بات دریافت کی ہے کہ بادل اور ان کے ساتھ آنے والی بارش دونوں اس وقت وجود پذیر ہوتے ہیں جب ہوا ٹھنڈی ہو جاتی ہے اور آبی بخارات چھوٹی چھوٹی بوندوں میں ڈھل جاتے ہیں۔ پانی کی یہ بوندیں ہی بادل بناتی ہیں۔ اب اگر وہ بوندیں ایک حد تک بڑی ہو جائیں تو بارش کی صورت میں زمین پر گرنے لگتی ہیں۔

کسی دیوار پر ٹھوکر لگائیں تو آپ کے پاؤں پر چوٹ لگتی ہے۔ اگر آپ دوبارہ ٹھوکر لگائیں گے تو چوٹ بھی دوبارہ لگے گی۔ چالیس پچاس بار ٹھوکر لگانے کے بعد آپ اس نتیجے پر پہنچ جائیں گے کہ چوٹ لگنے کا سبب دیوار پر ٹھوکر مارنا ہے۔ تاہم کوئی خود پرست بچہ دیوار کو چوٹ کی وجہ قرار دے سکتا ہے۔

کسی ماہرِ نفسیات کی رائے یہ ہوسکتی ہے کہ ٹھوکر مارنے والے کو اپنے جارحانہ جذبے سے نجات حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ اس صورت میں اس کی نفسیاتی کیفیت کو چوٹ لگنے کی بڑی وجہ ٹھہرایا جائے گا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ٹھوکر مارنے والا چوٹ لگنے مین خوشی محسوس کرتا ہو۔ اس صورت میں ٹھوکر مارنے والے کی ذہنی صورتِ حال کو اس کی بڑی وجہ سمجھنا ہوگا۔

علیت کے بارے میں اکثر لوگ سادہ جوابات کا تقاضا کرتے ہیں۔ وہ کسی سادہ علت کو واحد جواب خیال کر لیتے ہیں۔ لیکن زندگی اس سے زیادہ پیچیدہ ہے اور پیچیدہ انسانی معاملات میں رونما ہونے والے واقعات کے پیچھے اکثر اوقات کئی اسباب کارفرما ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ دیکھئے کہ ہمارے معاشرے میں جرائم میں اضافے کا کیا سبب ہے؟ کیا آپ محض افلاس کو' بے روزگاری کو' منشیات کو' ٹیلی وژن اور فلموں میں تشدد کی ڈرامائی نمائش کو سبب قرار دے سکتے ہیں۔ کیا اسلحہ کی بھرمار' امن وامان کے بحران' اخلاقی اقدار کے زوال اور تعلیمی نظام کی پستی میں سے کسی ایک کو جرائم کے اضافے کی واحد وجہ قرار دے سکتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ یہ بات درست نہیں ہوگی۔ ہمارے معاشرے میں جرائم بڑھ رہے ہیں تو اس کے بہت سے اسباب ہیں اور جو لوگ محض ایک سبب پر اصرار کرتے ہیں' ان کا موقف درست نہیں ہے۔

کسی ایک سادہ سبب پر اصرار کرنے والے لوگ مسائل کا حل تلاش کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ صرف اپنے حل کو آزماتے ہیں اور دوسرے اسباب کو نظرانداز کر دیتے ہیں۔

کبھی کبھی ہم اسباب اور نتائج کو کنفیوژ کر دیتے ہیں اور یہ نہیں بتا سکتے کہ علت کونسی ہے اور معلول کونسا ہے۔

سبب کو جاننا

زیادہ سے زیادہ واقعات کے اسباب ونتائج کو جاننے کی بڑی اہمیت ہے۔ مثلاً جب کوئی ڈاکٹر مریض کا معائنہ کرتا ہے تو اس کا پہلا کام مرض کا تعین کرنا ہے۔ یعنی وہ یہ جاننا چاہتا ہے کہ مریض کے مرض کا سبب کیا ہے اور اس کے مرض کی نوعیت کیا ہے۔ عام طور پر اس طریقے سے ڈاکٹر جو نتائج اخذ کرتا ہے' ان سے مریض کی شکایت کی نشاندہی بھی ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر مرض کے تعین کا کام کئی قسم کے آلات اور ٹیسٹوں کی مدد سے کرتا ہے۔ گویا وہ چھوٹے چھوٹے ''تجربے'' کرتا ہے جن کا مقصد ''مشاہدات'' پیدا کرنا ہوتا ہے۔ ان مشاہدات سے وہ بنیادی حقائق حاصل ہوتے ہیں جن کی بنیاد پر مرض کے سبب کا تعین ہو سکتا ہے۔

ڈاکٹر اپنا کام یوں شروع کرتا ہے کہ وہ مریض کی چھاتی کا سٹیتھوسکوپ کے ذریعے جائزہ لیتا ہے۔ اس کی آنکھوں' کانوں اور گلے میں دیکھتا ہے۔ وہ مریض کو دل کا معائنہ کروانے' خون ٹیسٹ کروانے یا اس قسم کے دوسرے ٹیسٹوں کا مشورہ دے سکتا ہے۔ اس قسم کے ٹیسٹ سائنس دانوں کی سالہا سال کی تحقیقات سے وجود میں آتے ہیں اور وہ مرض کا زیادہ سے زیادہ صحیح طور پر تعین کرنے میں مددگار ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر کو جب مشاہدات پر مبنی حقائق خاصی تعداد میں مل جاتے ہیں تو پھر وہ کسی نتیجے تک پہنچ سکتا ہے یعنی وہ مریض کے مرض کی تشخیص کر سکتا ہے۔ یوں مرض کا سبب معلوم ہونے پر موثر علاج کا عمل شروع ہو سکتا ہے۔

واقعات کے اسباب دریافت کر کے مسائل حل کرنے کا طریقہ کار سائنس پر مبنی ہے۔ گزشتہ چند صدیوں کے دوران میں اس طریقہ کار کو بہت ترقی دی گئی ہے۔ یہ بہت طاقتور اور مفید طریقہ کار ہے۔ جس نے نہ صرف طبی علم بلکہ جدید زندگی کے دوسرے تمام پہلوؤں کی بھی کایا پلٹ دی ہے۔ جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں' اس طریقہ کار کو نیا علم حاصل کرنے اور بے حد پیچیدہ مسائل کو حل کرنے کا ''انجن'' سمجھنا چاہیے۔

سائنس نے ہماری دنیا کی ماہیت کے بارے میں جہالت کو بھی ختم کیا ہے۔

زمین، سورج، سیاروں، ستاروں، پودوں، جانوروں، انسانوں، امراض، ہوا، پانی، پہاڑوں، سمندروں، روشنی یا کائنات کے مبدا کے بارے میں ہم جو کچھ جانتے ہیں، وہ چند صدیاں پہلے کے کسی فرد کو اچنبھے میں ڈال سکتا ہے۔

کاریں، موٹریں اور دوسرے تمام مصنوعات تیار کرنے والے انجینئر ایسے ماہرین ہوتے ہیں جو مشینری کے معاملے میں مختلف قسم کے علت و معلول کے امور میں ماہر ہونا چاہیے اور ماہر معاشیات کو زر، اشیاء اور خدمات کے شعبے میں علت و معلول کے رشتوں کا علم ہونا چاہیے۔ ایک اچھا ماہر نفسیات انسانی کردار میں علت و معلول کی اضافتوں سے باخبر ہوتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ جملہ علوم، اکثر پیشوں اور بزنس کے بڑے حصے کا جوہر اس قسم کے رشتوں کو دریافت کرنے کی کوشش ہے۔

اسباب تلاش کرنے کی مشکلات

علت و معلول کے رشتے کا تعین کرنا ہمیشہ سہل نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر اپنے آپ کو ایک ایسے قبیلے کا رکن تصور کیجئے جو کسی دور دراز علاقے میں آباد ہے اور جدید معاشرے میں دستیاب ہر قسم کی معلومات سے بے بہرہ ہے۔ ایک روز سورج گرہن رونما ہوتا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے دن کی روشنی دھندلا جاتی ہے اور کوئی بادل بھی دکھائی نہیں دیتا۔ ایسے میں یہی خدشہ پیدا ہوگا کہ کیا سورج ہمیشہ کے لیے غائب ہو رہا ہے؟ کیا قبیلے کو اب ہمیشہ کے لیے اندھیرے میں رہنا ہوگا اور بالآخر ٹھٹھر کر مرنا ہوگا؟

اب کیا ہوگا؟ قبیلے کے بزرگ اکٹھے ہوتے ہیں۔ وہ سوچتے ہیں کہ سورج کو کیا ہوگیا ہے۔ وہ کیوں دھندلا گیا ہے۔ سورج دیوتا قبیلے کی کسی غلطی پر اسے سزا تو نہیں دینے لگا! ایسے میں ایک بزرگ کہتا ہے کہ سورج دیوتا کو منانے کے لیے فوراً خاص قربانیوں اور ایک تقریب کا اہتمام کیا جائے۔ سب لوگ اس تجویز پر عمل کرتے ہیں۔ لیجئے، تقریب ابھی جاری تھی کہ سورج دیوتا خوش ہوگیا۔ اس نے دوبارہ سورج کو روشن کر دیا۔ چاروں طرف روشنی ہوگئی۔

گویا قبیلے کے دانا بزرگ نے دھندلاتے ہوئے سورج کی صحیح وجہ دریافت کر لی اور یوں اپنے قبیلے کو تباہی سے بچا لیا۔ لہٰذا لوگ یہی سمجھیں گے کہ آئندہ جب کبھی گرہن

شروع ہوتو ہم سب کو اسی آزمائے ہوئے طریقے کے مطابق عمل کرنا چاہیے۔اصل میں اس طریقہ کار میں ناکامی کا کوئی خدشہ نہیں' کیونکہ زمین پر ہمارا ردِعمل چاہے کچھ بھی ہو' گرہن بہرطور ختم ہوجاتا ہے۔روشنی پھر سے پھیل جاتی ہے۔

قبیلے میں سے اگر کسی شخص کو شک وشبہ ہوتو اب وہ دور ہوجاتا ہے۔سب لوگ سورج دیوتا کے وجود کے قائل ہوجاتے ہیں۔ظاہر ہے کہ سورج دیوتا کے وجود کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوسکتا ہے کہ جب اسے خوش کرنے کی کوشش کی گئی تو وہ مان گیا اوراس کی روشنی پھر سے دنیا کو منور کرنے لگی۔اس طریقے سے گویا قبیلے نے ایسے چند''حقائق'' معلوم کر لیے جو اس کے نزدیک قطعی طور پر درست ہیں۔تاہم درحقیقت یہ حقائق غلط ہیں اور فضول بھی۔مگر قبیلے کے افرد کو ان کے غلط ہونے کا یقین دلانا مشکل ہے کیونکہ اپنے تجربے سے انہیں ان حقائق کے درست ہونے کا یقین ہو چکا ہے۔

اب فرض کیجئے کہ قبیلے کا کوئی شخص سورج دیوتا کو خوش کرنے کی اس رسم کو فضول قرار دیتا ہے اور لوگوں سے کہتا ہے کہ ایسی کوئی رسم ادا نہ کی جائے تو بھی سورج لوٹ آتا ہے۔اچھا اب سوال یہ ہے کہ اگر آپ اس کے دلائل سے قدرے متاثر ہوجائیں تو بھی کیا دوبارہ کبھی سورج گہن کے موقع پر آپ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا پسند کریں گے؟ کیا آپ وہ تدبیر نہیں آزمائیں گے جو پہلے کامیاب ثابت ہو چکی ہے؟ غالباً دل ہی دل میں آپ دوبارہ وہی تدبیر کرنا چاہیں گے۔

زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ قبیلے والے اس انکار کرنے والے کی مذمت کریں گے اور کہیں گے کہ اس نے طاقتور سورج دیوتا کی توہین اور اسے ناراض کر کے سب کے لیے خطرات پیدا کر دیئے ہیں اور سورج گرہن کے وقت بلا کو ٹالنے کی کامیاب رسم کی راہ میں رکاوٹ پیدا کر دی ہے۔یہ بھی ہوسکتا ہے کہ قبیلے والے ناراض ہوکر اس منکر کو سخت سزا دیں' اسے قبیلے سے نکال دیں یا شاید اسے قتل ہی کر دیں۔

یوں ہم دیکھتے ہیں کہ واضح اور سادہ نظر آنے والے حالات میں بھی اسباب کا تعین آسان نہیں ہوتا۔حالات جس قدر زیادہ پیچیدہ ہوں' مشاہدہ میں آنے والے اثرات کے اسباب کا تعین اتنا ہی زیادہ مشکل ہوجاتا ہے۔

اس کے باوجود کسی بھی شعبے میں ترقی کے لیے اسباب وعلل کی جستجو بے حد اہم

ہوتی ہے۔ اس جستجو کے کامیاب ہونے کی صورت میں ہمیں اثرات و نتائج پر اثر انداز ہونے یا انہیں قابو میں کرنے کی قوت حاصل ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر جب لوئی پاسچر نے یہ بات دریافت کی کہ دنبل کی بیماری جراثیم کی وجہ سے ہوتی ہے تو پھر اس کی دریافت سے فوراً ہی یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ دوسرے امراض کا سبب بھی جراثیم ہو سکتے ہیں۔ اس طرح جراثیم کی تحقیق کی راہ کھل گئی۔ یوں گزشتہ صدی میں بہت سی بیماریوں سے بچاؤ اور علاج کے طریقے دریافت ہوئے اور انسانوں کی اوسط عمر دوگنی ہو گئی۔

اب عالم یہ ہے کہ جراثیم سے محفوظ رہنے کے لیے ہم ہاتھ دھوتے ہیں۔ کلورین کے ذریعے پانی کو جراثیم سے پاک کیا جاتا ہے۔ سرجری سے پہلے نرسیں مریض کو جلد کو صاف کرنے کے لیے جراثیم کش ادویات استعمال کرتی ہیں۔ آپریشن رومز کو بے حد صاف ستھرا رکھا جاتا ہے۔ کئی قسم کی جراثیم کش دوائیں تیار ہو چکی ہیں اور انہیں عام طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

جب ممتاز ریاضی دان اور ماہرِ طبیعات نیوٹن نے زمین کے مدار میں چاند کی حرکت کی بنیادی علت کشش ثقل کو قرار دیا تو پھر زمینی سیارچوں اور سیاروں کے مداروں کا حساب لگانا اور مزین کی کشش سے نکل کر مدار میں داخل ہونے کے قابل راکٹ تیار کرنے کا امکان بھی پیدا ہو گیا۔

نیوٹن کا نظریہ کشش ثقل مختلف خلائی منصوبوں کے ذریعے بھی درست ثابت ہو چکا ہے۔ نیوٹن کے قوانین پر عمل کرنے سے نتائج کی درست طور پر پیش گوئی کی جا سکتی ہے اور ان پیش گوئیوں کی تصدیق بھی کی جا سکتی ہے۔

سائنس دان نیوٹن کے قوانین حرکت اور کشش ثقل کو قطعی طور پر درست تسلیم کرتے رہے ہیں۔ اس کے باوجود ۱۹۰۵ء میں ممتاز سائنس دان آئن سٹائن نے علت و معلوم کی ایک عمیق اضافت کا تصور پیش کیا جو بعد ازاں نظریہ اضافیت کے نام سے مشہور ہوا۔ اس نظریے نے زمان و مکان اور حرکت سے متعلق نیوٹن کے تصورات بدل دیئے۔ ماہرین فلکیات سیاروں اور سیارچوں کے مداروں کا حساب لگانے کے لیے آج بھی نیوٹن کے قوانین ہی استعمال کرتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ نیوٹن اور آئن سٹائن کے نظریوں کے حوالے سے حساب لگانے پر جو فرق پیدا ہوتا ہے، وہ ناقابلِ مشاہدہ حد تک کم ہوتا ہے۔

البتہ جب معاملہ عطارد کا ہو تو پھر اس قسم کے فرق کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں رہتا۔ عطارد وہ سیارہ ہے جو نظامِ شمسی کے دیگر تمام سیاروں کے مقابلے میں زیادہ رفتار سے سورج کے گرد گھومتا ہے۔ البتہ جب ہم اجرام فلکی سے توجہ ہٹا کر نیوکلیئر تعاملات میں چھوٹے ذروں کی سرعت رفتار کی طرف رخ کرتے ہیں تو پھر نیوٹن کے قوانے حرکت اضافیت کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔

سارا علم اصلاح پذیری کے اس طریقے سے پھولتا پھلتا ہے۔ حقائق اور علت و معلول کے رشتے جب ایک بار پیش کر دیئے جائیں تو شاذ و نادر ہی انہیں مکمل طور پر کبھی رد کیا جات اہے۔ اس کے بجائے نئے حالات کے تقاضوں کے مطابق ان میں کانٹ چھانٹ ہوتی رہتی ہے۔ جب سائنس دان علم کے ایسے نئے خطے دریافت کرتے ہیں جو پہلے محققین کو معلم نہیں ہوتے' تو اکثر اوقات وہ دیکھتے ہیں کہ نئے حالات اور تقاضے ایسے نئے مشاہدات کا سبب بنتے ہیں' جو نئے نظریوں اور علت و معلول کے نئے رشتوں کی طرف لے جاتے ہیں۔ سائنس کی طرح زندگی کے تمام امور میں بھی یہی صورت حال پیش آتی ہے۔ اس کتاب میں آپ کو زندگی کی اس اہم حقیقت کی مثالیں جا بجا ملیں گی۔

استدلال کا عمل

کوئی نابینا شخص کار میں بیٹھا ہو' اس کی بیوی کار چلا رہی ہو تو کیا وہ جان سکتا ہے کہ بیگم صاحبہ غلط سمت میں کار چلا رہی ہیں؟ اگر وہ جان لیتا ہے تو ہم پوچھیں گے کہ ایسا کیونکر ہوا۔

آیئے ہم ایک مثال لیں۔ آرتھر ماس نابینا ہیں۔ ایک سہ پہر کو وہ کار میں کہیں جا رہے تھے اور ان کی بیوی' الین' ڈرائیو کر رہی تھیں۔ دونوں شمال میں واقع رج ٹاؤن جا رہے تھے۔ راستے میں ایک چوراہے پر الین صاحبہ کو اشارہ سمجھنے میں غلطی ہوئی اور انہوں نے شمال کے بجائے جنوب کی طرف سفر شروع کر دیا۔ چند منٹوں کے بعد ماس کو اپنے دائیں بازو پر دھوپ کا احساس ہوا۔ چنانچہ انہوں نے فوراً اپنی بیوی کو ٹوکا کہ وہ غلط سمت میں جا رہی ہیں۔ بیگم صاحبہ کہاں ماننے والی تھیں۔ آخر یہ اندھا شوہر ان کی رہنمائی کیسے کر سکتا ہے؟ لیکن نو دس میل آگے جانے کے بعد انہیں غلطی کا احساس ہو گیا۔ چنانچہ الین نے گاڑی موڑی اور مخالف سمت میں روانہ ہو گئیں۔

ماس صاحب کو غلطی کا احساس کس طرح ہوا؟ آیئے ہم دیکھیں کہ مشاہدے میں آنے والے اور حافظے میں محفوظ حقائق کی مدد سے صحیح نتیجے تک پہنچنے میں ان کا استدلال کن کن مراحل سے گزرا۔

(۱) ماس صاحب کار میں دائیں ہاتھ کی اگلی نشست پر بیٹھے تھے۔
(۲) ماضی کے تجربے سے انہیں معلوم تھا کہ جب دھوپ ان کے جسم پر پڑتی ہے تو ہو گرم ہو جاتا ہے۔ چونکہ اب ان کا دایاں کندھا گرم ہو گیا تھا' لہٰذا انھوں نے سوچا کہ دھوپ کار کے دائیں حصے پر پڑ رہی ہے۔
(۳) یہ واقعہ سہ پہر کے وقت پیش آیا تھا۔ گویا ان پر سورج زیادہ تر مغرب کی طرف سے چمک رہا تھا۔
(۴) کار کو شمال کی طرف رخ ٹاؤن کی طرف جانا تھا۔

یہ بات دو امکانات پیش کرتی ہے یعنی (۱) جنوب کی طرف رخ اور (۲) شمال کی طرف رخ۔ ان دونوں میں سے کون سی صورت حال مذکورہ بالا حقائق سے ہم آہنگ ہے؟ پہلے دونوں میں سے کون سی صورت حال مذکورہ بالا حقائق سے ہم آہنگ ہے۔ پہلے دوسری صورت حال یعنی شمال کی طرف رخ پر نگاہ ڈالیے۔ اس صورت میں ماس کا بازو کار کے مشرقی رخ پر ہوگا اور دھوپ اس کے دائیں بازو تک پہنچ پائے گی کیونکہ کار یا خود ماس کا جسم راہ میں حائل ہوگا۔ چونکہ یہ صورتِ حال اس واقعہ کے خلاف ہے کہ ماس کو اپنے دائیں بازو پر دھوپ کا احساس ہوا تھا' اس لیے ہم اسے نظر انداز کر سکتے ہیں۔ گویا کار پہلے سے طے شدہ شمال کی جانب نہیں جا رہی تھی۔

اس کے برخلاف پہلی صورت حال حقائق سے مطابقت رکھتی ہے۔ کار چونکہ جنوب کے رخ جا رہی تھی اس لیے ماس پر بائیں جانب سے دھوپ پڑتی ہے اور وہ اس کی گرمی محسوس کرتے ہیں۔ چونکہ یہ معاملہ ایسا تھا کہ دو میں سے ایک امکان کو درست ہونا ہی تھا (یعنی یہ کہ کار یا تو شمال کو جا رہی تھی یا پھر جنوب کو) اس لیے ماس کے لیے یہ نتیجہ اخذ کرنا ممکن ہو گیا کہ بیگم صاحبہ کار کو غلط سمت میں لیے جا رہی ہیں۔

کیا ماس صاحب کا استدلال غلط ہو سکتا تھا؟ کسی حقیقی صورتِ حال میں لوگوں کو اس امر کا یقین کبھی کبھار ہی ہوتا ہے کہ تمام ضروری حقائق قابلِ حصول ہیں۔ مثال کے طور پر فرض کیجیے کہ کسی ستم ظریف نے حرارت دینے والا لیمپ کار کے دائیں حصے میں رکھ دیا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ماس صاحب کسی خاص بیماری کا شکار ہوں جس کے سبب وہ دائیں کندھے کو گرم محسوس کرنے لگے ہوں۔ اس قسم کے غیر معمولی حالات شاذ و نادر ہی پیش

آتے ہیں لہٰذا اگر ہم کسی غیر معمولی واقعہ کا امکان نظر انداز کر دیں تو پھر ماس صاحب نے جو نتیجہ اخذ کیا تھا (یعنی یہ کہ کار غلط سمت میں جا رہی ہے) وہ بیان شدہ حقائق سے منطقی طور پر اخذ ہوا تھا۔

ایک لحاظ سے تمام آنکھوں والے بھی دنیا میں رونما ہونے والے اکثر واقعات کے معاملے میں ''اندھے'' ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہم ایٹم کو' کشش ثقل کو اور بجلی کو نہیں دیکھ سکتے۔ ہم ماضی کے واقعات کو نہیں دیکھ سکتے۔

اس طرح دور دراز رونما ہونے والے واقعات بھی ہم دیکھ نہیں پاتے۔ تاہم' ماس صاحب کی طرح ہم بھی غیر مرئی اشیاء یا واقعات کے بارے میں حقائق دریافت کر سکتے ہیں۔

استدلال میں تضادات کا استعمال

ماس صاحب اس درست نتیجے تک پہنچے تھے کہ ان کی بیگم صاحبہ کار کو غلط سمت میں لیے جا رہی تھیں۔ اس درست نتیجے تک پہنچنے کی وجہ یہ ہے کہ ماس کے مشاہدات پر مبنی منطقی استدلال ایک تضاد کی طرف لیے جا رہا تھا۔ یہاں تضاد کا مطلب ایسا بیان یا نتیجہ ہے جو کسی اور بیان یا نتیجے کی تردید کرتا ہو یا اس کی مخالف سمت میں رہنمائی کرتا ہو۔

تضاد ایک چیختا ہوا اشارہ دیتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ''رک جایئے''۔ اگر دو ''حقائق'' یا نتائج ایک دوسرے سے متضاد ہوں تو وہ دونوں درست نہیں ہو سکتے۔ ان مین سے ایک ضرور غلط ہو گا۔ یہ استدلال کا بنیادی اصول ہے۔ یہ ہمیں حقائق یا بیانات کو پرکھنے میں مدد دیتا ہے۔

آیئے ہم ماس اور ان کی شریکِ حیات کے قصے سے دوبارہ رجوع کرتے ہیں۔ ماس نے جب اپنی بیوی کو ٹوکا تو بیگم صاحبہ کو یقین نہ آیا تھا کہ ان کا نابینا شوہر راستے کے انتخاب میں ان کی غلطی کی نشاندہی کر سکتا ہے۔ اس لیے وہ غلط راستے پر نو میل تک موٹر چلاتی گئیں۔ اس کے بعد انہیں غلطی کا احساس ہوا کیونکہ انہیں ایسے حقائق دکھائی دیئے جو ان کے فیصلے کو غلط ظاہر کر رہے تھے۔ شاید راستہ بہت طویل ہو گیا تھا یا پھر مناظر نامانوس ہونے لگے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ انہیں راستے پر کوئی ایسا روڈ سائن نظر آیا ہو جس سے یہ ظاہر

ہوا کہ وہ جنوب کی طرف جا رہی تھیں۔ بہرطور اس قسم کے تضادات نے بیگم ماس کو آخر کار یقین دلا دیا کہ انہوں نے راستے کا انتخاب غلط کیا ہے۔ تب ہی انہوں نے اپنے شوہر کی بات کو درست تسلیم کیا اور گاڑی کا رُخ پیچھے کی طرف کیا۔

تضادات کو تلاش کر کے کسی شے کو غلط ثابت کرنے کا عمل استدلال کا ایک اہم طریقہ کار ہے۔ مثلاً جب کوئی وکیل عدالت میں مخالف گواہ پر جرح کرتا ہے تو اس کا بڑا مقصد یہ ہوتا ہے کہ مخالف گواہ کی شہادت میں سے تضادات کو اجاگر کرے۔ جب کوئی گواہ کسی تضاد کی وضاحت کرنے میں ناکام رہتا ہے تو پھر اس کے بیان پر اعتماد کم ہو جاتا ہے۔

جواں سال وکیل کی حیثیت سے امریکی ہیرو ابراہم لنکن کے بارے میں ایک قصہ مشہور ہے جس سے عدالتی مقدمات میں تضادات کے استعمال کی بخوبی وضاحت ہوتی ہے۔ لنکن ایک ایسے شخص کا مقدمہ لڑ رہا تھا جس پر ایک باڑے سے گھوڑا چوری کرنے کا الزام لگایا گیا تھا۔ ایک گواہ نے یہ بیان دیا کہ اس نے ملزم کو رات کے وقت باڑے سے گھوڑا لے جاتے دیکھا تھا۔ لنکن نے گواہ سے پوچھا کہ اس نے رات کے اندھیرے میں اس شخص کو کیسے پہچان لیا تھا۔ گواہ نے جواب دیا کہ اس وقت چاند کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اس پر لنکن نے کیلنڈر دکھایا جس کے مطابق وقوعہ کی رات چاند نہ نکلا تھا۔ اس تضاد نے گواہ کی شہادت کی نفی کر دی اور لنکن کے موکل کو بے گناہ قرار دے دیا گیا۔

کوئی اکاؤنٹنٹ کسی بزنس کے مالی ریکارڈ کے اعداد و شمار کے عمومی صحت کو فروخت، فرد، خریداری، تنخواہ اور دوسرے امور کے اندراجات کے درمیان تضاد تلاش کر کے پرکھ سکتا ہے۔ گویا ریکارڈ اس وقت درست ہوتا ہے جب اس کے جملہ اندراجات میں ہم آہنگی ہو۔ ان کے درمیان کوئی تضاد نہ ہو۔ اگر ان میں تضادات پائے جاتے ہوں تو پھر ریکارڈ کی اچھی طرح چھان بین کی ضرورت ہوتی ہے۔

بعض حقائق بالکل واضح دکھائی دیتے ہیں، لیکن ان کا درست ہونا لازم نہیں۔ بعض ''حقائق'' ایسے ہیں کہ جن کے متعلق ہماری رائے یہ ہوتی ہے کہ ہم انہیں جانتے ہیں۔ وہ غالباً درست ہو سکتے ہیں۔ جب کہ بعض دوسرے ''حقائق'' غلط ہوتے ہیں۔ کھلے ذہن کا شخص تضادات کا زیادہ احتیاط سے جائزہ لیتا ہے۔ اس طرح وہ ''حقائق'' میں سے

زیادہ غلطیاں دریافت کرسکتا ہے اور درست نتائج تک پہنچ سکتا ہے۔ اس کتاب میں جا بجا استدلال کی مثالیں ملیں گی اور ہم دیکھیں گے کہ منطقی استدلال میں تضادات کی نشاندہی کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔

موجود حقائق سے استدلال

آیئے ہم مندرجہ ذیل مسئلہ دیکھیں:

سکورجن خاندان کے بچوں کے نام ٹم، میری اور سڈ ہیں۔ سڈ، میری سے دو سال بڑا ہے اور میری حال ہی میں پہلی جماعت میں داخل ہوئی ہے۔ ٹم سب سے چھوٹا بچہ ہے۔ اس کی عمر اپنے بھائی سڈ سے آدھی ہے۔

ان معلومات سے منطقی استدلال کے ذریعے مندرجہ ذیل سوالات کے جواب دیجئے۔ یہ بھی دیکھئے کہ آپ کے نزدیک آپ کے جوابات کس حد تک درست ہیں۔ کیا آپ کو اپنے جابات کے درست ہونے کا مکمل یقین ہے یا وہ درست یا غلط ہو سکتے ہیں سوالات یہ ہیں:

(۱) سکورجن خاندان میں کتنے بچے ہیں؟

(۲) ان میں سے لڑکے کتنے ہیں اور لڑکیاں کتنی؟

(۳) ہر بچے کی عمر کیا ہے؟

(۴) کیا ٹم باتیں کرتا ہے؟

(۵) سڈ کیا پانچویں جماعت میں پڑھتا ہے؟

(۶) کیا دونوں بھائی، سڈ اور ٹم، اچھی طرح بیس بال کھیل سکتے ہیں؟

اپنے جواب تلاش کرنے کے بعد ان کی جانچ مندرجہ ذیل استدلال سے کریں:

(۱) بچے کتنے ہیں؟ مندرجہ بالا عبارت میں یہ بات براہ راست نہیں بتائی گئی۔ لیکن آپ کو تمام بچوں کے نام بتائے گئے ہیں یعنی ٹم، میری اور سڈ۔ یہ نام گن کر یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ سکورجن خاندان میں بچوں کی تعداد تین ہے۔ یہ جواب گنتی سے حاصل ہوا ہے اور ممکنہ حد تک یقینی ہے۔

(۲) لڑکے کتنے ہیں؟ لڑکیاں کتنی ہیں؟ اس سوال کا جواب ہم ناموں کی

مدد سے حاصل کر سکتے ہیں۔ یادداشت اور تجربے سے ہمیں معلوم ہے کہ ٹم اور سڈ لڑکوں کے نام ہوا کرتے ہیں جب کہ میری لڑکیوں کا نام ہے۔ لہٰذا دو لڑکے ہوئے اور ایک لڑکی۔ لیکن کیا ہمارے جوابات یقینی ہیں؟ شاید نہیں۔ ان میں سے شبے کی گنجائش موجود ہے۔ مثلاً بعض والدین اپنے بچوں کے ایسے نام رکھتے ہیں جو لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کے لیے استعمال کئے جا سکتے ہیں۔ سڈ (یعنی سڈنی) عموماً لڑکوں کا نام ہے' البتہ یہ مخفف لڑکیوں کے لیے بھی استعمال ہوسکتا ہے۔ یہاں تک کہ بعض لڑکیوں کا نام سڈنی بھی رکھا جاتا ہے۔

'میری' ایسا نام ہے جو صرف لڑکیوں سے مخصوص ہے۔ رہا ٹم تو غالباً یہ کسی ایک آدھ لڑکی کا نام بھی ہوسکتا ہے۔ گویا ہم پورے وثوق کے ساتھ یہ بات نہیں کہہ سکتے کہ سکور جن خاندان میں دو لڑکے ہیں اور ایک لڑکی۔ ان میں سے غالباً دو لڑکے ہیں اور ایک لڑکی۔ لیکن تھوڑا سا امکان اس امر کا بھی ہے کہ ان تین بچوں میں سے ایک لڑکا ہے اور دو لڑکیاں۔ اب اگر سکور جن خاندان کو غیر معمولی نام پسند ہوں تو یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ٹم' میری اور سڈ تینوں لڑکیاں ہوں۔

زندگی کے اکثر اندازوں کو حتمی کے بجائے امکانی طور پر بیان کرنا چاہیے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی حتمی فیصلے یا اندازے تک پہنچنے کے لیے جن حقائق کی ضرورت ہوتی ہے' ان میں سے بعض عموماً دستیاب نہیں ہوتے۔ ان کی غیر موجودگی میں جو اندازے لگائے جاتے ہیں' ان کو یقینی قرار دینا مشکل ہوتا ہے۔

ذرا ٹھہریئے۔ ابھی ہمیں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ خاندان کا سب سے چھوٹا بچہ اپنے بھائی سے آدھی عمر کا ہے۔ اس اطلاع میں ''بچہ'' اور ''بھائی'' دو ایسے الفاظ استعمال ہوئے ہین جو ہمیں بتاتے ہیں کہ سکور جن خاندان میں کم از کم دو لڑکے ہیں۔ اس سے ہمیں یہ پتہ چل جاتا ہے کہ سڈ لڑکے کا نام ہے۔ گویا خاندان میں دو لڑکے اور ایک لڑکی ہے۔

(۳) ہر بچے کی عمر کیا ہے؟ جو ہمیں صاف طور پر بتایا گیا ہے وہ یہ ہے کہ میری پہلی جماعت میں پڑھتی ہے۔ پہلی جماعت کے بچے کی عمر عموماً چھ برس ہوتی ہے۔ خیر میری کی عمر سات کے قریب بھی ہوسکتی ہے۔ سڈ اس سے دو سال بڑا ہے۔ گویا اس کی عمر آٹھ سال کے لگ بھگ ہے۔ شاید وہ نو سال کا ہونے والا ہے۔

معلومات فراہم کرنے والی عبارت میں یہ درج ہے کہ سب سے چھوٹے بچے کی عمر بڑے بھائی سے آدھی ہے۔ گویا ٹم کی عمر ساڑھے چار برس ہونی چاہیے۔

یہ جوابات خاصی حد تک درست معلوم ہوتے ہیں۔

(۴) کیا ٹم باتیں کرتا ہے؟ تجربے سے ہم جانتے ہیں کہ چار برس کی عمر کے بچے باتیں کرتے ہیں۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ ٹم گونگا بہرہ ہو یا ذہنی طور پر معذور ہو اور یوں اس نے ابھی بولنا نہ سیکھا ہو۔ چنانچہ ہم اس سوال کا جواب یوں دیں گے کہ زیادہ امکان اس امر کا ہے کہ ٹم باتیں کرتا ہے۔ تاہم یہ بھی ممکن ہے کہ وہ نہ بولتا ہو۔

(۵) سڈ کیا پانچویں جماعت میں پڑھتا ہے؟ غالباً نہیں۔ سڈ کی عمر اگر تقریباً آٹھ سال ہے تو اسے پانچویں کے بجائے اپنی عمر کے اکثر بچوں کی طرح تیسری جماعت میں ہونا چاہیے۔ ہاں اگر وہ غیر معمولی طور پر ذہین ہو تو اسے اگلی جماعتوں میں ترقی مل سکتی ہے۔ یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ میری کی عمر چھے برس سے زیادہ ہو۔ شاید سڈ کی عمر آتھ سال سے زیادہ ہو۔ تب یہ امکان بہر طور رہتا ہے کہ وہ پانچویں جماعت میں ہو۔

(۶) کیا دونوں بھائی اچھی طرح بیس بال کھیل سکتے ہیں؟ تجربہ ہمیں بتاتا ہے کہ یہ بات ناممکن سی دکھائی دیتی ہے کہ چار سالہ ٹم بیس بال کا اچھا کھلاڑی ہو۔ سڈ کا معاملہ ے ہے کہ اس کی عمر آتھ سال یا قدرے زیادہ ہے۔ اسکے بارے میں ہم یقین سے نہین کہہ سکتے۔ ہمیں اس کے بارے میں اتنی کم معلومات دی گئی ہیں کہ یہ نتیجہ اخذ کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ آیا وہ بیس بال اچھی طرح کھیل سکتا ہے یا نہیں۔ اس سوال کا جواب دینے کی خاطر ہم کو سکورجن خاندان سے متعلق مزید معلومات حاصل کرنی ہوں گی۔ فرض کیجئے کہ یہ خاندان ایسی جگہ رہتا ہے جہاں آٹھ برس کی عمر کے اکثر لڑکے بیس بال کھیلتے ہیں تو پھر ہم اس سوال کا جواب ''غالباً ہاں'' میں دے سکتے ہیں۔ لیکن اگر خاندان ایسی جگہ رہتا ہے جہاں عام طور پر بیس بال نہیں کھیلا جاتا تو پھر ہمارا جواب ''غالباً نہیں'' میں ہونا چاہیے۔

یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ ''اچھا کھیل'' سے کیا مراد ہے۔ جب تک ہم سڈ کو بیس بال کھیلتے نہ دیکھیں اور اسی طرح دوسروں کا کھیل نہ دیکھیں، ہم اس بارے میں کوئی رائے قائم نہیں کر سکتے اور بیس بال کھیل سکنے کے بارے میں سڈ کی اہلیت کا اندازہ حقائق کے

بجائے شخصی رائے پر قائم رہے گا۔ اس قسم کی آرا لوگ اپنے ماضی کے تجربات اور کھیل کے بارے میں اپنے تصورات کی بنیاد پر قائم کرتے ہیں۔

خیر، مختصر بات یہ ہے کہ بیس بال میں سڈ کی مہارت کا فیصلہ کرنے کے لیے ہمارے پاس معلومات موجود نہیں ہیں۔ لہٰذا اس سوال کا جواب بے معنی ہوگا۔ گویا ہمیں کوئی جواب تلاش کرنا ہی نہیں چاہیے۔ بس یہ کہہ دینا کافی ہے کہ ''ہمیں معلوم نہیں''۔

یہ بات پیشِ نظر رکھیے کہ سکورجن خاندان کے بارے میں حاصل شدہ معلومات سے ہم منطقی استدلال کے ذریعے نئی معلومات حاصل کر سکتے تھے۔ یہ معلومات ہم نے حاصل کیں اور اس طرح ہم پہلے دو سوالات کے یقینی جواب دینے کے قابل ہوئے۔

تاہم حافظے میں محفوظ حقائق سے مدد حاصل کیے بغیر محض منطقی استدلال کے بل بوتے پر ہم تیسرے، چوتھے اور پانچویں سوال کا جواب نہ دے سکتے تھے۔ اس لیے ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ آیا ان کا اطلاق زیرِ غور امور پر ہوتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ ہم یہ کہیں گے کہ ہمارے جواب یقینی نہ سہی ان کے درست ہونے کا کافی امکان موجود ہے۔

زندگی میں استدلال کے جو مواقع پیدا ہوتے ہیں، وہ عموماً اسی قسم کے ہوتے ہیں۔ ہمارے اخذ کردہ نتائج کا دارومدار بڑی حد تک ان مفروجات پر ہوتا ہے جن سے ہم غور وفکر شروع کرتے ہیں۔ اکثر حالات میں یہ مفروضات درست نہیں ہوتے یا پھر حقائق کی تعبیر غلط کی جاتی ہے۔ اس سے فیصلے بھی غلط ہو جاتے ہیں۔ ''بارش کا ۵۰ فی صد امکان ہے'' اس بارے میں ازابیل کا تصور غلط ہے۔ یہی حال اس کے شوہر ہیری کا ہے۔ چنانچہ بارش کے امکان کے بارے میں وہ دونوں غلط اندازے قائم کرتے ہیں۔

سائنس دانوں کو خوب معلوم ہوتا ہے کہ جو حقائق جمع کیے جا رہے ہیں، ان میں غلطی کا امکان موجود ہے۔ لہٰذا وہ اپنے تجربات کے لیے پیمائش کے معاملے میں غلطی کی گنجائش کو نظر انداز نہیں کرتے۔

رائے عامہ کا جائزہ لینے والے ماہرین بھی اپنے نتائج مرتب کرتے ہوئے غیر یقینی عوام کے لیے گنجائش چھوڑ دیتے ہیں۔ امریکہ میں اس قسم کے جائزوں کا بہت رواج ہے۔ خاص طور پر صدارتی انتخابات کے موقع پر اس قسم کے جائزے کثرت سے لیے جاتے ہیں۔ امریکہ کے صدارتی انتخابات میں تقریباً پانچ کروڑ افراد اپنی رائے دیتے

ہیں۔لیکن رائے عامہ کا جائزہ لینے والے ماہرین بلاتوقف ہزار دو ہزار افراد کو نمونے کے طور پر چن لیتے ہیں اور ان کی رائے لے کر رائے عامہ کا قومی جائزہ مرتب کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس صورتِ حال میں کوئی شخص بھی بات یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ ان چند لوگوں کی رائے پوری امریکی قوم کے فیصلے کی نشاندہی کرتی ہے۔اس کے باوجود رائے عامہ کے اس قسم کے جائزے عوام کے عمومی رجحان کی کامیابی سے نشاندہی کرتے ہیں۔

جائزے میں اگر کسی امیدوار کو ۳۸ فی صد ووٹ ملتے ہیں تو جائزہ لینے والے یہ واضح کر دیتے ہیں کہ اس میں ۴ فی صد تک ردوبدل کی گنجائش موجود ہے۔گویا جائزہ لینے والوں کے نزدیک اس امیدوار کو انتخابات میں ۳۸+ ۴ یعنی زیادہ سے زیادہ ۴۲ فی صد اور ۳۸۔۴ یعنی کم از کم ۳۴ فی صد تک ووٹ حاصل ہو سکیں گے۔اس سے خود جائزہ لینے والے کو یقین ہوتا ہے کہ صحیح عدد ۳۴ اور ۴۲ فی صد کے درمیان ہوگا۔(رائے عامہ کے جائزوں کے موضوع پر ہم نے دسویں باب میں بھی بحث کی ہے)

منطقی استدلال میں استعمال ہونے والے الفاظ

منطق صحیح استدلال کی سائنس کا نام ہے۔تاہم روزمرہ کی زندگی میں ہم ''منطقی'' سے مراد ''صحیح استدلال'' لیتے ہیں اور اس کا مفصل جائزہ لینے کی کوئی کوشش نہیں کرتے۔لوگ تجربے کی بنا پر منطقی استدلال سیکھ لیتے ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ ننھے بچوں کے مشاہدے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں استدلال کی پیدائشی صلاحیت ہوتی ہے جو تجربے کے ساتھ تیزی سے فروغ پاتی ہے۔

استدلال کے نتائج کو بیان کرنے کے لئے کئی الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔مثلاً نتیجہ' استخراج' انتاج' اندازہ اور فیصلہ جیسے الفاظ اس کے لیے عام طور پر استعمال کئے جاتے ہیں۔روزمرہ کی زندگی میں یہ الفاظ ایک ہی مفہوم میں استعمال ہوتے ہیں' تاہم درحقیقت ان کے معانی میں تھوڑا بہت فرق موجود ہے۔

نتیجہ سے مراد استدلال کے عمل کا انجام ہے۔جب کہ منطق میں استخراج کا لفظ مفروضوں یا حقائق سے استدلال کے ذریعے کسی نتیجے تک پہنچنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ انتاج کا مطلب بھی منطقی عمل کے ذریعے کسی نتیجے تک پہنچنا ہے۔''اندازہ'' کا لفظ اس

وقت استعمال ہوتا ہے جب حقائق پیچیدہ ہوں اور ان کا احتیاط سے جائزہ لیا جائے۔ اندازہ کی طرح ' فیصلہ' بھی پیچیدہ حقائق کے حوالے سے استعمال کیا جاتا ہے۔

ہم کلیے کیسے بناتے ہیں

صرف حواس کے ذریعے ہم دنیا کا براہِ راست علم حاصل کر سکتے ہیں۔ گویا دنیا کا براہِ راست علم ہمیں صرف دیکھنے' سننے' چھونے' سونگھنے اور چکھنے کے ذریعے ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ ان حواس سے حاصل شدہ معلومات یادداشت کی حیثیت سے ہمارے دماغوں میں محفوظ ہو جاتی ہیں یا پھر انہیں کتابوں اور کمپیوٹروں میں محفوظ کرایا جاتا ہے۔ بعد ازاں ضرورت پڑنے پر ہم یہ معلومات اپنے حافظے سے' کتب یا کمپیوٹرز سے حاصل کرتے ہیں اور انہیں حساب کتاب میں یا نظریہ سازی میں بروئے کار لاتے ہیں۔ آیئے یہاں ہم ایک سادہ صورتِ حال کے ذریعے اس امر کی وضاحت کریں کہ حواس سے حاصل شدہ علم سے استدلال کے ذریعے نئی معلومات کس طرح حاصل ہوتی ہیں:

واقعہ ۱۔ میری گلی کا مکان ''الف'' سفید رنگ کا ہے۔

واقعہ ۲۔ میری گلی کا مکان ''ب'' سفید رنگ کا ہے۔

واقعہ ۳۔ میری گلی کے تمام مکان سفید رنگ کے ہیں۔

واقعہ ۴۔ میرے ہمسایہ میں تمام مکان سفید رنگ کے ہیں۔

کیا ان چار حقائق سے یہ نتیجہ اخذ کرنا درست ہوگا کہ تمام مکان سفید رنگ کے ہیں؟ مذکورہ صورتِ حال میں ایک گلی اور ہمسایہ مکانوں کے بارے میں حقائق جمع کئے گئے تھے اور یہ دیکھا گیا تھا کہ تمام مکان سفید رنگ کے ہیں۔ یہ مشاہدات اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ قصبے کا ہر مکان سفید رنگ کا ہے۔ ان حقائق سے بعض لوگ یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ ''تمام مکانات' چاہے وہ کہیں بھی ہوں' سفید رن کے ہوتے ہیں۔''

اس قسم کے بیان کو ''کلیہ'' یا ''تعمیم'' کہا جاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہیئے کہ ہم کسی بات کو اس لیے عمومی طور پر درست سمجھ لیتے ہیں کہ ہم کو انفرادی صورتوں میں اس کی سچاء کی بتہ سی مثالیں نظر آتی ہیں۔ اگر ہم کسی شہر میں ایک ہزار سفید مکان دیکھنے کے

بعد یہ نتیجہ اخذ کر لیتے ہیں کہ دنیا میں ہر جگہ مکان سفید رنگ کے ہوتے ہیں تو ممکن ہے کہ اس شہر کے کسی کونے میں ہمیں پیلا گھر نظر آ جائے ۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ایک ہزار تو کیا لاکھوں سفید رنگ کے مکانات دیکھ کر بھی ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ دنیا میں کوئی مکان ایسا نہیں جس کا رنگ سفید نہ ہو۔ کیونکہ ممکن ہے کہ دوسرے ہی شہر میں ہمیں کوئی پیلا یا نیلا مکان مل جائے ۔ گویا جو عمومی نتائج ہم اخذ کرتے ہیں ۔ ان کا بڑی حد تک دارومدار اس امر پر ہے کہ جن مثالوں سے نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے وہ غیر جانبداری سے منتخب کی جائیں اور وہ نمائندہ حیثیت کی حامل بھی ہوں ۔

استقرائی استدلال

بہت سی انفرادی مثالوں سے کوئی عمومی نتیجہ اخذ کرنے کے طریقہ استدلال کو ''استقرا'' کا نام دیا جاتا ہے ۔ یہ امر پیشِ نظر رکھیے کہ جب بہت سی انفرادی مثالوں سے استقرائی طریقہ کے ذریعے کوئی عمومی نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے تو ہم اس کے صحیح ہونے کے بارے میں پر یقین اسی وقت ہو سکتے ہیں جب اس نوع کی تمام مثالوں کا مشاہدہ کر لیا جائے ۔ جب اس کی بعض مثالیں مشاہدہ میں نہ آئیں تو ہم اس کے درست ہونے کا صرف امکان ہی ظاہر کر سکتے ہیں ۔ گویا اگر ہم نے بہت سے ملکوں میں سے بہت سے مکانوں کا مشاہدہ کیا ہو اور ان سب کو سفید رنگ کا پایا ہو تو پھر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ غالب امکان اس امر کا ہے کہ تمام مکان سفید ہوتے ہیں ۔

بسا اوقات ہم کو کسی عمومی واقعہ کی سچائی کا پورا یقین ہوتا ہے ۔ فرض کیجئے کہ کامونکی کے قصبے میں ہمیں تمام مکان سفید نظر آتے ہیں ۔ تب ہم یقین کے ساتھ یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ کم از کم کامونکی کے قصبہ میں تمام مکان سفید رنگ کے ہیں ۔

تاہم اکثر عمومی بیانات چند مثالوں کے مشاہدے پر مبنی ہوتے ہیں ۔ اس صورت میں انہیں مکمل طور پر درست قرار دیا جا سکتا ۔ ان میں تھوڑا بہت ابہام ہوتا ہے ۔ ان میں ردو بدل ممکن ہوتا ہے بلکہ بعض نئے حقائق ان کی تردید کریں تو انہیں مسترد بھی کر دیا جاتا ہے ۔ لہٰذا ہمیں ایسی استثنائی مثالون پر حیران نہیں ہونا چاہیے جو نئی تعمیمات کا تقاضا کرتی ہوں یا پرانی تعمیمات میں تبدیلی پر مجبور کرتی ہوں ۔ تحقیقی عمل کے لیے اس قسم کی

استثنائی مثالیں اہم ہوتی ہیں کیونکہ اکثر اوقات وہ علم کے نئے خطوں کی طرف رہنمائی کرتی ہیں۔

مثال کے طور پر تابکاری کی پہلی دریافت ۱۸۹۶ء میں ایک فرانسیسی سائنس دان نے کی۔ اس نے دیکھا کہ فوٹوگرافک کاغذوں کے ایک پیکٹ پر رکھے ہوئے چند چھوٹے چھوٹے پتھر کاغذوں کو اس طرح نمایاں کر رہے تھے جیسے کسی طور پر ان تک روشنی پہنچ رہی ہو۔ بظاہر ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا کیونکہ ان کاغذوں کو ایک سیاہ کاغذ میں اچھی طرح لپیٹ کر رکھا گیا تھا تا کہ ان تک روشنی نہ پہنچ سکے۔ برسوں کا تجربہ بتاتا تھا کہ کاغذوں کو یوں لپیٹنے سے وہ روشنی سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔ لیکن اب تک استثنائی صورت سامنے آئی تھی۔ یہ تضاد کی ایک اور مثال ہے جو بالآخر ایک بڑی دریافت کا سبب بن گئی۔

میری اور پیئر کیوری نے ایک طے شدہ کلیئے کی اس استثنائی صورت پر تحقیق شروع کر دی اور انہوں نے فوٹوگرافک کاغذوں کے پیکٹ پر رکھے ہوئے پتھروں میں ایک جوہر یعنی ریڈیم کو دریافت کر لیا۔ چنانچہ ہم یوں کہیں گے کہ ایک عمومی حقیقت سے گریز کی ایک صورت کی جب تحقیق کی گئی تو تابکاری کو دریافت کر لیا گیا۔

تعمیمات الفاظ کے معانی جاننے کا بڑا وسیلہ ہیں۔ لفظ ''سیال'' کی مثال لیجئے۔ یہ لفظ بہت سی اشیاء کے لیے استعمال ہوتا ہے جن کا انڈیلا جا سکتا ہے۔ پانی' تیل' شراب' دودھ' جوس اور بہت سی دیگر اشیاء اس خصوصیت کی حامل ہیں۔ ان کو قابو میں رکھنے کے لیے بوتل' ڈبہ' کپ یا کسی اور برتن کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر برتن کے پیندے میں سوراخ ہو تو سیال شے اس سے ٹپکنے لگتی ہے۔ لکڑی' لوہا' پتھر' شیشہ' تانبہ اور دیگر ٹھوس اشیاء کی حالت اس سے مختلف ہے۔ نارمل درجہ حرارت پر تمام ٹھوس چیزوں کی حالت یکساں رہتی ہے۔ بچے اس قسم کے مشاہدات کو ٹھوس اور مائع اشیاء کی ماہیت کے بارے میں عمومی تصورات اخذ کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ پھر ایک قسم کے پیدائشی منطقی استخراجی عمل کے ذریعے' جس کا انہیں احساس نہیں ہوتا' وہ اپنی تعمیمات کا اطلاق منفرد صورت حالوں پر کرنے لگتے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ گلاس سے دودھ گرانا بند کر دیتے ہیں۔

جب ایک ہی قسم کے واقعہ کے بہت سے تجربوں میں ہم دیکھتے ہیں کہ ایک جیسی باتیں رونما ہوتی ہیں تو پھر استقرا کے ذریعے ہم ایک تعمیم یا عمومی کلیہ مرتب کر لیتے ہیں۔

مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ گیند کو اچھالا جائے تو وہ زمین پر جا گرتی ہے۔ سکے کو اچھالا جائے تو وہ بھی زمین پر جا گرتا ہے۔ گویا ہم دیکھتے ہیں کہ جب کسی شے کو اچھالا جائے تو وہ آخر کار زمین پر جا گرتی ہے۔ اس قسم کے تجربات و مشاہدات کی بنا پر عرصہ دراز پہلے انسانوں نے ایک کلیہ وضع کر لیا تھا اور وہ یہ تھا کہ جب کسی چیز کو اچھالا جائے تو وہ زمین پر جا گرتی ہے۔ اس کلیئے کو ایک حقیقت کے طور پر قبول کیا جاتا ہے۔

لیکن کسی دن ایسا ہوتا ہے کہ کوئی واقعہ اچانک اس طے شدہ حقیقت کی نفی کر دیتا ہے۔ مثلاً ہم کسی جادوگر کے کرتب دیکھنے جاتے ہیں اور کیا دیکھتے ہیں کہ اس نے ایک ہاتھ اوپر اٹھا کر سیب پھینکا۔ لیکن وہ زمین پر گرنے کے بجائے اوپر کو اٹھنے لگتا ہے۔ ہمیں تعجب ہوتا ہے۔ اس کم بخت سیب کو کیا ہو گیا ہے؟ جادوگر سیب کے ساتھ کیا کر رہا ہے؟ شاید اس نے باریک سا دھاگا باندھ رکھا ہے جو ہمیں نظر نہیں آ رہا۔

فرض کیجئے کہ سیب کی جگہ ہیلیم گیس سے بھرا ہوا غبارہ کسی کے ہاتھ میں ہو۔ اگر وہ غبارہ چھوڑ دے تو وہ نیچے گرنے کے بجائے اوپر کو اٹھنے لگتا ہے۔ گویا ہم نے چیزوں کے گرنے کے بارے میں جو کلیہ بنا رکھا تھا' اب اس میں تبدیلی کی ضرورت محسوس ہونے لگتی ہے۔ شاید ہم یوں کہیں گے کہ:

(۱) اشیاء (ماسوائے ہیلیم گیس سے بھرے ہوئے غبارہ کے) کو اوپر سے چھوڑا جائے تو وہ نیچے جا گرتی ہیں۔ یا شاید ہم اپنے کلیئے کو مندرجہ ذیل صورت دیں گے۔

(۲) اشیاء کو اوپر سے چھوڑا جائے تو وہ عموماً نیچے جا گرتی ہیں۔

بہت سی تعمیمات کو لوگ مکمل طور پر درست خیال کرتے ہیں۔ لیکن جب غور سے تجزیہ کیا جائے تو کئی اہم استثنائی صورتیں سامنے آ جاتی ہیں۔ یہاں ہم ایک ایسی تعمیم کو مثال کے طور پر پیش کرتے ہیں جس کو لوگ اس لیے بھی مکمل طور پر درست سمجھتے ہیں کہ وہ بظاہر ایک تعریف دکھائی دیتی ہے۔ وہ تعمیم یہ ہے کہ ''ایک دن میں چوبیس گھنٹے ہوتے ہیں''۔ اچھا آیئے اس سلسلے میں ہم سائنس دانوں سے رجوع کریں۔ وہ یہ بات دریافت کر چکے ہیں کہ زمین کی محوری گردش بتدریج آہستہ ہوتی جا رہی ہے۔ اس لیے ان کے پاس یہ سوچنے کا جواز موجود ہے کہ مستقبل میں ایسا وقت بھی آئے گا جب دن کا دورانیہ

چوبیس گھنٹوں سے بہت بڑھ جائے گا۔ آثار متحجرہ سے ملنے والی شہادت کی بنا پر کہا جاتا ہے کہ لاکھوں کروڑوں سال پہلے دن موجودہ دنوں سے کئی گھنٹے چھوٹے ہوتے تھے۔

خیر، یہاں ہم یہ یاد دلانا چاہتے ہیں کہ جن تعمیمات کو ہم طے شدہ کلیہ کے طور پر قبول کر لیتے ہیں، ان میں بھی استثنائی صورتیں ہوا کرتی ہیں۔ اس امر سے آگاہی اہم ہے۔ بصورت دیگر نتائج تک پہنچنے میں غلطیاں سرزد ہوتی رہیں گی۔

استخراجی استدلال

استقرائی استدلال مشاہدات پر مبنی ہوتا ہے۔ اس کے برعکس استخراجی ایسے بیانات پر (جن کو منطق کی زبان میں ''مقدمات'' کہتے ہیں) مبنی ہوتا ہے جو درست ہو سکتے ہیں اور غلط بھی۔ یہ بیانات مفروضے بھی ہو سکتے ہیں۔ ان کے علاوہ خالص قیاسی بیانات یا کسی قسم کے ریاضیاتی بیانات بھی یہ کام دے سکتے ہیں۔

ذیل میں ہم استخراجی استدلال کی ایک سادہ صورت کی مثال درج کر رہے ہیں۔ اس کو قیاس کا عنوان دیا جاتا ہے۔

مقدمہ اول: چڑیا ایک پرندہ ہے۔

مقدمہ اول: پرندہ ایسے جانور کو کہتے ہیں جس کے بازو اور پر ہوتے ہیں۔

نتیجہ: لہٰذا چڑیا ایک ایسا جانور ہے جس کے بازو اور پر ہیں۔

پہلے دونوں بیانات یا مقدمات ایسی معلومات مہیا کرتی ہیں جن سے منطقی نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے۔ ان مقدمات سے ہم ایک تیسرا بیان اخذ کرتے ہیں جس کو نتیجہ کہا جاتا ہے۔ جو گویا منطقی عمل کا ثمر ہوتا ہے۔ یہ نتیجہ مکمل طور پر کوئی نئی اطلاع بھی مہیا کر سکتا ہے۔ مثال کے طور پر ہو سکتا ہے کہ ہم نے کبھی چڑیا کو نہ دیکھا ہو اور یہ بھی نہ جانتے ہوں ہوں کہ چڑیاں کے بازو اور پر ہوتے ہیں۔ لیکن جب ہمیں یہ بتا دیا جاتا ہے کہ چڑیا ایک پرندے کا نام ہے اور یہ کہ پرندوں کے بازو اور پر ہوتے ہیں تو کسی چڑیا کو دیکھے بغیر ہی ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ اس کے بازو ہوتے ہیں اور پر بھی۔

صوری منطق

قدیم یونان کے فلسفیوں نے دو ہزار برس سے زیادہ عرصہ پہلے منطقی استدلال کا

تجزیہ شروع کیا تھا۔ انہوں نے دیکھا کہ انسان کی فکری سرگرمیوں میں اس استدلال کو کئی طریقوں سے بروئے کار لایا جا سکتا ہے۔ صدیوں کے دوران درست استدلال کے بنیادی اصولوں کو ''صوری منطق'' کی صورت میں بیان کیا جاتا رہا ہے۔ یہ علم اب بھی کئی کالجوں میں پڑھایا جاتا ہے۔ اس کتاب کا مقصد یہ نہیں کہ ان اصولوں کو یہاں تفصیل سے درج کر دیا جائے۔ یہاں ہم اس قسم کے تجزیوں کی عمومی سمت کی طرف بس اشارہ ہی کریں گے۔

چڑیا کے بارے میں قیاس دو مقدمات سے شروع ہوا تھا۔ ان میں سے ایک کو ہم بڑا مقدمہ کہہ سکتے ہیں۔ (یعنی یہ کہ ''پرندہ ایسے جانور کو کہتے ہیں جس کے بازو اور پر ہوتے ہیں'') دوسرے مقدمہ کو ہم چھوٹا مقدمہ قرار دیں گے (یعنی یہ کہ ''چڑیا ایک پرندہ ہے۔''۔) نتیجہ کی صورت میں ہم ان دونوں سے نئی معلومات حاصل کرتے ہیں۔

صوری منطق میں جب اشیاء کی مختلف اقسام زیرِ بحث آتی ہیں (جیسے چڑیاں' پرندے' بازو اور پروں والے جانور) تو ان کی نشاندہی الف ب ج جیسے حروف سے کی جاتی ہے۔ پھر استدلال کا تجزیہ ایسے طریقے سے کیا جاتا ہے جیسے الجبرے میں اعداد یا انواع کی نمائندگی کے لیے حروف استعمال ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ صوری منطق میں استدلال افعال کے تجزیئے کے لیے ایک قسم کے الجبرے کو مرتب کیا گیا ہے۔ اس کی وضاحت مندرجہ مثال سے ہوسکتی ہے۔

چھوٹا مقدمہ: (چڑیا) (ایک پرندہ) ہے۔

الف ب ہے۔

بڑا مقدمہ: (پرندہ) ایسے جانور کو کہتے ہیں۔

ب ج

(جس کے بازو اور پر ہوتے ہیں)

نتیجہ: لہٰذا (چڑیا) (ایک ایسا جانور ہے جس کے بازو اور پر) ہیں۔

دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ اگر الف' ب ہے۔ اور ب' ج ہے تو پھر الف کو لازماً ج ہونا چاہیے۔ یہ بات نوٹ کیجئے کہ نتیجے سے ب غائب ہوگیا ہے۔ بس الف اور ج رہ گئے ہیں۔ استخراجی استدلال کے ذریعے نتیجہ یہ نکلا ہے کہ الف اور ج ایک دوسرے

سے متعلق ہیں۔اس قیاس کو اس طرح پیش کیا جا سکتا ہے۔

الف ب ہے

ب ج ہے۔

لہٰذا الف......ج......ہے۔

یہ بیان کہ ''پرندہ ایک ایسا جانور ہوتا ہے جس کے بازو اور پر ہوتے ہیں۔'' کسی استثنا کے بغیر تمام پرندوں کے بارے میں اطلاع ہے۔ یہ مشاہدوں اور ''پرندوں'' کی تعریف پر مبنی ایک تعمیم ہے جو استدلال کے استقرائی طریقہ کار کو استعمال کر کے حاصل کی گئی ہے۔

قیاس ہم کو تعمیمات کا بہت سی انفرادی صورتوں پر اطلاق کرنے کے قابل بناتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر ہم جانتے ہیں کہ ''چیزوں کو پھینکا جائے تو وہ زمین پر جا گرتی ہیں''۔تو پھر استخراجی استدلال کے ذریعے ہم اس تعمیم کا اس امر کی پیش گوئی کے لیے اطلاق کر سکتے ہیں کہ اگر کسی پتھر' جوتے' گیند یا کسی اور شے کو پھینکا جائے تو وہ زمین پر جا گریں گی۔ چونکہ ہمارے ذہن اس قسم کے استخراجی عمل کو بہت تیزی سے مکمل کر لیتے ہیں۔اس لیے ہمیں یہ سب کچھ بہت آسان اور سادہ لگتا ہے۔ تاہم یہ استدلالی عمل کا بنیادی جزو ہے۔

ریاضی بنیادی طور پر استخراجی نوعیت کی حامل ہے۔البتہ تعریفات اور بدیہات پر مشتمل چند بنیادی مقدمات کے بارے میں یہ بات نہیں کہی جا سکتی کیونکہ ان کو درست فرض کیا جاتا ہے اور وہ اس شے کی بنیاد بناتے ہیں جس کو ہم ریاضی کا نام دیتے ہیں۔ان بنیادی مقدمات میں سے استخراجی استدلال کے ذریعے ایسے نتائج اخذ کئے جاتے ہیں۔ جو نئی معلومات دیتے ہیں۔ ہم اس عمل کا تجزیہ الجبرا اور علم ہندسہ میں کرتے ہیں جن میں قبول شدہ چند بدیہات اور تعریفات سے ریاضی کا بہت سا علم مرتب کیا جاتا ہے۔

غیر اقلیدسی علمی ہندسہ کی نشوونما میں ریاضی میں استخراجی استدلال کی قوت کی ایک تعجب انگیز مثال ملتی ہے۔قدیم یونان کے مشہور ریاضی دان اقلیدس نے جو علم ہندسہ مرتب کیا تھا' اس کا ایک غیر ثابت شدہ بدیہی اصول یہ ہے کہ ''متوازی خطوط کبھی باہم نہیں ملتے''۔ بظاہر یہ اصول درست دکھائی دیتا ہے کیونکہ روزمرہ کی زندگی میں ہم متوازی

خطوط کو کبھی آپس میں ملتے ہوئے نہیں دیکھتے۔

انیسویں صدی کے پہلے عشرے میں کئی ریاضی دانوں نے اس بدیہی اصول کی سچائی یہ فرض کر کے ثابت کرنا چاہی کہ متوازی خطوط آپس میں مل جاتے ہیں۔ یوں اس ''کاذب'' بدیہی اصول کی اساس پر انہوں نے منطقی طور پر ایک نیا علم ہندسہ مرتب کیا۔ ان کو امید تھی کہ اس عمل کے دوران انہیں کوئی ایسا تضاد مل جائے گا جو ان کے کاذب' بدیہی اصول کو غلط ثابت کر دے گا۔ گویا اس طرح انہیں اس امر کا منطقی ثبوت حاصل ہو جائے گا کہ متوازی خطوط آپس میں نہیں ملا کرتے۔

تاہم حیرت کی بات یہ ہے کہ اس قسم کی کوئی تضاد ریاضی دانوں کے ہاتھ نہ لگ سکا۔ اس کے بجائے ایک نیا ''غیر اقلیدسی علم ہندسہ'' معرض وجود میں آ گیا جو اس ظاہری لغویت پر مبنی ہے کہ متوازی خطوط باہم مل جاتے ہیں۔ خیر' یہ فرض کیا گیا کہ یہ غلط قسم کا علم ہندسہ ہے کیونکہ وہ حقیقی دنیا سے مطابقت نہیں رکھتا۔ پھر آخر اس کا فائدہ ہی کیا ہے؟

جب البرٹ آئن سٹائن اپنے عمومی نظریہ اضافیت میں زمان ومکان کے بارے میں تصورات پر کام کر رہا تھا تو اس نے دیکھا کہ غیر اقلیدسی علم ہندسہ سے اس کی مدد حاصل ہو سکتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج بھی روزمرہ کی زندگی میں ہم اقلیدسی علم ہندسہ سے ہی کام لیتے ہیں جس میں متوازی خطوط کبھی نہیں ملتے۔ جب کہ پیچیدہ مسائل حل کرنے کی کوشش کرنے والے سائنس دان (جیسے مثلاً کائنات کی ابتداء یا ایٹمی پارٹیکلز کی بہت تیز رفتار جیسے موضوع پر غور وفکر کرنے والے سائنس دان) غیر اقلیدسی علم ہندسہ سے کام لیتے ہیں۔

کیا تمام استخراجات درست ہوتے ہیں؟

ہر قسم کے سوچ بچار کے لیے استخراجی استدلال ناگزیر ہے۔ تاہم اس کا یہ مطلب نہیں کہ حقیقی دنیا سے متعلق اس قسم کے استدلال سے ہم جو نتائج اخذ کرتے ہیں' وہ لازمی طور پر درست ہوتے ہیں۔ مثال کے لیے مندرجہ ذیل قیاس پر توجہ کیجئے:

مقدمہ اول: مرزا خاندان حال ہی میں رائے ونڈ سے آ کر یہاں آباد ہوا ہے۔

مقدمہ دوم: رائے ونڈ کے لوگ بہت دلیر ہوتے ہیں۔

نتیجہ: مرزا خاندان والے بہت دلیر ہیں۔

اس قیاس میں منطق بالکل ٹھیک ہے، لیکن کیا نتیجہ بھی درست ہے؟ مرزا خاندان کے افراد کیا واقعی بہت دلیر ہیں؟ یہ بات اس وقت درست ہوسکتی تھی کہ جب ہم رائے ونڈ کے تمام لوگوں کے بارے میں جانتے کہ وہ بہت دلیر ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے تو گویا مقدمہ نمبر دو میں کوئی سنگین قسم کی خامی موجود ہے۔ یہ امکان بھی کم ہے کہ رائے ونڈ کے تمام نہیں تو اکثر لوگ بہت دلیر ہوں گے۔ وجہ یہ ہے کہ لوگوں کی بہت مختلف قسم کی انفرادی خصوصیات ہوا کرتی ہیں۔

یہ بھی ہے کہ ہر معاشرے میں دلیری کے اپنے اپنے تصورات ہوتے ہیں۔ ایک جگہ کے رہنے والے لوگ اپنے آپ کو دلیر خیال کر سکتے ہیں جب کہ کسی دوسری جگہ کے لوگوں کی رائے ان کے بارے میں مختلف ہوسکتی ہے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ ''دلیر''۔ ''اچھا''۔ ''برا''۔ ''نیک'' اور ''بد'' جیسے الفاظ اصل میں موضوعی اصلاحات ہیں، ان کے کوئی طے شدہ معانی ایسے نہیں ہیں جو مختلف معاشروں، ثقافتوں یا مذہبوں سے تعلق رکھنے والوں کو قابلِ قبول ہوں۔ جو شے ہمارے کلچر میں کسی شخص کو ''بہادر'' قرار دینے کا سبب بنتی ہے، ممکن ہے کہ کسی دوسرے کلچر میں وہ بزدلی کی وجہ سمجھی جائے۔ خیر، ہم اپنی مثال کی طرف واپس چلتے ہیں۔ اس مثال میں منطقی طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا گیا تھا کہ مرزا خاندان کے افراد بہت دلیر ہیں۔ بعض لوگوں کے نزدیک یہ نتیجہ درست ہوسکتا ہے جب کہ بعض دوسرے لوگ اس کو متعصّب رائے قرار دیں گے۔ اس قسم کا متعصّبانہ استدلال دنیا بھر میں فساد کا ایک بڑا وسیلہ ہے۔ ہم اس اہم موضوع پر نویں باب میں بحث کریں گے۔

روزمرہ کا استدلال

اکثر و بیشتر استدلال استقرائی اور استخراجی سلسلون پر مبنی ہوتا ہے۔ ہم استقرائی استدلال کے ذریعے عمومی حقائق کا علم حاصل کرتے ہیں اور پھر استخراجی استدلال کے ذریعے ان کا اطلاق نئی صورتِ حال پر کرتے ہیں۔ حافظے کے بغیر ہم مستقبل میں استعمال کے لیے حقائق کو اپنے ذہن میں محفوظ نہیں رکھ سکتے ہیں۔ ذہن کی ایک اور

بنیادی اہلیت کو ہم ''تخلیقی تخیل'' یا غالباً ''وجدان'' کا نام دے سکتے ہیں۔ سبھی کو ایسے لمحات کا کوئی نہ کوئی تجربہ ہوتا ہے جب کسی مسئلے کا حل یکا یک، گویا غیب سے۔ ذہن میں آ جاتا ہے۔

ذیل میں ہم حقیقی زندگی کا ایک مسئلہ درج کرتے ہیں یا دیکھتے ہیں کہ اس کو حل کرنے کے لیے ذہن پہ مختلف بنیادی صلاحیتیں کس طرح مل جل کر کام کرتی ہیں۔

بادل رفتہ رفتہ گہرے ہو رہے تھے۔ پھر بارش ہونے لگی۔ امجد کمرے میں صوفے پر بیٹھ کر کتاب پڑھ رہا تھا۔ اندھیرا پھیل جانے پر وہ اٹھا اور روشنی کے لیے بجلی کا بٹن دبایا۔ لیکن روشنی نہ ہوئی۔

اس نے سوچا بلب جل گیا ہوگا۔ چنانچہ اس نے الماری سے نیا بلب نکالا اور پرانے کی جگہ لگا دیا۔ روشنی پھر بھی نہ ہوئی۔

امجد پریشان ہوا۔ پہلے اس کے ساتھ کبھی ایسا نہ ہوا تھا۔ ماضی میں جب کبھی بلب خراب ہوتا وہ اتار کر نیا بلب لگا دیتا۔ یوں مسئلہ حل ہو جاتا۔ اب اس نے تخلیقی انداز میں سوچنا شروع کیا کہ روشنی کے لیے اس کو کیا کرنا چاہیے۔

اس کو ایک خیال سوجھا۔ ممکن ہے کہ پلگ نکل گیا ہو۔ اس نے باہر جھانکا۔ پلگ اپنی جگہ قائم تھا۔ پھر بھی امجد نے باہر نکل کر اسے دبایا۔ لیمپ پھر بھی نہ جلا۔

اب کیا کیا جائے؟ ضرور بجلی کی تاروں میں کوئی گڑ بڑ ہے۔'' اپنے اس مفروضہ (جو ایک معقول مفروضہ ہے اور بعض حقائق یا تجربے پر مبنی ہے) کو پرکھنے کے لیے اس نے کمرے کے دوسرے بلب جلانے کی کوشش کی۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی نہ جلا۔

''ہوں! تو یہ معاملہ'' اس نے سوچا۔ ''لوڈ شیڈنگ کی مصیبت ہے'' اس نے لیمپ کا سوئچ آن کیے رکھا تاکہ اس کو بجلی کی رو بحال ہونے کا علم ہو جائے۔

آدھ گھنٹے تک بجلی نہ آنے پر وہ پریشان ہو گیا۔ کیا واقعی لوڈ شیڈنگ ہو رہی ہے؟ یہ جاننے کے لیے اس نے اپنے ہمسایہ کو فون کیا۔ اس کو یہ جان کر تعجب ہوا کہ ہمسایہ میں بجلی آ رہی ہے۔ گویا لوڈ شیڈنگ نہیں ہو رہی تھی۔

''شاید سرکٹ بریکر میں کوئی نقص ہے''۔ یہ سوچ کر وہ سرکٹ بریکر کی طرف بڑھا اور واقعی اس کا سوئچ ڈاؤن تھا۔ بجلی کیسے آتی۔ اس نے سوئچ آن کیا۔ واپس کمرے

میں آیا تو وہ روشنی سے جگمگا رہا تھا۔

شام کو ابا میاں گھر آئے تو امجد نے منطقی استدلال سے متعلق اپنا یہ کارنامہ بڑے فخر سے انہیں سنایا۔ ابا میاں نے اسے شاباش دی، مگر پھر سوچنے لگے کہ سرکٹ بریکر میں یہ نقص کیونکر پیدا ہوا تھا؟

ابا بجلی کے بارے میں امجد سے زیادہ جانتے تھے۔ ان کو معلوم تھا کہ جب بجلی کا دباؤ تاروں کی اہلیت سے بڑھ جائے تو سرکٹ بریکر کا سوئچ آف ہو جاتا ہے۔ ابا کو پریشانی یہ تھی کہ کمرے میں کسی جگہ اب بھی کوئی نقص ہوسکتا ہے۔ شاید تاروں میں کوئی خرابی ہے اور کسی جگہ وہ چھو رہی ہیں۔ اس سے کوئی شرارہ پیدا ہوسکتا ہے۔ ممکن ہے کہ آگ ہی بھڑک اٹھے۔ لہٰذا نقص تلاش کر کے اسے دور کرنا بہت ضروری ہے۔ امجد اور ابا میاں دونوں کمرے میں ڈھیلی تاروں کا جائزہ لینے لگے۔ اتنے میں اماں کمرے میں داخل ہوئیں۔ انہوں نے پوچھا ''کیا ہو رہا ہے؟'' ابا نے ساری بات سنائی۔

اماں نے ایک پل توقف کیا۔ پھر بولیں ''شاید بجلی کا زیادہ دباؤ ہیٹر کے سبب ہوا جو میں کمرہ گرم کرنے کے لیے استعمال کر رہی تھی۔''

اس طرح مسئلہ حل ہو گیا۔ ہیٹر کو اتنی بجلی کی ضرورت تھی کہ اس کے سبب سرکٹ بریکر بند ہو گیا۔ بجلی کی لائنوں میں سرکٹ بریکر اور فیوز اس لیے استعمال کئے جاتے ہیں کہ دباؤ زیادہ ہونے پر وہ آگ سے بچانے کے لیے بجلی کی رو بند کر دیں۔

آپ نے دیکھا کہ مندرجہ صورت حال میں استقرائی اور استخراجی استدلال کس طرح یکجا ہوئے ہیں؟ استدلال کے تمام عناصر اس میں شامل تھے۔ تاہم وہ اس تیزی کے پیچھے دبے رہے جس تیزی کے ساتھ لوگ روزمرہ کے امور پر غور و فکر کرتے ہیں۔ مذکورہ مثال میں بجلی سے متعلق تعمیمات استقرائی استدلال پر مبنی تھیں جن کو جمیل، ابا اور ماں نے مسئلہ حل کرنے کے لیے استعمال کیا۔ انہوں نے ذاتی مشاہدوں، سنی سنائی باتوں، سکول میں دیئے جانے والے سبقوں اور کتابوں کے مطالعے سے بہت سے حقائق جمع کر رکھے تھے۔ یہ سارے حقائق انکے حافظوں میں موجود تھے۔ ضرورت پڑنے پر انہیں نکالا اور استعمال کیا جا سکتا تھا۔ دوسری طرف امجد نے جو تجربے کئے (مثلاً بلب بدلا یا دوسرے بلب ٹیسٹ کئے) ان میں استخراجی استدلال سے کام لیا گیا تھا۔ مثال کے طور پر اس کو یہ

معلوم تھا کہ اگر لیمپ تک جانے والے برقی تار میں کوئی نقص ہو جائے یا وہ ٹوٹ جائے تو پھر کرنٹ اس تک نہیں پہنچتا۔ یہ ایک تعمیم ہے۔ اس نے بعض دوسری باتوں کو بھی آزمایا۔ بلب فیوز ہو جائے تو الیکٹرک سرکٹ کٹ جاتا ہے اور بلب روشن نہیں ہوتا۔ لہٰذا اس نے بلب تبدیل کر دیا۔ جب اس سے کام نہ چلا تو اس نے ایک اور تدبیر کی' یہاں تک کہ اس کو بلب روشن نہ ہونے کا سبب معلوم ہو گیا۔

بلب روشن نہ ہونے کی یہ امکانی توجیہات مفروضے تھے۔ یعنی یہ معقول اندازے تھے کہ بلب روشن کیوں نہیں ہو رہا۔ ہر مفروضہ بلب کو روشن کرنے کا ایک طریقہ کار سامنے لاتا تھا۔ اسی لیے امجد نے پلگ کو دیکھا کہ کہیں نقص اس میں تو نہیں۔ کسی ممکنہ نقص کے پیشِ نظر اس نے پلگ کو زور سے دبایا۔ پھر اس نے اسی قسم کے تیز رفتار استخراجی استدلال کا اطلاق اس امکان پر کیا کہ آیا بجلی کی رو بند ہو گئی ہے۔ اس نے اس مفروضے پر بھی توجہ دی کہ سرکٹ بریکر زیادہ بوجھ کے سبب کام نہیں کر رہا۔

مسئلہ کا حل تلاش کرنے کے لیے امجد کے غور و فکر کا ایک اہم حصہ تخلیقی تخیل تھا۔ اس تخیل کے سب اس کے ذہن نے تیزی کے ساتھ مختلف خیالات پیدا کئے جو مسئلہ حل کرنے میں مددگار ثابت ہو سکتے تھے۔ اسی طرح اماں نے بھی تخلیقی تخیل سے کام لیا اور اس نتیجے پر پہنچیں کہ برقی مسئلہ ہیٹر کے جلنے کے سبب پیدا ہونے والے برقی رو پر دباؤ سے پیدا ہوا ہوگا۔

کسی کار کے نہ چلنے کا سبب تلاش کرتے ہوئے مستری بھی اسی قسم کے استدلالی عمل سے گزرتا ہے۔ کیا پیٹرول ختم ہو گیا ہے؟ کیا موٹر کا آتش زن نظام سپارک پلگز تو شرارے نہیں دے رہا ہے؟ کیا ڈسٹری بیوٹر گیلا ہے؟ کیا کاربیوریٹر کام کر رہا ہے۔ پٹرول کی نالی تو بند نہیں؟ کیا بیٹری چارج ہے؟ مستری کے ذہن میں جو تعمیمات سٹور ہوتی ہیں' ان کی مدد سے وہ کار کے نقص کے بارے میں کوئی مفروضہ بناتا ہے۔ پھر وہ کئی تدابیر آزماتا ہے تاکہ ایسے حقائق حاصل ہو سکیں جن سے کار کے خراب ہونے کا سبب اخذ کیا جا سکے۔ جب اس کو سبب کا علم ہو جاتا ہے تو پھر وہ کار کو درست کرنے کا طریقہ کار وضع کر سکتا ہے۔

اچھا یہ بتایئے کہ اکثر لوگ خراب موٹریں درست کیوں نہیں کر سکتے؟ اس کی وجہ

بالکل واضح ہے اور وہ یہ ہے کہ اکثر لوگوں نے کار کے طور طریقوں کے بارے میں ضروری تعمیمات نہیں سیکھی ہوتیں جو مستری کے سوچ بچار کی بنیاد بنتی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہیں گے کہ انہیں کار کے کام کرنے کے طریقوں کا علم نہیں ہوتا۔ لہٰذا وہ نقص تلاش کر سکتے ہیں اور نہ ہی اس کو دور کر سکتے ہیں۔ بنیادی امور کا علم نہ ہونے کے سبب وہ کوئی مفروضہ بنانے اور اس کو آزمانے کی پوزیشن میں بھی نہیں ہوتے۔

جب کسی مستری کا تجربہ زیادہ ہو جاتا ہے تو پھر اس کی سوچ کا عمل اکثر صورتوں میں کم و بیش خودکار ہو جاتا ہے۔ انجن پر ایک نظر ڈالتے ہی اس کو نقص کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ تاہم جب نقص غیر معمولی قسم کا ہو تو پھر اسے حل تلاش کرنے کے لیے اپنی تمام استدلالی مہارتوں کو تخلیقی انداز میں بروئے کار لانا پڑتا ہے۔

یہی حال ڈاکٹر کا ہے۔ وہ دیکھنے، سننے اور چھونے کی صلاحیتیں استعمال کر کے مریض کے مرض کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ پھر وہ مریض کو کوئی قسم کے ٹیسٹ کروانے کے لیے کہتا ہے اور مریض کی بعض علامتوں کو نوٹ کرتا ہے۔ ہر ڈاکٹر کے ذہن میں معلومات کا خزانہ ہوتا ہے جس سے وہ مرض کو جاننے میں مدد لیتا ہے۔

ڈاکٹر کی سوچ بچار اور استدلال کا عمل عموماً مرض کی تشخیص پر ختم ہوتا ہے، یعنی وہ مرض کی نوعیت کا تعین کر لیتا ہے۔ ڈاکٹر پھر دوبارہ اپنے ذہن میں محفوظ معلومات سے رجوع کرتا ہے اور اس مرض کو دور کرنے سے متعلق رہنمائی حاصل کرتا ہے۔

وجدان

کبھی کبھی یوں ہوتا ہے کہ کسی مشکل مسئلے کا کوئی حل اچانک ہمارے ذہن میں آ جاتا ہے، حالانکہ اس وقت ہم حل کی توقع بھی نہیں کر رہے ہوتے۔ اس قسم کی یکایک نمایاں ہونے والی بصیرتوں کو اکثر اوقات وجدان کا نام دیا جاتا ہے۔

وجدان کی ایک اہم مثال اٹھارہویں صدی کے اواخر میں سامنے آئی جب فریڈرک کیکول (۱۸۲۹ء۔۱۸۹۶ء) نامی ایک مشہور کیمسٹ نے اس امر کا تعین کرنا چاہا کہ بین زین نامی کیمیکل کمپاؤنڈ میں کاربن ایٹم کس طرح مرتب ہوتے ہیں۔ اس زمانے کے کیمیا دانوں کا خیال یہ تھا کہ بین زین کے ہر ذرے میں چھے کاربن ایٹم سیدھی لائن میں

زنجیر کی طرح ہوتے ہیں۔ تاہم اس تصور سے کمپاؤنڈ سے متعلق بعض حقائق کی پوری طرح توجیہ نہ ہوتی تھی۔

کیکول نے ایک رات خواب میں سانپ دیکھا۔ سانپ نے اچانک بل کھایا اور اپنی دم منہ میں لے لی۔ اس طرح ایک دائرہ بن گیا۔ یہ خواب دیکھتے ہی کیکول بستر سے اٹھا۔ اس کو اچانک محسوس ہوا کہ دائرہ بنانے والا سانپ بین زین میں چھ کاربن ایٹموں کی علامت ہے جو زنجیر کے بجائے دائرے کی صورت میں ایک دوسرے سے منضبط ہیں۔ کیکول نے جب اس تصور کو پرکھا تو وہ بالکل درست ثابت ہوا۔ اس طرح کیکول کیمسٹری کی دنیا میں ایک بڑی دریافت کر سکا۔ یعنی یہ کہ بعض سالمات زنجیر کے بجائے دائرے کی صورت میں منضبط ہوتے ہیں۔

جب کوئی شخص طویل عرصے تک کسی مسئلہ پر سوچ بچار جاری رکھتا ہے تو اس کو اس قسم کی وجدانی بصیرت کا تجربہ ہوسکتا ہے۔ تاہم یہ ضروری نہیں کہ وجدان کے ذریعے حاصل ہونے والے تصورات درست ہوں۔ اس قسم کے اکثر تصورات درست نہیں ہوتے۔ تاہم جب اس قسم کے تصورات بہترین معلومات رکھنے والے افراد کو حاصل ہوں تو وہ عموماً نئے علم کا سبب بن جاتے ہیں۔

مماثلتیں

استدلال کی اہم ترین صورتوں میں سے ایک ''مماثلت'' کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ ایک قسم کا منطقی استنباط ہے جو اس مفروضے پر مبنی ہے کہ اگر دو چیزیں کسی ایک حوالے سے مشابہ ہوں تو وہ دوسرے پہلوؤں سے بھی ایک دوسرے جیسی ہوسکتی ہیں۔ مناسب طور پر استعمال کرنے کی صورت میں یہ استدلال کی اہم صورت ہے۔ لیکن اس کو آسانی سے غلط انداز میں بھی بروئے کار لایا جاسکتا ہے۔ یوں کئی فکری مغالطے پیدا ہوتے ہیں۔

الفاظ کے معانی سیکھنے میں مماثلتیں ہمیں بہت زیادہ مدد دیتی ہیں۔ مثال کے طور پر ایک سال کا بچہ کھیت میں چار ٹانگوں والے ایک بڑے جانور کو دیکھتا ہے۔ اس کا لمبا سا سر ہے، بڑی بڑی آنکھیں ہیں، گردن پر بال ہیں، دم ہے اور ہنہنا رہا ہے۔ کوئی شخص کہتا ہے کہ ''یہ گھوڑا ہے''۔ چند روز بعد وہی بچہ چار ٹانگوں والا اسی جسامت کا ایک اور جانور

دیکھتا ہے۔ لیکن یہ نیا جانور موٹا ہے اور رنگت بھی مختلف ہے اور وہ کھیت میں دوڑنے کے بجائے چرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اس موقع پر کوئی شخص اس کو دیکھ کر کہتا ہے ''گائے''۔ اس کے بعد وہ بچہ جب کبھی ان دونوں جانوروں میں سے کسی ایک کو دیکھتا ہے تو ذہنی طور پر ان کی مشابہتوں اور فرق کا موازنہ کرتا ہے اور اپنے پچھلے علم کی بنا پر ''گھوڑا'' یا ''گائے'' کا لفظ ادا کرتا ہے۔

پھر کسی روز وہی بچہ بندر دیکھتا ہے جو بعض باتوں میں گھوڑے سے مشابہت رکھتا ہے۔ لہٰذا بندر دیکھتے ہی بچہ زور سے ''گھوڑا'' کہتا ہے۔ لیکن پاس پہنچتے ہوئے ڈیڈی اسے ٹوکتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بھئی یہ گھوڑا نہیں بندر ہے۔ اس قسم کے چند واقعات کے بعد بچہ گھوڑوں اور بندروں میں فرق کو اچھی طرح سمجھ لیتا ہے اور انہیں پہنچاننے لگتا ہے۔

جانداروں کو مختلف اقسام میں تقسیم کرتے ہوئے ماہرِ حیاتیات بھی اسی قسم کے استدلال سے گزرتا ہے۔ گھوڑوں، بندروں اور زرافوں میں کئی مشابہتیں موجود ہوتی ہیں۔ اس لیے ماہرِ حیاتیات ان کو ایک زمرے میں شامل کر دیتا ہے۔ گویا ایک حد تک مشابہتوں کی موجودگی ایک زمرے میں شامل کیے جانے کی بنیاد بن جاتی ہے۔

مشابہت کی اساس پر درجہ بندیاں ہم کو دنیا کے بارے میں اہم علم حاصل کرنے کے قابل بناتی ہیں۔ ماہرینِ حیاتیات اس حوالے سے جانداروں کی درجہ بندی کرتی ہیں۔ ماہرینِ ارضیات چٹانوں، پتھروں اور دوسری اشیاء کی درجہ بندی کرتے ہیں، جب کہ فلکیاتی امور کے ماہرین اسی بنیاد پر ستاروں کے درجے بناتے ہیں۔ روزمرہ کی زندگی میں ہم سب اسی بنیاد پر لوگوں کی مردوں، عورتوں، بچوں، درزیوں اور نانبائیوں وغیرہ میں درجہ بندی کرتے ہیں۔

یہ روزمرہ زندگی کا معاملہ ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ درجہ بندی ہمیں علم حاصل کرنے کے قابل بناتی ہے۔ مشابہت کی اساس پر استدلال کی ایک تخلیقی سطح کی مثال یہاں ہم پیش کرتے ہیں۔ نیوٹن نے جب سیب کو درخت سے زمین پر گرتے دیکھا تو اسے خیال آیا کہ جس قوت نے سیب کو درخت سے زمین کی طرف کھینچا تھا، وہی قوت چاند کو بھی زمین کی طرف کھینچ رہی ہوگی۔ یہ مشابہت نیوٹن کے نظریہ کششِ ثقل کا سبب بن گئی۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ اس نظریہ نے سائنس کی دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیا تھا۔

مثلاً بہتوں کی مدد سے ہمیں یہ دیکھنے میں مدد ملتی ہے کہ کون سی سیاسی اور سماجی پالیسیاں مسائل حل کرنے میں مددگار ثابت ہوسکتی ہیں۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ۱۹۸۴ء میں نیویارک سٹیٹ نے کار سواروں کے لیے سیٹ بیلٹس کا استعمال لازمی قرار دیا تھا۔ اس کے فوراً بعد سیٹ بیلٹس کا استعمال بہت بڑھ گیا اور کار کے حادثوں میں ہلاک ہونے والوں کی تعداد کم ہوگئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ امریکہ کی دوسری ریاستوں نے بھی اس قسم کا قانون بنانا شروع کر دیا۔ ان ریاستوں کے قانون سازوں نے مماثلت کی بنیاد پر اپنے موقف کا جواز پیش کیا۔ چنانچہ ان کا کہنا تھا کہ اگر سیٹ بیلٹ کے استعمال سے نیویارک میں قیمتی جانیں بچ سکتی ہیں تو دوسری ریاستوں میں بھی اس سے یہی فائدہ ہوگا۔ مزید برآں اگر نیویاک کے لوگ سیٹ بیلٹ استعمال کرنے کا قانون قبول کر سکتے ہیں تو دوسری ریاستوں کے عوام بھی اس کو قبول کر لیں گے۔

مماثلت کے استعمال کا ایک مقصد ایسی سمتوں میں فکر کی رہنمائی کرتا ہے جو مفید ثابت ہوسکتی ہوں۔ مماثلتوں سے مسائل کے امکانی حل سامنے آتے ہیں۔ مماثلتوں کو احتیاط سے استعمال کیا جائے تو وہ استدلال کے عمل میں بہت اہم طور پر معاون ثابت ہوتی ہیں۔

یہاں ہم آپ کو یہ بھی یاد دلاتے چلیں کہ تمام آلات مماثلتوں کو استعمال کر کے کام کرتے ہیں۔ گھڑی کو دیکھ لیجئے۔ وقت کا حساب کتاب گھڑی کی سوئیوں کی حرکت سے کیا جاتا ہے۔ سوئیوں کی محوری حرکت بذاتِ خود وقت نہیں ہوتی' لیکن اس کو وقت کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ عام قسم کے تھرمامیٹر میں پارہ ہوتا ہے اور تھرمامیٹر میں پارے کی حرکت سے درجہ حرات کا تعین کیا جاتا ہے۔ یہاں ہم نے گھڑی اور تھرمامیٹر کی مثال دی ہے۔ یہ بہت سادہ قسم کے آلات ہیں۔ آپ دوسرے آلات کو دیکھیں تو ان میں بھی مماثلت کا اصول کارفرما دکھائی دے گا۔

خیر' ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ مماثلتیں مفید ثابت ہوسکتی ہیں۔ تاہم ان کو احتیاط سے کام میں لانا ضروری ہے۔ احتیاط سے کام نہ لیا جائے تو وہ غلطیوں اور مغالطوں کا موجب بن جاتی ہیں۔ بہرحال یہ تو دنیا کی تمام چیزوں کے بارے میں درست ہے۔ کیونکہ کوئی چیز بھی ہو' اس کو احتیاط اور ہوش مندی سے استعمال نہ کیا جائے تو وہ نقصان دہ

ثابت ہوتی ہے۔ مناسب مماثلتیں بنانے کے لیے مختلف اشیاء کی ایک جیسی صفات کا احتیاط کے ساتھ انتخاب کرنا ضروری ہے۔ ڈولفن کو سمندر میں تیرتے ہوئے سرسری طور پر دیکھا جائے تو وہ ایک قسم کی مچھلی قرار پائے گی۔ تاہم سائنس دانوں نے ڈولفن کے جسمانی ڈھانچے کا زیادہ احتیاط کے ساتھ جائزہ لینے کے بعد اسے دودھ پلانے والا جانور قرار دیا ہے۔ وہ ڈولفن کو مچھلیوں کے مقابلے میں گھوڑوں اور گایوں سے قریب تر سمجھتے ہیں۔ خیر مماثلتوں کے گمراہ کن استعمال کو ہم چھٹے اور ساتویں باب میں زیادہ تفصیل کے ساتھ زیرِ بحث لائیں گے۔

اعلیٰ سطح پر منطقی انداز میں سوچنے کی انسانوں کی صلاحیت' مسائل کی صورت گری' مقدمات کی تشکیل اور نتائج اخذ کرنے کے لیے زبان کے استعمال کے بغیر ممکن نہیں ہوسکتی۔ لیکن زبان ایک بہت پیچیدہ معاملہ ہے' لہٰذا استدلال میں اس کے استعمال سے کئی مغالطے آسانی سے پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس لیے اگلے باب میں ہم زبان اور استدلال کے درمیان پائی جانے والی اہم اضافتوں پر توجہ دیں گے۔

زبان اور استدلال

امریکہ کے یوس مائٹ نیشنل پارک کے حکام نے ایک بار اعلان کیا کہ پارک کے شوگر پلم نامی ایک سیاہ ریچھ کو دیکھتے ہی گولی مارنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ یہ خبر اخبارات میں شائع ہوئی تو بہت سے لوگوں نے اس کے خلاف احتجاج کیا اور اخبارات میں خطوط شائع کروائے۔ بعض صاحبان نے ریچھ کو خود رکھنے کی پیشکش بھی کر دی۔

احتجاج کرنے والوں کو اس سیاہ ریچھ کی سرکشیوں کا کچھ علم نہ تھا۔ اور نہ ہی وہ جانتے تھے کہ اس نے پارک میں آنے والوں کے لیے کس قدر خطرہ پیدا کر رکھا ہے۔ اس خطرناک کالے ریچھ کا نام ''شوگر پلم'' دراصل طنزیہ انداز میں رکھا گیا تھا۔ لیکن لوگوں نے یہ سمجھا کہ یہ کوئی معصوم' بے ضرر اور پیارا سا ریچھ ہے جس کو پارک کے سنگدل حکام موت کی نیند سلانا چاہتے ہیں۔ اس کے بجائے اگر ریچھ کا نام ''خونخوار شیطان'' رکھا گیا ہوتا تو ممکن ہے لوگ اسے ٹھکانے لگانے کے فیصلے پر احتجاج نہ کرتے۔

آئندہ اس قسم کی غلط فہمی سے بچنے کے لیے پارک کے حکام نے ایک اہم فیصلہ کیا۔ انہوں نے طے کیا کہ وہ آئندہ ریچھوں کے نام نہ رکھا کریں گے۔ اس کے بجائے ہر ریچھ کا نمبر مقرر کیا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ ریچھ نمبر ۱۳ کو دیکھتے ہی گولی سے اڑانے کے فیصلے پر کون احتجاج کرے گا۔

نام میں کیا رکھا ہے؟

یہ واقعہ اس امر کی مثال ہے کہ نام، لوگوں کی مناسب فیصلہ کرنے کی صلاحیت پر گہرا اثر ڈالتے ہیں۔ کسی تاجر سے پوچھ لیجئے وہ آپ کو بتائے گا کہ مصنوعات کے نام اچھے ہوں تو ان کی فروخت بڑھانے میں بہت مدد ملتی ہے۔ اس سلسلے میں ایک امریکی کارساز ادارے کو چند سال پہلے تلخ تجربہ ہوا تھا۔ اس ادارے نے اپنے نئے ماڈل کی موٹر کا نام ''نووا'' رکھا اور جب فروخت کے لیے اسے جنوبی امریکہ بھیجا تو خریدار اسے منہ نہ لگاتے تھے۔ وجہ کیا تھی؟ وجہ یہ تھی کہ ہسپانوی زبان میں ''نووا'' کا مطلب ہے کہ ''یہ نہیں چلتی''۔ ظاہر ہے کہ اس موٹر کو خریدنا چاہے گا جس کا نام ہی یہ ہو کہ وہ نہیں چلتی۔

مارکیٹ کے امور پر نظر رکھنے والے جانتے ہیں کہ کسی پراڈکٹ کا نام اس کا خوشگوار تاثر قائم کرنے میں مدد دیتا ہے۔ یوں اس کی فروخت بڑھ جاتی ہے۔ اس لیے صنعت کار اور تاجر اپنی مصنوعات کے دلکش اور موزوں نام رکھنے پر توجہ دیتے ہیں۔

ماں باپ بچوں کو جو نام دیتے ہیں، وہ بچوں کی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ چنانچہ اگر کسی بچے کا نام عجیب، نامانوس اور عامیانہ ہو تو وہ بچے کے لیے بوجھ بن جاتا ہے۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ دوسرے بچے اس کا نام بگاڑ کر چھیڑنے لگتے ہیں۔

بیماریوں اور معذوریوں کے ناموں کا بھی یہی حال ہے۔ لفظ ''کوڑھ'' پر غور کیجئے۔ یہ ایک خوفناک مرض کا نام ہے۔ ماضی میں اس کے علاج کا طریقہ یہ تھا کہ اس مرض کا شکار ہونے والوں کو عام لوگوں سے الگ تھلگ کالونیوں میں رکھا جاتا تھا۔ آج کل اس مرض کے علاج میں بہت ترقی ہو چکی ہے اور اس کے اثرات میں پہلے جیسی شدت نہیں رہی۔ کوڑھ کے مریض کی قربت بھی خطرناک نہیں۔ لیکن اس مرض کے نام پر ماضی کا خوفناک دھبہ اب بھی موجود ہے۔

اس حوالے سے برازیل کے طبی حکام نے ''کوڑھ'' کا نام بدل دیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ نام بدلنے سے اس مرض سے متعلق لوگوں کو تعلیم دینے، حفاظتی اقدامات کی حوصلہ افزائی کرنے اور ماضی کے تجربے سے منسلک دہشت کو کم کرنے میں مدد ملے گی۔ ہندوستان میں عرصہ دراز سے اچھوتوں کے ساتھ وہی سلوک ہوتا رہا ہے جو کوڑھیوں کے

ساتھ کیا جاتا تھا۔ چنانچہ مہاتما گاندھی نے جب ان کے حالات بہتر بنانے پر توجہ دی تو ایک قدم یہ اٹھایا کہ انہیں ''ہریجن'' کا نام دیا۔آپ جانتے ہیں کہ اس لفظ کے معنی کیا ہیں۔اس کے معنی ہیں ''خدا کے بیٹے''۔ خیر' اسی طرح معذور بچوں کو اب ''خصوصی بچے'' کہا جاتا ہے۔

بعض پیشوں کے نام بھی تبدیل ہوئے ہیں۔ چنانچہ چپراسی کو اب ہمارے ہاں ''نائب قاصد'' کہا جاتا ہے۔ اسی طرح بعض جگہوں پر کلرک خود کو ''آفس اسسٹنٹ'' کہلوانا چاہتے ہیں اور کوڑا کرکٹ اٹھانے والوں کو ''عملہ صفائی'' کا نام دیا جانے لگا ہے۔ نام تبدیل کرنے کی یہ کوششیں اگر مضحکہ خیز محسوس ہوں تو ہمیں اپنے آپ سے اس کا سبب پوچھنا چاہیے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ چپراسیوں' کلرکوں اور ایسے ہی دوسرے پیشوں سے تعلق رکھنے والے افراد کے بارے میں ہماری رائے اچھی نہیں ہے۔ غالباً اس لیے ان پیشوں سے تعلق رکھنے والے لوگ اپنے پیشے کا نام بدلنا چاہتے ہیں۔

ان تبدیلیوں کا کیا کوئی جواز ہے؟ بات یہ ہے کہ ہم ساب جانتے ہیں کہ لوگ ہمارے پیشے کا احترام کریں۔ چنانچہ جن ملازمتوں اور پیشوں کا نام توہین آمیز ہو ان سے متعلقہ لوگ اس بات کو محسوس کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے ناموں میں تبدیلی میں کوئی حرج نہیں ہے۔

کسی زمانے میں امریکہ کے محکمہ دفاع کو ''محکمہ جنگ'' کہا جاتا تھا۔''جنگ'' کا لفظ جارحانہ قسم کا ہے جبکہ ''دفاع'' سے پر امن ارادے کا اشارہ ملتا ہے۔ ظاہر ہے کہ دفاع کی مخالفت کون کرسکتا ہے' جبکہ بہت سے لوگ جنگ کے مخالف ہوتے ہیں۔ اس لیے امریکیوں نے اپنے محکمے کا نام بدل لیا۔

جنگی کارروائیوں میں سے بھی بعض کے نام بدلے جا چکے ہیں۔ حملے کی صورت میں جب لوگ ہلاک ہوتے ہیں تو بسا اوقات رپورٹوں میں ان کے لیے ہلاک ہونے کے بجائے ''صفایا کر دیا گیا'' یا ''ختم کر دیا گیا'' کے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ یہ الفاظ کچھ اس قسم کا تاثر دیتے ہیں کہ ہلاک ہونے والے مخالفین انسان نہ ہوں' بلکہ کیڑے مکوڑے ہوں جن کا خاتمہ ہی اچھی بات ہے۔

حد یہ ہے کہ انتہائی تباہ کن ایٹمی میزائلوں کے نام بھی عام طور پر ایسے رکھے

جاتے ہیں جو خوشگوار تاثر دیں۔ ایم ایکس میزائل کی مثال ہی لیجئے۔ یہ میزائل دس شہروں کو تباہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اس کا نام ''پیش میکر'' یعنی ''امن قائم کرنے والا'' رکھا گیا ہے۔ گویا نام رکھنے والے صاحبان کے نزدیک امن اور بربادی میں کوئی فرق نہیں ہے۔ خیر' اس نام کو زیادہ قبول نہیں کیا گیا کیونکہ اکثر لوگ اس میزائل کو پرامن ہتھیار تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہیں۔ تاہم ایک اور تباہ کن میزائل کا نام ''بونا آدمی'' رکھا گیا ہے اور اسے قبول بھی کر لیا گیا ہے۔ حالانکہ کسی بڑے شہر کو تباہ کرنے کی صلاحیت رکھنے والے میزائل کو ''بونا'' قرار دینا محض ستم ظریفی ہے۔

کسی نام کو قبول کرنے یا نہ کرنے کا دارومدار ہماری اپنی آراء پر ہوتا ہے۔ اگر لوگوں کو کسی نام پر شدید قسم کا اعتراض ہو تو وہ اسے استعمال کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ دوسری طرف اگر کوئی نام اکثر لوگوں کی رائے سے مطابقت رکھتا ہو تو اسے عموماً قبول کر لیا جاتا ہے۔

استدلال میں زبان کی اہمیت

سوچ پر ناموں کا اثر اس کی امر کی محض ایک مثال ہے کہ الفاظ ہمارے استدلال پر گہرا اثر ڈالتے ہیں۔ انسانوں کی استدلال کی صلاحیت اور چمپیزی' ڈولفن اور ہاتھی جیسے جانوروں کی ذہانت میں نمایاں فرق یہ ہے کہ انسان بات چیت کر سکتے ہیں اور جملے بنانے کے لیے الفاظ کو ترتیب دے سکتے ہیں۔ انسانی دماغ کا ایک بڑا حصہ اس مہارت کے لیے وقف رہتا ہے۔

بچہ اوسطاً آٹھ نئے الفاظ روزانہ سیکھتا ہے۔ بیس سال کی عمر تک اکثر افراد کے پاس لگ بھگ ہزار الفاظ جمع ہو جاتے ہیں۔ زیادہ مطالعہ کرنے والے افراد کے ذخیرۂ الفاظ میں اس سے بھی زیادہ لفظ ہوتے ہیں۔ ہمارے پیچیدہ معاشرے میں تعلیم کا بڑا مقصد ذخیرۂ الفاظ کی تشکیل اور زیادہ تجریدی الفاظ کو خیالات کی مختلف گروہ بندیوں میں متحد کرنا ہے۔ اس قسم کے خیالات کو تصورات یا تعقلات کا نام دیا جاتا ہے۔

الفاظ اور جملے استدلال کی جان ہیں۔ انہی کی بدولت ہم انسان کہلاتے ہیں۔ واضح اور قابلِ فہم زبان ہمیں اپنے تخلیقی فکر کے نتائج دوسروں تک پہنچانے کے قابل بناتی

ہیں۔ پھر وہ ان نتائج کی بنیادی پر اپنے علم میں اضافہ کرتے ہیں اور دوسروں تک بھی پہنچاتے ہیں۔ یوں گویا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جو انسانی علم کو بڑھنے پھولنے میں مدد دیتا ہے۔ اس حوالے سے دیکھا جائے تو استدلال کی مہارت میں اضافے کا ایک بڑا ذریعہ زبان پر گرفت کو بڑھانا ہے۔

الفاظ کے مختلف معانی

اکثر الفاظ کے ایک سے زیادہ معانی ہوتے ہیں اور ہم کسی لفظ کے مخصوص معنی کا تعین صرف سیاق وسباق میں ہی کر سکتے ہیں۔ یہاں ہم چند جملے درج کرتے ہیں جن میں ''لائن'' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اگرچہ یہ انگریزی زبان کا لفظ ہے لیکن اردو اور پنجابی میں بھی عام طور پر استعمال ہوتا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ ان جملوں میں اس لفظ کے معانی مختلف ہیں اور یہ کہ ہر جملے میں اس لفظ کے معنی کا تعین سیاق وسباق سے یا یوں کہئے کہ جملے کے دوسرے الفاظ کی مدد سے ہوتا ہے۔

(۱) انہوں نے بلاک کے گرد لائن بنائی۔
(۲) انہوں نے کھیت میں بجلی کی لائن بچھائی۔
(۳) وہ پارٹی لائن پر عمل کرتا ہے۔
(۴) اس نظم کی آخری لائن پڑھئے۔
(۵) کراچی پہنچے پر مجھے ایک لائن لکھ بھیجئے گا۔
(٦) اس کا تعلق بادشاہوں کی لائن سے ہے۔
(۷) وہ ریلوے لائن کے پار رہتا ہے۔
(۸) آپ کی لائن کیا ہے؟

یہاں ہم نے صرف آٹھ جملے درج کیے ہیں۔ تاہم ''لائن'' کے اس سے بھی زیادہ معانی ہیں۔ یہ بات محض اس ایک لفظ تک محدود نہیں بلکہ جیسا کہ ابھی ہم نے کہا' زبان کے اکثر الفاظ کثیر المعانی ہوا کرتے ہیں۔

الفاظ اور سیاق وسباق

اکثر الفاظ کے معانی نہ صرف ایک سے زیادہ ہوتے ہیں بلکہ وہ ایک دوسرے

سے مختلف بھی ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ بہت خوبی کی بات ہے کہ ہم ایک دوسرے کے ساتھ گفتگو کر سکتے ہیں۔ یہ اس طرح ممکن ہوتی ہے کہ لفظ کا سیاق وسباق، یعنی کسی جملے میں کسی لفظ کا دوسرے الفاظ کے ساتھی تعلق، معنی کو قابلِ فہم بنا دیتا ہے۔ یہ جملہ کہ ''اس چور نے بٹوا اٹھایا'' بالکل واضح ہے۔ اس طرح یہ جملہ بھی صاف ہے کہ ''چور نے حمید کا بٹوا اٹھایا''۔ تاہم ان دونوں جملوں میں لفظ ''اٹھایا'' کے معنی بالکل مختلف ہیں۔ تاہم دونوں میں سے ہر جملے میں موجود دیگر الفاظ اس امر کا تعین کر دیتے ہیں کہ ''اٹھایا'' سے کیا مراد ہے۔ سیاق وسباق کو پیشِ نظر رکھ کر ہمارا ذہن فوراً ہی طے کر دیتا ہے کہ کس جملے میں ''اٹھایا'' کا مطلب کیا ہے۔

بسا اوقات مختلف معانی رکھنے والے الفاظ کا تلفظ ایک جیسا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح ابلاغ میں رکاوٹیں پیدا ہو سکتی ہیں۔ تاہم اس صورت میں بھی ذہن سیاق و سبق کے حوالے سے مفہوم طے کر کے ان رکاوٹوں پر قابو پا لیتا ہے۔

خصوصی الفاظ

یہ واقعی تعجب کی بات ہے کہ اگرچہ الفاظ کے معانی عموماً ایک سے زیادہ ہوتے ہیں، لیکن خیالات کے ابلاغ میں زیادہ کنفیوژن پیدا نہیں ہوتا۔ الفاظ کے روزمرہ استعمال کے علاوہ ہر کاروبار یا پیشے کا اپنا مخصوص ذخیرۂ الفاظ بھی ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر کسی وکیل یا پولیس افسر کو ''نقب زنی''، ''ڈاکہ''، ''ہیرا پھری'' ''بدمعاشی''، ''حملہ''، ''زدوکوب'' اور ''بدنظمی'' جیسے الفاظ کے صریح مفاہیم سے بخوبی آگاہ ہونا چاہیے۔ اگر کوئی پولیس افسر کسی جرم کو صحیح طور پر بیان نہیں کر سکتا تو وہ انصاف کی راہ میں رکاوٹ بن جائے گا۔

سائنس دانوں کا اپنا ذخیرہ الفاظ ہوتا ہے۔ وہ بہت سے الفاظ کو ایسے مفہوم میں استعمال کرتے ہیں جو لغت میں درج ان کے معانی سے یکسر مختلف ہوتا ہے۔ یہی معاملہ دوسرے علوم وفنون اور پیشوں کا ہے۔

مبہم حدود والے الفاظ

لفظ ''کتا'' کوئی مشکل پیدا نہیں کرتا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس کے معانی بالکل واضح

ہیں۔ پھر بھی یہ ہوسکتا ہے کہ کسی بھیڑیئے یا لومڑی کو پہلی بار دیکھ کر ہم اس کو غلطی سے کتا سمجھ لیں۔ جرمن شیفرڈ کتے گھنگریالے بالوں والے کتوں سے اس قدر مشابہت نہیں رکھتے جس قدر بھیڑیوں سے رکھتے ہیں۔

اس جملے پر توجہ دیجئے کہ ''ٹماٹر ایک پھل ہے''۔ اب اگر ہم پھلوں کا تعین ذائقے سے کریں (اور انہیں عموماً میٹھا خیال کریں) تو یہ جملہ غلط قرار پاتا ہے۔ اس کے بجائے ہم کہیں گے کہ ٹماٹر سبزی ہیں اور وہ سلاد میں استعمال کیے جاتے ہیں۔ ماہرین نباتات کی رائے البتہ مختلف ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ''پھل'' کسی پودے کا وہ حصہ ہے جو پھول سے بنتا ہے اور اس میں بیج ہوتے ہیں۔ اس حوالے سے دیکھا جائے تو نہ صرف ٹماٹروں کا شمار پھلوں میں کرنا ہوگا بلکہ کھیروں، لوبیا اور سبز پھلیوں کو بھی پھل سمجھنا ہوگا۔

اس قسم کا ابہام پیدا کرنے والی بعض دوسری چیزیں بھی ہیں۔ مثلاً کیا آپ ہاؤس بوٹ کو مکان کہیں گے؟ رسی کسی قدر موٹی ہو تو ہم اس کو ''رسہ'' کہیں گے؟ اگر اینٹ سے بادام توڑا جائے تو کیا اینٹ کو ہتھوڑا کہا جا سکتا ہے؟ بانس کے بڑے پودے کو کیا درخت کا نام دیا جا سکتا ہے؟ آپ اس پودے کو دیکھیں تو وہ کافی اونچا ہوتا ہے اور اس کا تنا بھی موٹا ہوتا ہے۔ لیکن پودوں کے ماہرین اسے درخت تسلیم نہیں کرتے۔ وہ اسے ایک قسم کی گھاس سمجھتے ہیں کیونکہ وہ کھوکھلا ہوتا ہے اور اپنی بعض بنیادی خصوصیات کے اعتبار سے گھاس سے ملتا جلتا ہے۔ بہرحال ہم یہ کہیں گے کہ مختلف صورت حالوں میں الفاظ کی جن مختلف طریقوں سے تعریف کی جاتی ہے، ان کا فہم حاصل کرنا اور مناسب طور پر ان تعریفات کا اطلاع کرنا ضروری ہے۔

بعض الفاظ بڑے گروہوں، اشیاء کی قسموں اور اعمال کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان کی بعض حدود کا صریح تعین دشوار ہوتا ہے۔ اس سے الجھنیں پیدا ہوتی ہیں۔

تجریدی الفاظ

کسی درخت کی طرف اشارہ کر کے اگر کوئی کہے کہ ''بہار میں یہ درخت پھول دیتا ہے'' تو غالباً ہمیں اس بات کو سمجھنے میں دشواری پیش نہیں آتی۔ ''یہ درخت'' سے مراد ایک خاص درخت ہے اور پوری دنیا میں کوئی اور درخت بالکل اس جیسا نہیں ہے۔ لیکن

فرض کیجئے کہ ہم اس درخت اور دوسرے درختوں کے درمیان مشابہتیں تلاش کرتے ہیں۔ اس تلاش کے نتیجے میں ہم کہتے ہیں کہ یہ میپل کا درخت ہے' کیونکہ اس درخت کی خصوصیات میپل نامی درختوں سے ملتی ہیں۔ ان کے پتے ایک جیسے ہیں۔ پھول' بیج اور شکل وصورت ایک جیسی ہے۔ یہاں تک تو ٹھیک ہے لیکن خود یہ ''میپل'' کیا ہے۔ منطق کی زبان میں ہم کہیں گے کہ یہ ایک تجریدی تصور ہے۔ یہ ایک خاص قسم کے درختوں کا عمومی تصور ہے۔

ظاہر ہے کہ درختوں کی اور بھی کئی قسمیں ہیں۔ نیم' پیپل' شاہ بلوط' مہاگنی' صنوبر اور کئی دوسری قسم کے درخت ہوتے ہیں۔ گویا درختوں کے مختلف گروہ ہیں اور یہ ان کے نام ہیں۔ لیکن ان کے علاوہ ایک اور تجریدی تصور بھی موجود ہے اور وہ ہے ''درخت''۔ خود درخت ایک اور' زیادہ وسیع تر' تجرید کا حصہ ہے جس کو ''پودے'' کا نام دیا جاتا ہے۔ پودوں میں صرف درخت شامل نہیں ہوتے بلکہ گھاس' بیلیں' فصلیں اور کئی دوسرے پودے شامل ہوتے ہیں۔ تمام پودوں میں مشترک خصوصیت یہ ہے کہ وہ دھوپ سے توانائی حاصل کرتے ہیں اور اپنی خوراک' پانی اور کاربن ڈائی آکسائیڈ سے لیتے ہیں۔

اچھا ہم ایک قدم آگے بڑھ سکتے ہیں اور یہ کہہ سکتے ہیں کہ تمام پودے زندہ چیزیں ہیں۔ اب یہ ایک ایسا زمرہ ہے کہ جس میں ہم تمام جانداروں کو شامل کر سکتے ہیں۔ تجرید کے اس سے بھی اعلیٰ تر مدارج ممکن ہیں۔

جب الفاظ اشیاء کے بجائے تصورات کی نمائندگی کرتے ہیں تو پھر الفاظ کے صریح مفہوم کا ابلاغ اور بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ کار' میز اور ٹیلی فون کے تصور کو سمجھنا جمہوریت' آزادی' بغاوت' سچائی' خدا' انصاف' حسن' نیکی' یا ماحولیات کے مقابلے میں بہت آسان ہے۔ ان دوسری قسم کے تصورات کے فہم کا انحصار ہر شخص کے تجربے' پسِ منظر اور اعتقادات پر ہوتا ہے۔

اس قسم کے تجریدی الفاظ حقیقی اشیا کی نمائندگی نہیں کرتے۔ اس کے بجائے وہ ایسی صفات یا افکار کو ظاہر کرتے ہیں جن کا ہم اپنے حواس کے ذریعے براہِ راست مشاہدہ نہیں کر سکتے۔ ظاہر ہے کہ ہم کسی ٹھوس شے کی طرف اشارہ کر کے یہ نہیں کہہ سکتے کہ دیکھئے یہ جمہوریت ہے' یا انصاف ہے۔ اسی طرح سچائی اور حسن بھی مجسم اشیاء نہیں ہیں۔

''جمہوریت'' کی تجریدی ماہیت کا اظہار ان مختلف قسم کے خیالات میں ہوتا ہے جو مختلف ملکوں کے لوگ اس کے مفہوم کے بارے میں رکھتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ایک ہی ملک میں دو مختلف طبقوں سے تعلق رکھنے والے افراد کے نزدیک بھی جمہوریت کا مطلب مختلف ہوسکتا ہے۔

جب ہم زیادہ علم حاصل کرتے ہیں تو ہمارے کام' روزمرہ کی گفتگو اور استدلال میں تجریدی الفاظ کی تعداد بڑھتی چلی جاتی ہے۔ عالم فاضل لوگ استدلال میں درست مفاہیم کی اہمیت سے بخوبی آگاہ ہوتے ہیں۔ وہ اپنے استعمال کردہ الفاظ کے معانی کے تعین پر بہت توجہ دیتے ہیں۔ تعریفات پر نظر ثانی کرنے اور نئے علم کے سبب ضروری قرار پانے والی تبدیلیوں پر اتفاق رائے حاصل کرنے کے لیے منظّم کوششیں کی جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ اس سلسلے میں بین الاقوامی کانفرنسوں کا بھی اہتمام کیا جاتا ہے۔

لغات مرتب کرنے کا مقصد الفاظ کی فہرست سازی اور ان کے مختلف معانی کی نشاندہی کرنا ہوتا ہے تاکہ ابلاغ اور استدلال میں کنفیوژن کو کم کیا جاسکے۔ اس اعتبار سے لغات کے استعمال میں مہارت جدید زندگی کا ایک بنیادی مقصد ہے۔

آواز سے بدلنے والے معانی

جب کوئی شخص کسی دوسرے سے بات کرتا ہے تو وہ اپنا کوئی خیال' کوئی رائے اس تک پہنچانا چاہتا ہے۔ سننے والے کو لازماً ہوا کے ذریعے آنے والی آواز کی لہروں پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ آواز کی یہ لہریں جب سننے والے کے کان میں داخل ہوتی ہیں تو الیکٹروکیمیکل اشارے پیدا کرتی ہیں جو اعصاب کے ذریعے دماغ تک پہنچتے ہیں۔ بولنے والے کو توقع ہوتی ہے کہ جو خیال اس نے ادا کیا ہے' ویسا ہی خیال سننے والے میں پیدا ہوگا۔ تاہم یہ توقع ہمیشہ پوری نہیں ہوتی۔ ممکن ہے کہ اس وقت اور لوگ بھی باتیں کر رہے ہوں۔ اس طرح سننے والے کے ذہن میں مختلف آوازیں گڈمڈ ہوجاتی ہیں۔ پکی چھتیں اور دیواریں آوازوں کی بازگشت کرتی ہیں۔ اس طرح بھی بسا اوقات گڑبڑ ہوجاتی ہے۔

یہ بھی ہوتا ہے کہ مختلف لوگ الفاظ کو مختلف معانی دیتے ہیں۔ اس کے کئی اسباب ہیں۔ سماجی پس منظر ان میں سے ایک ہے۔ بعض الفاظ ایسے ہوتے ہیں کہ دیہاتی اور شہری انہیں مختلف معانی دیتے ہیں۔ امیروں اور غریبوں کے درمیان ھی اس قسم کا فرق عموماً پایا

جاتا ہے۔ علاقوں کے اپنے اپنے لہجے بھی ہوتے ہیں اور وہ بھی ابلاغ میں رکاوٹ پیدا کر سکتے ہیں۔

مختلف لفظوں کی آوازیں ایک جیسی ہوں تو بھی کنفیوژن پیدا ہونے کا امکان رہتا ہے۔ اس قسم کی صورت حال میں عام طور پر سیاق وسباق سے درست معانی کا تعین کرنے میں مدد مل جاتی ہے۔ لیکن دہرے معانی مسئلہ بن جاتے ہیں۔

ان اسباب کی بنا پر ہوتا یہ ہے کہ ایک شخص کوئی بات کہتا یا لکھتا ہے اور دوسرا اس سے بالکل مختلف مفہوم اخذ کرتا ہے۔ کبھی کبھی اس کنفیوژن کے سبب دوستیاں ٹوٹ جاتی ہیں' ازدواجی زندگیاں ختم ہو جاتی ہیں بلکہ قومیں ایک دوسرے پر چڑھ دوڑتی ہیں۔ تراجم میں معانی بدل جاتے ہیں۔

معانی کے درست ابلاغ میں ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمے کئی خاص مشکلات پیدا کرتے ہیں۔ ہمارے آج کے عالمگیر معاشرے میں ان مشکلات کی اہمیت کو نظر انداز کرنا خطرناک ہوسکتا ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ امیریکہ اور سوویت یونین کے درمیان سرد جنگ کی شدت کے دنوں میں سوویت وزیراعظم نکتا خروشیف نے امریکہ اور سوویت یونین کے باہمی تعلقات کے موضوع پر ایک تقریر کی۔ دونوں ملکوں کے معاشی نظاموں کے درمیان مسابقت کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے ایک جملہ کہا' جس کا ترجمہ یہ کیا گیا کہ ''ہم تمہیں دفن کر دیں گے''۔ ظاہر ہے کہ امریکیوں کو یہ جملہ برا لگا اور انہوں نے سمجھا کہ سوویت رہنما نے انہیں دھمکی دی ہے۔

روسی زبان کے بعض ماہرین نے البتہ یہ کہا کہ روسی زبان میں ''ہم تمہیں دفن کر دیں گے'' ایک محاورے کے طور پر کہا جاتا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ''ہم تمہیں نیچا دکھا دیں گے''۔ اب چونکہ سوویت یونین وزیراعظم دونوں ملکوں کے معاشی نظاموں کے درمیان مسابقت کا ذکر کر رہے تھے' اس لئے اگر انہوں نے اپنے نظام کو امریکی نظام سے بہتر قرار دیا اور کہا کہ ان کا نظام امریکی نظام کو شکست دے دے گا تو ظاہر ہے کہ اس میں دھمکی والی کوئی بات شامل نہ تھی۔ بہرحال مترجم کے مغالطے کے سبب سوویت وزیراعظم کے جملے سے غلطی فہمی پیدا ہوئی اور اس نے بین الاقوامی ماحول کی تلخی میں اضافہ بھی کیا۔

گویا بات یہ ہے کہ تقریر یا تحریر کے وسیلے سے ایک شخص کے خیالات دوسرے

شخص تک پہنچانا کافی مشکل کام ہے۔ جب دونوں اشخاص کی زبانیں مختلف ہوں تو ترجمے کی ضرورت پیش آتی ہے اور خیالات کا ابلاغ اور بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ ترجمے کے کام پر مترجم کا پڑھنے اور لکھنے کا اسلوب اثر انداز ہوتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ترجمے کے لئے کسی خاص زبان کے الفاظ کے لئے اس کا چناؤ بھی ابلاغ کو متاثر کرتا ہے۔

معنویات: معانی کا علم

گرین بش نامی گاؤں میں باب کی گاڑیاں مرمت کرنے کی ورکشاپ ہے۔ ایک بار میک میگل اس ورکشاپ پر اپنی گاری ٹھیک کرانے لے گیا۔ باب نے گاڑی کا ہڈ اوپر اٹھایا اور انجن کا معائنہ کرنے لگا۔ اسی دوران باب نے میک کو ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھ کر انجن چالو کرنے اور گیس پیڈل کو دبانے کے لئے کہا۔ چند لمحوں بعد اس نے میک کو آواز دی ''اسے قابو میں رکھو'۔ یہ سنتے ہی میک نے گیس پیڈل کو مزید دبایا۔ انجن زیادہ تیزی سے چلنے لگا۔

باب پھر چیخا ''اسے قابو میں رکھو' قابو میں''۔ میک نے پیڈل پر دباؤ اور بڑھا دیا۔ انجن اب پوری رفتار سے چل رہا تھا۔

باب غصے میں چلایا ''تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ سنتے نہیں' میں قابو میں رکھنے کو کہہ رہا ہوں۔

میک کو اچانک احساس ہوا کہ باب اصل میں پیڈل نرمی سے دبانے کو کہہ رہا تھا۔ میک کو یہ بات بھی یاد آ گئی کہ باب کسی دور دراز علاقے سے آ کر یہاں آباد ہوا ہے۔ ممکن ہے کہ اس کے اپنے وطن میں '' قابو میں رکھو'' کے معنی گرین بش سے مختلف ہوں۔

معنویات' زبان کے معانی کے علم کا نام ہے۔ ابھی ہم نے ایک مثال میں دیکھا کہ باب اور میک '' قابو میں رکھو'' سے مختلف منسوب کر رہے تھے۔ اس طرح گویا دونوں کو معنویاتی کنفیوژن کا سامنا کرنا پڑا۔ جب مختلف ملکوں یا ایک ہی ملک کے مختلف حصوں کے افراد آپس میں بات چیت کرتے ہیں تو انہیں ایک دوسرے کا مفہوم سمجھنے میں اس قسم کی الجھنیں پیش آتی ہیں۔ ایسی الجھنیں مختلف پسِ منظر رکھنے والے لوگوں کے درمیان اختلافات پیدا کرنے کا ایک اہم سبب بن جاتی ہیں۔ یہ سبب اس وقت اور بھی اہم ہو جاتا ہے' جب لوگ

مختلف زبانیں بولتے ہوں اورانہیں ابلاغ کے لئے ترجمے کی ضرورت پڑتی ہو۔

خیر! لوگ ایک ہی زبان استعمال کر رہے ہوں تو بھی پسِ منظر، تجربہ اور رویوں میں فرق کے سبب ایک ہی لفظ سے مختلف منسوب کر دیئے جاتے ہیں۔

معنویاتی کنفیوژن

فرض کیجئے کہ انتخابات کے دن آپ گلی میں نکلتے ہیں تو وہاں ایک شخص کو جھنڈا اٹھائے دیکھتے ہیں۔ اس پر لکھا ہے:

محمد دین کو ووٹ دیجئے

۱۸۰ کے لئے

امن......روزگار......تحفظ

جھنڈے پر درج اکثر الفاظ تجریدی ہیں۔ ذرا غور کیجئے کہ یہ تجریدی الفاظ ذہن میں کس قسم کے مختلف تاثرات پیدا کرتے ہیں۔ ووٹ کا لفظ سن کر ایک شہری اچھا تاثر قائم کرتا ہے۔ وہ اسے شہری فرض اور اپنا حق خیال کرتا ہے۔ جب کہ دوسرا شہری اسے ڈھکوسلا سمجھتا ہے، جو سیاست دانوں نے اسے بہلانے کے لئے ایجاد کر رکھا ہے۔

لفظ ''صدر'' کے بارے میں کیا خیال ہے؟ اگر آپ موجودہ سربراہ مملکت سے مطمئن ہیں تو پھر یہ لفظ خوشگوار تاثر دیتا ہے لیکن اگر آپ کا خیال ہے کہ صدر اپنے فرائض دیانت داری اور غیر جانب داری سے ادا نہیں کر رہا تو پھر یہ لفظ سن کر آپ ناگواری کا اظہار کریں گے۔

لفظ ''امن'' مندرجہ بالا دونوں الفاظ سے زیادہ تجریدی ہے۔ ایک شخص کے نزدیک اس کا مطلب جنگ بندی کا وہ زمانہ ہوسکتا ہے، جب کہ فریقین جنگ کا سازو سامان اکٹھا کرنے میں مصروف ہوتے ہیں۔ دوسرے کے نزدیک اس سے مراد وہ پرامید زمانہ ہوسکتا ہے، جب ہم ہتھیاروں سے نجات پانے کے لئے معاہدوں کی تیاری کرتے ہیں۔ گویا مختلف افراد ''امن'' سے مختلف معانی منسوب کرتے ہیں۔

اچھے عہدے پر فائز کوئی شخص جھنڈے پر ''روزگار'' کا لفظ پڑھ کر اسے نظر انداز کرسکتا ہے۔ لیکن بے روزگاری کے مارے ہوئے کسی دوسرے شخص کے لئے اس میں

بہت کشش ہوگی۔ اپنی ملازمتوں سے غیر مطمئن افراد بھی اس پر زیادہ توجہ دیں گے۔ ممکن ہے کہ صرف اس نعرے کے سبب وہ صدارتی انتخابات میں محمد دین کو ووٹ دینے کا فیصلہ کر لیں۔

دلیل اور مباحثے میں الجھنیں اس لئے پیدا ہوتی ہیں کہ فریقین تجریدی الفاظ سے اپنے اپنے انداز میں معانی منسوب کرتے ہیں۔ لہٰذا اس قسم کے امور میں اہم بات یہ ہوتی ہے کہ استعمال میں آنے والی اصطلاحوں کے معانی کی وضاحت کر دی جائے۔ معانی کا زبردست اختلاف اگر شریک بحث افراد کے ذہن میں گہرے طور پر نقش ہو تو ممکن ہے کہ بحث ان کے لئے مشکل یا شاید ناممکن ہی ہو جائے۔ تاہم الجھن اور کنفیوژن کو کم کرنے کے لئے وضاحت کی کوشش ضرور کرنی چاہئے۔

متناقص بیانات

کئی جانے پہچانے مقولے متناقص ہوا کرتے ہیں۔ تاہم اگرچہ ان کے الفاظ ایک دوسرے کی تردید کرتے ہیں۔ لیکن بعض مقولے خصوصی معانی حاصل کر لیتے ہیں۔ مثال کے طور پر ''کھلا راز'' کو ہی لیجئے۔ بھئی سیدھی سی بات ہے کہ اگر کوئی بات کھلی ہے تو وہ راز نہیں۔ اگر وہ راز ہے تو وہ کھلا نہیں ہو سکتا۔ اس تضاد کے باوجود ''کھلا راز'' کا ایک خاص مطلب طے ہو چکا ہے۔ یعنی اس سے مراد ایسا راز ہے جو اب راز نہ رہا ہو۔ ہر شخص اس کو جان چکا ہو۔

ایک بار کسی قومی رہنما نے اپنے ملک کی ''مستقبل کی تاریخ'' کا ذکر کیا تھا۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ تاریخ تو ماضی کی داستان کو کہتے ہیں۔ لہٰذا مستقبل سے اسے کیونکر منسوب کیا جا سکتا ہے۔ خیر اس ظاہر تجاد کے باوجود ''مستقبل کی تاریخ'' کے کچھ نہ کچھ معانی ضرور ہیں۔ مثال کے طور پر اس سے مراد ماضی کے بارے میں مستقبل کے مورخین کی معلومات ہو سکتی ہیں۔

ایسا ہی ایک اور جز و کلام ''کھیل کا سکالرشپ'' ہے جس کا امریکی درس گاہوں میں اس قدر چرچا ہے کہ اب اسے زبان کا حصہ تسلیم کر لیا گیا ہے۔ فرض کیجئے کہ کسی طالب علم کے نمبر کم ہیں لیکن اچھا کھلاڑی ہونے کے سبب اسے کالج میں نہ صرف داخلہ مل جاتا

ہے، بلکہ اچھا کھلاڑی ہونے کے ناطے کالج کی طرف سے کچھ ماہوار رقم بھی دی جاتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس رقم کو ''سکالرشپ'' کہنا کیا ضروری ہے؟ بہرطور یہ بھی بظاہر متضاد الفاظ ہی ہیں۔

اس قسم کے متناقص مقولوں اور اجزاء کلام کے لئے ''صنعت تضاد'' کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ یہ اصطلاح ایسے بولوں کی طرف اشارہ کرتی ہے جو پہلی نظر میں احمقانہ دکھائی دیتے ہیں لیکن کسی خاص مفہوم میں وہ بامعنی ہوتے ہیں۔ ''میٹھا دکھ'' اور ''چیختی خاموشی'' اس قسم کے مقولے ہیں۔ ہماری شاعری کو دیکھئے تو وہ اس قسم کے الفاظ سے بھری ملے گی۔

لوگ عموماً متناقص باتیں کہتے رہتے ہیں۔ یہ حال صرف سیاست دانوں کا نہیں، جو اس معاملے میں خاصے بدنام ہیں بلکہ عام لوگ بھی اکثر اوقات متناقص باتیں کہہ دیتے ہیں۔ بسا اوقات تضاد بالکل واضح ہوتا ہے اور سننے والوں کو اس کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ تاہم عموماً اس کی نشاندہی کرنا دشوار ہوتا ہے۔ فرض کیجئے آپ کا کوئی دوست یہ دعویٰ کرتا ہے کہ ''آپ سوچ بھی نہیں سکتے کہ میں آج صبح کیا کر رہا تھا'' لغوی معانی کے حوالے سے یہ جملہ غلط ہے۔ کیونکہ سوچ کو پابند نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ یہ بات بالکل ممکن ہے کہ آپ یہ سوچ سکیں کہ آپ کا دوست صبح کے وقت کیا کر رہا تھا۔ تاہم ہمیں مان لینا چاہئے کہ دوست کے اس جملے میں جو مبالغہ شامل ہے، وہ اس نے جان بوجھ کر شامل کیا ہے۔ اصل میں وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ اس صبح اس نے کوئی حیران کن کارنامہ سرانجام دیا تھا۔

بعض متناقص بیانات ایسے ''حقائق'' کو پیش کرتے ہیں جو محال ہیں۔ چنانچہ فرض کیجئے کہ کوئی شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ ''آثارِ قدیمہ کے ماہر نوید نے ہڑپہ میں کھدائی کے دوران ایک ایسا سکہ دریافت کیا ہے، جس پر ۱۲۰۲ء ق م کی تاریخ درج ہے''۔ ظاہر ہے کہ یہ بات درست نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ ق م سے مراد قبل مسیح ہے اور حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے ۱۲۰۲ء سال پہلے کوئی شخص ان کی مستقبل کی تاریخ پیدائش کا تعین نہ کر سکتا تھا۔

سب، کوئی نہیں

اس جملے پر غور کیجئے کہ ''کسی کھلے برتن میں پانی ڈالا جائے تو وہ ہمیشہ برتن کی

پست ترین سطح پر جا گرتا ہے''۔آپ کا کیا خیال ہے؟ یہ جملہ درست ہے یا غلط۔کیا آپ اس کو درست سمجھتے ہیں۔ایک منٹ ٹھہریئے۔اگر پانی اس برتن میں ڈالا جارہا ہو جو زمین کے گرد چکر لگانے والے خلائی جہاز میں رکھا ہوا ہے تو پھر کیا صورت ہو گی؟ ظاہر ہے کہ اس صورت میں پانی گرے گا ہی نہیں۔اس کے اسباب یہاں زیر بحث نہیں۔کہنے والی بات بس یہ ہے کہ ہمارے مندرجہ بالا جملے میں''ہمیشہ'' کا استعمال بالکل درست نہیں۔اس کے بجائے ہمیں''عام طور پر'' کے الفاظ استعمال کرنے چاہئیں۔

شاید ہمیں یوں کہنا چاہیئے تھا کہ''اگر زمین پر کسی کھلے برتن میں پانی ڈالا جائے تو وہ ہمیشہ برتن کی پست ترین سطح پر جا گرتا ہے''۔کیا اب یہ جملہ درست ہے؟ سچی بات تو یہ ہے کہ یہ جملہ اب بھی مکمل طور پر درست نہیں۔وجہ یہ ہے کہ اپنے گیلا کرنے والے عمل کے باعث پانی برتن کے تمام کناروں کے ساتھ ساتھ نارمل سطح سے تھوڑا سا اوپر کو رہتا ہے۔ جہاں کہیں شیشے کی سطح پر پانی ہو تو آپ غور سے دیکھنے پر اس حقیقت کا ادراک کر سکتے ہیں۔

ممکن ہے کہ یہ بات آپ کو رائی کا پہاڑ بنانے والا معاملہ محسوس ہو۔لیکن ایسا نہیں ہے۔درحقیقت یہ معاملہ بہت اہم ہے۔یہاں تک کہ ہماری زندگی کا دارومدار اس پر ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ پانی پودوں کی باریک نالیوں (ساق) کے نظام میں داخل ہو کر ان کی جڑوں میں سرایت کرتا ہے اور پھر خود ہی اوپر اٹھ کر پودے کے تنے اور پتوں تک پہنچتا ہے۔جہاں سورج کی شعائیں پودے کے لئے اور ہمارے لئے خوراک پیدا کرتی ہیں۔

پانی میں اگر یہ خصوصیت نہ ہوتی تو شاید درخت' گھاس اور جھاڑیوں جیسے زمینی پودے پیدا ہی نہ ہوتے۔یوں ہم اناج' پھلوں اور سبزیوں سے محروم رہ جاتے اور خوراک کے لے ہمیں سمندر پر انحصار کرنا پڑتا۔

گویا ہم دیکھ سکتے ہیں کہ ترمیم شدہ بیان میں بھی لفظ''ہمیشہ'' کا استعمال واقعی مغالطے کا سبب بنتا ہے۔''ہمیشہ'' کا لفظ کسی استثناء کے بغیر ہر جگہ اور ہر قسم کے حالات میں کسی معاملہ کے ہونے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔اس لئے دس لفظ کو درست طور پر بہت محدود قسم کے بیانات میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔یہی کیفیت''کبھی نہیں''''تمام''''کوئی نہیں''اور''قطعاً'' جیسے الفاظ کی ہے۔ان الفاظ کو ہمیں احتیاط کے ساتھ استعمال کرنا چاہیئے۔

زیادہ واضح انداز میں لکھنا

بارش ہونے کی وجہ کی ایک غیر واضح بیان ملاحظہ فرمایئے:

''آبی بخارات جب ٹھنڈے ہوتے ہیں اور بارش ہونے لگتی ہے۔ ہوائیں آبی بخارات کو پہاڑوں کی طرف لے جاتی ہیں۔ بارش کے لئے پانی سمندر سے آتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے قطرے بڑے ہوکر بارش کی صورت میں گرتے ہیں۔ سمندر کا پانی دھوپ سے گرم ہوکر آبی بخارات بناتا ہے۔ سمندر سے آبی بخارات بن جاتے ہیں تو وہ ٹھنڈے ہوکر پانی کے چھوٹے چھوٹے قطروں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔''

اس بیان میں اگرچہ تمام جملے درست ہیں لیکن وہ اس ترتیب میں نہیں ہیں جس ترتیب سے فطرت میں واقعات رونما ہوتے ہیں۔ لہٰذا یہ پیراگراف اوٹ پٹانگ قسم کی توجیہ بن کر رہ گیا ہے۔ جن کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے قاری کو خیالات کی ترتیب درست کرنا پڑے گی۔ علاوہ ازیں اس میں بعض الفاظ کی تکرار نامناسب معلوم ہوتی ہے اور یہ تکرارِ خیالات کی بے ربطی کے سبب پیدا ہوتی ہے۔

ذیل میں ہم اس پیراگراف کو جملوں کی ترتیب بدل کر دوبارہ درج کر رہے ہیں۔ اس میں خیالات وہی ہیں لیکن اب ان کی ترتیب وہی رکھی گئی ہے جو فطرت میں واقع ہونے والے واقعات کی ہے۔ اس طرح بارش کی زیادہ قابلِ فہم اور قابلِ مطالعہ توجیہ سامنے آتی ہے۔

''دھوپ کی حدت سے سمندر کا پانی بخارات میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ہوائیں ان آبی بخارات کو پہاڑوں کی طرف لے جاتی ہیں۔ جب ہوا اوپر کو اٹھتی ہے تو وہ ٹھنڈی ہو جاتی ہے۔ یوں آبی بخارات کثیف ہو جاتے ہیں اور بادلوں میں چھوٹے چھوٹے قطروں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ پھر یہ قطرے بڑے ہوکر بارش کی صورت میں زمین پر گرتے ہیں۔''

واضح اور منطقی تحریر کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ خیالات میں نظم و ضبط ہو۔ خیالات کے سلسلے کو توڑنے والی رکاوٹیں موجود نہ ہوں۔

بعض مشہور ادیب اس انداز سے نہیں لکھتے۔ ان کے اسلوب میں تسلسل کے

بجائے جست کا تاثر ملتا ہے اور لوگ انہیں پڑھنا پسند بھی کرتے ہیں۔ تاہم دانش مندی کا تقاضا یہ ہے کہ اس قسم کے ادیبوں کے نقش قدم پر چلنے سے پہلے رواں اور منظّم انداز میں لکھنے کا ڈھنگ سیکھا جائے۔ دوسروں تک اپنے خیالات سادہ اور واضح انداز میں پہنچانے کا طریقہ پوری طرح سیکھنے کے بعد اسلوب نگارش میں تجربات بھی کئے جا سکتے ہیں۔

الفاظ کو درست طور پر استعمال کرنا

اکثر اوقات ہم ایسے بیانات سنتے یا پڑھتے ہیں جن کا مفہوم واضح نہیں ہوتا۔ ہوتا یہ ہے کہ جب ہم کسی تحریر کو سرسری پڑھتے ہیں یا کوئی بات سرسری طور پر سنتے ہیں تو لگتا ہے کہ وہ بے معنی نہیں۔ لیکن جب تجزیہ کیا جائے، غور و فکر کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ کوئی گڑبڑ ہوگئی ہے۔ کہنے یا لکھنے والے نے جو کچھ کہا یا لکھا ہے، اس کے پیچھے کوئی معانی نہیں ہیں۔ میں یہاں اس معاملے میں کوئی مثال دینے سے گریز کروں گا۔ وجہ یہ ہے کہ آپ کسی بھی ادیب یا کالم نگار کی تحریر اٹھا لیجئے۔ آپ کو اس قسم کی تحریروں کی مثال مل جائے گی۔

فرض کیجئے کہ جمیل یہ کہتا ہے کہ ''رفتار...... وقت سے تیز تر رہے''۔ اس جملے میں کوئی شے غائب ہے۔ کوئی رفتار کسی دوسری رفتار سے تو تیز تر ہو سکتی ہے لیکن رفتار وقت سے تیز تر نہیں ہو سکتی۔ یہ تو ایسے ہی ہے جیسے یہ کہا جائے کہ ''ساٹھ میل فی گھنٹہ کی رفتار دو دن کے وقت سے تیز تر ہے''۔ ظاہر ہے کہ یہ جملہ بے معنی قرار پائے گا۔ غالباً جمیل دو ایک جیسی مقداروں کا موازنہ کرنا چاہتا تھا۔ جیسے وقت کی وہ مقدار جو ایک دوڑ مکمل کرنے میں صرف ہوتی ہے (نہ کہ دوڑنے کی رفتار) اور وقت کی وہ مقدار جو دوڑ کے نتائج رپورٹ کرنے کے لئے درکار ہوتی ہے۔

الفاظ احتیاط سے ساتھ درست معنوں میں استعمال کئے جائیں۔ ان کی منطقی اور نحوی ترتیب درست رکھی جائے تو مفہوم کے ابلاغ میں آسانی ہوتی ہے۔ آپ کوئی بات لکھتے ہیں یا کہتے ہیں تو پڑھنے یا سننے والا آپ کا مفہوم جان لیتا ہے۔ ابلاغ میں رکاوٹ اس وقت پیدا ہوتی ہے جب الفاظ درست انداز میں استعمال نہ کئے جائیں۔

الجھنیں پیدا کرنے والے اسمِ ضمیر

اس بیان پر توجہ فرمائیے کہ ''فرانسیسی اور انگریز بہت مختلف ہوتے ہیں۔ وہ

بہت جذباتی اور ڈرامہ باز ہیں''۔ اچھا سوال یہ ہے کہ اس بیان کے دوسرے جملے میں لفظ ''وہ'' فرانسیسیوں کی طرف اشارہ کرتا ہے یا انگریزوں کی طرف؟ اس بیان کے لکھنے والے کو معلوم تھا کہ اس کا اشارہ کس طرف ہے لیکن یہ نکتہ پڑھنے والے تک منتقل نہیں ہوتا۔ وہ فرانسیسیوں اور انگریزوں دونوں کو جذباتی اور ڈرامہ باز قرار دے سکتا ہے۔ یا دونوں میں سے کسی ایک سے یہ صفات منسوب کر سکتا ہے۔ پڑھنے والے اپنی ذاتی رائے کو بنیاد بنا کر فیصلہ کرے گا۔ مثلاً اگر اس کی رائے ہے کہ فرانسیسی لوگ انگریزوں سے زیادہ جذباتی اور ڈرامہ باز ہوتے ہیں تو وہ مذکورہ بیان میں لفظ ''وہ'' سے مراد فرانسیسی لوگ لے گا۔ تاہم اکثر لوگ کوئی فیصلہ نہ کر پائیں گے اور وہ الجھن محسوس کریں گے۔

''وہ'' ''یہ'' اور ''ہم'' جیسے اسم ہائے ضمیر کے معانی سے متعلق شبہات کو دور کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ان الفاظ کو ان کے ماقبل سے براہِ راست منضبط رکھا جائے۔ مثال کے طور پر ہم نے جو بیان یہاں درج کیا ہے' اس کو یوں لکھا جانا چاہئے تھا کہ ''فرانسیسی لوگ انگیزوں سے زیادہ جذباتی اور ڈرامہ باز ہوتے ہیں'' اور اگر اسکے برعکس اشارہ کرنا مقصود تھا تو یہاں کہنا چاہئے تھا کہ ''انگریز فرانسیسی لوگوں سے جذباتی اور ڈرامہ باز ہوتے ہیں''۔

بے ربط جزو کلام

ایک بار اخبار میں یہ جملہ شائع ہوا تھا کہ ''اے پی سی کمپنی (کمپنی کا نام بدل دیا گیا ہے) پر ایک ملازم کو ملازمت سے برخاست کرنے کا الزام لگایا گیا ہے جس کے سپروائزر نے اچھی رپورٹیں دی تھیں کیونکہ وہ دوسرے ملک میں پیدا ہوا تھا''۔ کیا اس جملے کا مطلب یہ ہے کہ سپروائزر نے ملازم کی تعریف اس لئے کی تھی کہ وہ دوسرے ملک میں پیدا ہوا تھا؟ یا شاید اس کا مطلب یہ ہے کہ ملازم کو نوکری سے اس لئے نکالا گیا کہ وہ دوسرے ملک میں پیدا ہوا تھا حالانکہ اس کے افسر اس کے کام سے خوش تھے۔

اس جملے کا مفہوم متعین کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں۔ بس یہ ہے کہ اس کو پڑھ کر نظر انداز کر دیا جائے۔ شاید سیاق وسباق سے ہمیں کوئی اشارہ مل سکتا ہے۔ یہ بات مناسب دکھائی نہیں دیتی کہ کوئی ملازم محض دوسرے ملک میں پیدا ہونے کے سبب اچھی رپورٹیں

حاصل کر سکتا ہے۔ بہر طور اس قسم کے جملوں کا مفہوم سمجھنے کے لئے ان کی توڑ پھوڑ کرنا پڑتی ہے۔ اکثر قارئین کے لئے یہ کام مشکل اور غیر دلچسپ ہوتا ہے۔ اصل میں تو یہ لکھنے والے (یا بولنے والے) کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے خیالات کو واضح اور قابلِ فہم بنائے۔

مذکورہ جملے کو بہتر انداز میں یوں لکھا جا سکتا تھا کہ ''اے بی سی کمپنی پر الزام لگایا گیا ہے کہ اس نے ایک ملازم کو غیر ملک میں پیدا ہونے کے سبب ملازمت سے برخاست کر دیا ہے حالانکہ ملازم کے سپروائزر اس کے کام سے مطمئن تھے''۔ اب یہ جملہ زیادہ قابلِ فہم بن گیا ہے۔ ہم نے بس یہ کیا ہے کہ جملے کے وہ حصے یکجا کر دیئے ہیں' جو معنوی طور پر ایک دوسرے سے منضبط ہیں۔

جسمانی زبان اور رسوم

لوگ ایک دوسرے کے ساتھ ابلاغ کے لیے صرف تقریر و تحریر سے ہی کام نہیں لیتے۔ ابلاغ کے بعض دوسرے وسائل بھی ہیں۔ مثلاً ہاں یا نہ کہنے کے لیے اکثر اوقات سر کی جنبش سے کام لیا جاتا ہے۔ بعض دوسری جسمانی حرکات بھی احساسات کے اظہار کے لیے استعمال ہوتی ہیں۔ اس سلسلے میں درج ذیل مثالوں پر توجہ کیجئے۔

(۱) جنازے کے موقع پر کوئی خاتون بیوہ کا ہاتھ پکڑ کر دباتی ہے۔ لیکن زبان سے کچھ نہیں کہتی مگر اس کے چہرے کا تاثر ہمدردی اور افسوس ظاہر کر دیتا ہے۔

(۲) ماں نے اقصٰی سے کہا تھا کہ وہ سکول سے واپسی پر تھوڑا سا پنیر بازار سے لیتی آئے۔ اقصٰی بھول جاتی ہے۔ گھر واپس آنے پر ماں اس سے پنیر کے بارے میں پوچھتی ہے تو اس کو اچانک یاد آ جاتا ہے۔ تاہم الفاظ میں جواب دینے کے بجائے اقصٰی دونوں ہاتھ سر پر رکھ لیتی ہے اور اس کے چہرے پر حیرت اور افسوس کا تاثر پھیل جاتا ہے۔

ذرا غور تو کیجئے کہ مندرجہ ذیل صورت حالوں کو جسم کی زبان میں کیسے بیان کیا جا سکتا ہے؟

بدبو

برتری کا احساس

شرم

مایوسی

دوسرے کی بات پر شبے کا اظہار

غصہ

لڑکی کی دھمکی

خوف

حیرت

اکثر اوقات جسم کی زبان کے ذریعے احساسات کا اظہار لاشعوری طور پر ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں ہم پام کی مثال پیش کر سکتے ہیں۔ وہ سٹڈ کو پسند کرتی ہے اور جم اسے ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ اس لیے جم جم اس کے پاس آتا ہے تو آخری لمحے تک وہ یہ تاثر دیتی ہے گویا اس نے جم دیکھا یہ نہیں۔ جم کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے وہ عام دستور سے زیادہ فاصلے پر رہتی ہے۔ جم کے ساتھ یوں ہاتھ ملاتی ہے جس سے کسی گرم جوشی کا اظہار نہیں ہوتا۔ سٹڈ کی بات البتہ اور ہے۔ اس کی قربت میں پام کے جسمانی اظہار بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ جب وہ پام کی طرف آتا ہے تو دور ہی سے وہ استقبالیہ انداز میں ہاتھ پھیلا دیتی ہے' بلکہ اکثر اوقات آگے بڑھ کر اس سے ہاتھ ملاتی ہے۔ جب باتیں کرتی ہے تو اس کا چہرہ دمکنے لگتا ہے۔ باتیں کرتے ہوئے پام سٹڈ کے قریب تر ہو جاتی ہے۔

جسمانی زبان کے معاملے مے قومیت اور خاندانی پسِ منظر بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ بعض ثقافتوں میں لوگ باتیں کرتے ہوئے ایک دوسرے کے بہت قریب کھڑے ہوتے ہیں۔ جبکہ بعض دوسری ثقافتوں میں بولنے اور سننے والے قدرے فاصلے پر رہتے ہیں۔ چنانچہ یہ بھی ہوتا ہے کہ مختلف ثقافتی پسِ منظر رکھنے والے دو افراد جب آپس میں گفتگو کرتے ہیں تو دونوں بے چینی سی محسوس کرتے ہیں۔ ایک سمجھتا ہے کہ دوسرا اس کے بہت قریب آ کر بول رہا ہے جبکہ دوسرے کو محسوس ہوتا ہے کہ پہلا شخص ملاقات میں گرم جوشی کا مظاہرہ نہیں کر رہا اور ایک فاصلے پر کھڑا ہے۔

بعض ثقافتوں میں باتیں کرتے ہوئے لوگ ایک دوسرے کو ہاتھ لگاتے ہیں' کسی خاص نکتے پر زور دیتے ہوئے سننے والے کا بازو پکڑ لیتے ہیں یا بعض قسم کے اشارے

کرتے ہیں۔ ایسے معاشرے بھی ہیں جن میں پاس بیٹھے ہوئے لوگوں کے ساتھ بھی بات چیت کرتے ہوئے زور سے بولا جاتا ہے اور ایک دوسرے کی بات کاٹنے کو معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ کئی دوسرے معاشروں میں لوگ آہستگی سے بولتے ہیں' اشارے کم کرتے ہیں اور زیادہ بے تکلفی کا مظاہرہ نہیں کرتے۔ یہ عادتیں نئی نسل میں منتقل ہوتی چلی جاتی ہیں' کیونکہ بچے اپنے والدین' دوستوں' ہمسایوں اور عزیزوں کے انداز کی نقل کرتے ہیں۔ اس معاملے میں اب ٹیلی وژن بھی اہم کردار ادا کرتا ہے اور بچے جسمانی اظہار کے کئی طریقے ٹیلی وژن کی مدد سے سیکھ لیتے ہیں۔

بات چیت کا آغاز عموماً ہاتھ ملانے سے ہوتا ہے۔ بعض لوگ اس معاملے میں زیادہ ہی گرم جوش ہوتے ہیں۔ دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر وہ زور سے دباتے ہیں جبکہ بعض لوگ اس انداز کو پسند نہیں کرتے' وہ نرمی سے ہاتھ ملاتے ہیں۔ مختلف معاشروں سے تعلق رکھنے والے دو افراد جب ایک دوسرے سے ہاتھ ملاتے ہیں تو ہوسکتا ہے کہ دونوں کو غلط تاثر ملے۔ ایک کو گلہ ہو کہ دوسرے نے ہاتھ زور سے ملایا ہے اور دوسرا یہ شکایت کر رہا ہو کہ پہلے نے گرم جوشی سے ہاتھ نہیں ملایا۔

جو لوگ دوسری قوموں سے' معاشروں سے تعلق رکھنے والے افراد سے نفرت کرتے ہیں' ان کو اپنے آپ سے پوچھنا چاہیے کہ اس نفرت کا سبب جسمانی اظہار یا رسوم کا فرق تو نہیں۔ بہرطور دوسروں کے ساتھ اچھے تعلقات کے لیے ان کی جسمانی زبان اور رسوم و رواج کے بارے میں جاننا ضروری ہوتا ہے اور اس قسم کی معلومات کو پیشِ نظر بھی رکھنا چاہیے۔

جسمانی زبان الفاظ کے معانی بدل سکتی ہے۔ مثلاً اگر کسی جسمانی اشارے کے بغیر لفظ ''نہ'' کہا جائے تو اس کا مطلب کسی سوال کے جواب میں سادہ اور غیر جذباتی ''نہ'' ہوگا۔ لیکن اگر یہی لفظ زور سے کہا جائے اور ساتھ ہی زمین پر زور سے پاؤں مارا جائے یا میز پر مکا مارا جائے تو اس کا مطلب نہایت جذباتی انداز میں ''نہ'' ہوگا۔ اس لفظ کے ساتھ اگر عیارانہ مسکراہٹ اور ہاتھ کی جنبش شامل ہو تو ''نہ'' کا مطلب شبے کا اظہار ہوگا۔

جسمانی زبان بہت سے جانوروں کے لیے اظہار کا بنیادی وسیلہ ہے۔ عموماً اس کے ذریعے خوف' خوشی یا غصے جیسے سادہ جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ جب کتا اپنے دانت

نکال کر ہماری طرف بڑھتا ہے تو اس کے ارادوں کے بارے میں ہمیں کوئی شبہ ہوتا۔ بلاشبہ اس کی غراہٹ بھی ارادے کو ظاہر کرتی ہے۔تاہم عام طور پر جسمانی اشارہ کافی ہوتا ہے۔

انسانوں کی جسمانی زبان نہ صرف احساسات اور جذبات کو ظاہر کرتی ہے بلکہ ایسی معلومات بھی مہیا کرسکتی ہے جو دوسرے افراد اور خیالات کے بارے میں ہمارے اندازوں پر اثر انداز ہوسکتی ہیں۔تاہم جہاں تک پیچیدہ خیالات کا معاملہ ہے' ان کے اظہار کے لیے الفاظ درکار ہوتے ہیں۔الفاظ پر مشتمل زبان کے بغیر ہم اپنے خیالات کا اظہار نہیں کرسکتے۔علاوہ ازیں الفاظ پر مبنی زبان کے بغیر حقائق سے نتائج اخذ کرنے کی ہماری اہلیت بے حد محدود رہتی ہے۔استدلال کی اہلیت ختم ہو جاتی ہے اس زبان کے بغیر نئی دریافتیں آئندہ نسلوں تک نہیں پہنچائی جاسکتیں اور یوں تہذیب کا وجود خطرے میں پڑ جاتا ہے۔

اس باب میں ہم نے ابلاغ میں واقع ہونے والے مغالطّوں کے کئی ذرائع کی طرف توجہ دلائی ہے۔اس قسم کے مغالطے اکثر اوقات مغالطہٰ آمیز ''حقائق'' کو جنم دیتے ہیں اور جو بعد ازاں غلط استدلال کی بنیاد بن جاتے ہیں۔غلط استدلال کے اور بھی اسباب ہیں اور آئندہ باب میں ہم ان کا ذکر کریں گے۔

استدلال کے عمومی مغالطے

امریکہ کا بدترین ایٹمی حادثہ ۱۹۷۹ء میں ریاست پینسیلونیا میں ہیرس برگ کے قریب تھری مائل آئی لینڈ کے ایٹمی پلانٹ میں پیش آیا تھا۔ اس حادثے کی ابتدائی خبروں میں بعض ریڈیوایکٹوگیسوں کے حادثاتی اخراج کا ذکر کیا گیا تھا جس کے سبب بہت سے لوگ اپنے سازوسامان اور خاندانوں سمیت اس مقام سے بھاگ گئے تھے۔ تین روز تک کارکن نقصان زدہ آلات کوٹھیک کرنے کی کوششیں کرتے رہے۔ وہ تابکاری گیسوں اور پانی کے بڑے پیمانے پر اخراج کو روکنا چاہتے تھے۔ انہیں معلوم نہ تھا کہ ہائیڈروجن گیس کے جو چند دھماکے پلانٹ میں ہوئے تھے، وہ بڑے نقصان کا سبب بن جائیں گے۔

اچھی بات یہ ہوئی کہ پلانٹ سے ملحقہ سٹور کرنے والی عمارت نے خارج ہونے والے تابکاری پانی کو روک کر بڑی آفت سے بچالیا۔ یوں ایٹمی ردِعمل بتدریج ختم ہوگئے اور معقول حد تک محفوظ ماحول پیدا ہوگیا۔

اس حادثے میں قیمتی جانیں بچ گئیں۔ تاہم تابکاری گندگی اور تابکاری کے سبب مستقبل میں واقع ہونے والی اموات سے بچاؤ کے انتظامات پر دس برس میں ایک ارب ڈالر خرچ ہوگئے۔ پھر بھی ایک سوال اپنی جگہ قائم رہا۔ وہ سوال یہ تھا کہ ایٹمی فضلے کو

کس جگہ مستقل طور پر ٹھکانے لگایا جائے کہ وہ مستقبل میں انسانی زندگی کے لیے خطرہ نہ بن سکے؟

امریکہ کے صدر نے اس حادثے کی تحقیقات کے لیے ایک کمیشن قائم کیا تھا۔ اس کمیشن نے حادثے کے بڑے سبب کے طور پر پوری ایٹمی صنعت کے رویوں کی طرف توجہ دلائی۔ کمیشن کی رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ:

جو شہادتیں ہمیں ملیں ان میں بار بار ایک لفظ کی تکرار ہوتی رہی۔ یہ لفظ ''رویہ'' تھا...... ہم جس معاملے کی بھی تحقیق کرتے اس میں ہمیں ان لوگوں سے متعلقہ مسائل سے واسطہ پڑتا جو اس پلانٹ کو چلاتے تھے۔ اہم تنظیموں کو چلانے والی انتظامیہ اور ایٹمی توانائی کے مراکز کے تحفظ کی دیکھ بھال کرنے والے وفاقی ادارے کے مسائل بھی ہماری نظر میں آئے۔

ایٹمی توانائی کے مراکز کئی برس سے کام کر رہے تھے اور ان میں کسی فرد کے زخمی ہونے کی کوئی شہادت موجود نہ تھی۔ لہٰذا اس امر کا یقین پیدا ہو گیا کہ ایٹمی توانائی کے پلانٹ خاصی حد تک محفوظ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تھری مائل آئی لینڈ میں ایسے کئی اہم اقدامات نہ کئے گئے تھے جو اس حادثے کی روک تھام کر سکتے تھے۔

لہٰذا اس حادثے کی توجیہ کارکن کی غلطی کے طور پر ہو یا نہ ہو' ہمیں یقین ہے کہ مذکورہ بالا خرابیوں کی موجودگی میں اس قسم کا حادثہ بہر طور ناگزیر تھا۔

اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کے لئے کمیشن کے ارکان نے اپنی رپورٹ میں بتایا تھا کہ حادثے کے آغاز میں کارکنوں کو صورتِ حال کے قابو میں ہونے کا اس حد تک یقین تھا کہ انہوں نے پانی ٹھنڈا کرنے کا ہنگامی نظام بند کر دیا تھا...... حالانکہ اس نظام کی مدد سے صورتِ حال کو ابتر ہونے سے بچایا جا سکتا تھا۔

رویے کے خطرات

اس قسم کے واقعات ایٹمی توانائی کے بعض دوسرے مراکز میں رونما ہو چکے تھے۔ ان کی تفتیش کرنے والوں نے ایٹمی صنعت کو خبردار رہنے کی بارہا وارننگ دی تھی۔ لیکن ان پر کوئی توجہ نہ دی گئی۔ ہر کوئی یہی سمجھتا رہا کہ ایٹمی توانائی کا نظام محفوظ ہے۔ کارکن

یہ خیال کرتے رہے کہ انہیں حادثات سے محفوظ رکھنے کے لیے آلات موجود ہیں۔ کوئی چھوٹی موٹی غلطی ہو جائے تو بھی کسی بڑے خطرے کا خدشہ نہیں۔

اس قسم کے رویے بہت سے بڑے حادثات کا بنیادی سبب بنتے ہیں۔ مثال کے طور پر ۱۹۸۶ء میں سوویت یونین میں چرنوبل کے ایٹمی توانائی کے پلانٹ میں ایک خوفناک حادثہ پیش آیا تھا۔ اس حادثے کے بعد ہوا کے ذریعے تابکاری گیسیں اور ذرات کئی یورپی ملکوں کے بڑے علاقے تک پھیل گئے تھے۔ جب کہ سوویت یونین میں اس حادثے کے سبب کئی اموات بھی ہوئی تھیں۔ علاوہ ازیں تابکاری اثرات کی بناء پر مستقبل میں ہزاروں افراد کی اموات کا خدشہ بھی پیدا ہوا تھا۔

جب اس حادثے کا سبب تلاش کرنے کے لیے تفتیش شروع ہوئی تو وہی رویہ سامنے آیا جو تھری مائل آئی لینڈ کے ایٹمی پلانٹ میں حادثے کے پیچھے کارفرما تھا۔ چرنوبل کے پلانٹ پر کام کرنے والے افراد بھی اس یقین کے حامل تھے کہ ان کے پلانٹ میں کسی حادثے کا امکان نہیں۔ انہوں نے ایک چھوٹا سا ٹیسٹ لیتے ہوئے اس کے جملہ نتائج تک رسائی حاصل کرنے کی خاطر جان بوجھ کر یکے بعد دیگرے حفاظتی نظام بند کر دیئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب پلانٹ میں نصب شدہ آلات خطرے کی نشانیاں ظاہر کرنے لگے تو صورتِ حال قابو سے باہر ہو چکی تھی۔

اس باب میں ہم ''سرکلر استدلال'' کے عنوان کے تحت اس قسم کے رویے سے پیدا ہونے والے ایک اور حادثے کا ذکر کریں گے۔ یہ حادثہ امریکی خلائی شٹل چیلنجر کے دوران پرواز پھٹ جانے کی صورت میں رونما ہوا تھا اور اس میں سات خلابازوں کو زندگی سے ہاتھ دھونے پڑے تھے۔

اس قسم کے واقعات رونما ہونے پر کارکنوں کی بے احتیاطی کی مذمت کرنا بہت آسان ہے۔ لیکن اگر ہم ان کی جگہ ہوتے تو کیا ہمارا رویہ مختلف ہوتا؟ یہ رویہ کہ ''پہلے کبھی کوی خرابی نہیں ہوئی''۔ اکثر لوگوں کو متاثر کرتا ہے۔ شاید ہم بھی اس کی زد میں آ جاتے۔

خیر' اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جب کوئی بڑا حادثہ رونما ہوتا ہے تو پھر یہ رویہ بھی عیاں ہو جاتا ہے۔ تب مستقبل میں اس قسم کے حادثوں کی روک تھام کے لیے اقدامات شروع ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ تھری مائل آئی لینڈ کے حادثے کے بعد نیوکلیئر ریگولیٹری کمیشن

کو بھی فوراً اپنی ذمہ داریاں یاد آ گئیں اور اس نے ایٹمی توانائی کے تمام سول مراکز کے لیے حفاظتی اقدامات کے ایسے قواعد بنائے کہ ایٹمی توانائی کی قیمتوں میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا۔ اس وقت بہت سے ری ایکٹرز زیرِ تعمیر تھے۔ تاہم ایٹمی توانائی کی قیمتوں میں بے تحاشا اضافہ کے سبب نئی ایٹمی تنصیبات معاشی نقطہ نظر سے مفید نہ رہیں اور انہیں ادھورا چھوڑ دیا گیا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ تھری مائل آئی لینڈ کے حادثے نے ایٹمی توانائی کی صنعت کو تباہ کر دیا۔

تاہم ایٹم بم تیار کرنے والے ان سترہ ایٹمی مراکز نے اس سبق سے کوئی اثر نہ لیا جن کو کنٹریکٹر چلاتے تھے اور جو امریکی حکومت کی ملکیت تھے۔ نیوکلیر ریگولیٹری کمیشن کا ان پر کوئی اختیار نہ تھا۔ یہ مراکز شعبہ توانائی کے ماتحت ہیں جس نے تھری مائل آئی لینڈ کے حادثے سے حاصل ہونے والے سبق پر کوئی توجہ نہ دی۔

یہ حادثہ ۱۹۷۹ء میں ہوا تھا۔ اس کے دس سال بعد تک ایٹم بم بنانے کے مراکز اس قدر بے احتیاطی سے چلائے جاتے رہے کہ زیادہ تر حفاظتی اسباب کے پیشِ نظر ان میں سے اکثر مراکز کو ۱۹۸۹ء میں بند کر دیا گیا۔ ان مراکز میں ریکارڈ رکھنے کا نظام اس قدر فضول تھا کہ کسی کو یہ بھی معلوم نہیں کہ ریاست کولوریڈو میں ڈینور کے مقام پر واقع راکی فلیٹس کے ایٹمی مرکز میں آگ لگنے کے دو بڑے واقعات کے دوران کس قدر تابکاری آلودگی شہری علاقوں میں پھیلی تھی۔ تیس پونڈ پلاٹینم خاصی خطرناک مقدار ہے۔ لیکن اس کا کوئی حساب کتاب راکی فلیٹس کے مرکز میں موجود نہیں۔ خدشہ ہے کہ یہ سارا پلاٹینم ہوا میں خارج ہو گیا ہو گا۔

اکثر ایٹمی مراکز کے گرد و پیش کے علاقوں میں تابکاری آلودگی کی سطح بہت بلند ہوتی ہے۔ ان مراکز کے گرد و نواح میں رہنے والے لوگوں نے اموات اور جائیداد کو نقصان پہنچنے کے سلسلے میں امریکی عدالتوں میں بہت سے مقدمات درج کروا رکھے ہیں۔ حکومت کا اندازہ یہ ہے کہ ان سترہ ایٹمی مراکز کی صفائی پر دو سو ارب ڈالر خرچ ہوں گے۔ تاہم اس قسم کے تخمینے عموماً اصل لاگت سے بہت کم ہوا کرتے ہیں۔

خیر، رویے محض حادثوں کا سبب ہی نہیں بنتے، وہ کئی طریقوں سے ہماری سوچ پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ روزمرہ کے معاملات میں بھی ان کا دخل ہوتا ہے۔ اگلے سیکشن میں

ہم اس موضوع پر گفتگو کریں گے۔

رویے اور بند ذہن

ہم سب کو بے شمار ذاتی تجربے ہوتے ہیں جن کی جڑیں ہمارے سماجی، تعلیمی، ثقافتی، سیاسی اور دیگر متعلقہ حالات میں پیوست ہوتی ہیں۔ یہ تجربات ہماری اعتقادات اور اقدار...... یعنی اچھائی برائی اور خیر و شر کے بارے میں ہمارے تصورات...... کو متاثر کرتے ہیں۔ بلوغت تک پہنچتے پہنچتے ہمارے ذہن سوچ کے ایسے اندازوں پر راسخ ہو جاتے ہیں جو نئے حالات اور تغیر پذیر صورتِ حالوں سے متعلق ہمارے ردِعملوں کو متاثر کرتے ہیں۔ یہ رویے اس امر کا تعین کرتے ہیں کہ کون سی چیزیں ہمارے نزدیک اہم ہیں، ہمیں کیا پڑھانا یا سننا چاہیے کس شے کو نظر انداز کرنا چاہیے چونکہ ہم گرد و پیش رونما ہونے والے تمام واقعات پر توجہ نہیں دے سکتے، اس لیے ہمارے ذہن چند مشاہدات اور حقائق کو چن لیتے ہیں اور باقی باتوں کو ہمارے ذہن سے، ہماری شعوری آگاہی سے خارج کر دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم وہی کچھ دیکھتے یا سنتے ہیں جو ہم لاشعوری طور پر دیکھنا یا سننا چاہتے ہیں اور ان حقائق یا مشاہدات پر کم ہی توجہ دیتے ہیں جو غیر اہم قرار پاتے ہوئے پہلے ہی مسترد ہو جاتے ہیں۔

رویے ہمارے تمام کاموں کو متاثر کرتے ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ وہ مضبوط تر ہوتے جاتے ہیں کیونکہ ہم ایسے حقائق کو منتخب کرتے رہتے ہیں جو ہمارے پسندیدہ خیالات کو تقویت دیتے ہیں اور جن کے ساتھ ہم آسانی محسوس کرتے ہیں۔ ہم ان حقائق اور تجربات کو مسترد کرتے رہتے ہیں جو ہمارے ناپسندیدہ خیالات کی تائید کرنے والے ہوتے ہیں۔ اس لیے یہ کوئی حیرت کی بات نہیں کہ ہم ایسے افراد کو دوست بنانا چاہتے ہیں جو ہمارے ہم خیال ہوتے ہیں۔ چونکہ ہم ان افراد، گروہوں اور تاریخی واقعات کو اچھا سمجھتے ہیں جو ہمارے خیالات کی تائید کرنے والے ہوں، اس لیے ان افراد، گروہوں اور تاریخی واقعات کے بارے میں ہمارے خیالات انتہائی مسخ شدہ ہو سکتے ہیں جن کو ہم اچھا نہیں سمجھتے۔

حقائق کو منتخب کرنے اور مسترد کرنے کا یہ عمل ناگزیر ہے۔ اصل میں تو یہ انسانی فکری کی اساس ہے۔ لیکن اگر ہم یہ جان لیں کہ ذہنی رویے سوچ کو مسخ کر سکتے ہیں تو پھر محدود اور یک طرفہ فیصلوں سے پیدا ہونے والے مسائل کو کم کیا جا سکتا ہے۔

بلاشبہ بعض رویے ہمارے ذہنی ڈھانچے میں اہم وظائف ادا کرتے ہیں۔ مثال یوں دی جا سکتی ہے کہ جس دنیا میں ہم رہتے ہیں' وہ ایک خطرناک دنیا ہے جہاں ہمیں قدم قدم پر خطرات کا خدشہ رہتا ہے۔ لیکن اگر ہم ہر امکانی خطرے سے پریشان ہونے لگیں تو زندگی میں کوئی کام ہی نہ کر سکیں گے۔ ماضی کا تجربہ ہمیں سکھاتا ہے کہ بعض امکانی خطرات کا ہم بارہا سامنا کرتے ہیں اور ہمیں ان سے کوئی نقصان نہیں پہنچتا تو پھر ہمارے ذہن ان کے بارے میں پریشان ہونا چھوڑ دیتے ہیں۔ پھر کبھی کبھی یوں ہوتا ہے کہ جب ہم کسی خطرے سے بے پرواہ ہو جاتے ہیں تو کوئی حادثہ رونما ہوتا ہے اور ہم پھر سے تشویش کا شکار ہو جاتے ہیں۔

بڑی شاہراہوں میں کئی بارے یوں ہوتا ہے کہ کوئی ایک موٹر حادثے کا شکار ہوتی ہے اور پچھلے آنے والی کئی موٹریں بھی ٹکرا جاتی ہیں۔ ڈرائیوروں کو بارہا اس امر کی تنبیہ کی جاتی ہے کہ وہ آگے جانے والی موٹر سے کسی قدر فاصلے پر اپنی موٹر رکھیں۔ لیکن اکثر ڈرائیور اس بنیادی قاعدے کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اگلی موٹر کسی حادثے کا شکار ہو تو وہ اپنی موٹر کو کنٹرول کرنے میں ناکام رہتے ہیں اور ان کی موٹر اگلی موٹر سے جا ٹکراتی ہے۔ ایسے ڈرائیور اس جانے پہنچانے خطرے کو اس لیے نظر انداز کر دیتے ہیں کہ متعلقہ اصول کی بارہا خلاف ورزی کے باوجود ان کو پہلے کوئی حادثہ پیش نہیں آیا ہوتا۔ یوں وہ سمجھنے لگتے ہیں کہ یہ اصول بس ایک بوجھ ہی ہے جس پر عمل کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ نوجوان عموماً اس قسم کے حادثوں سے دوچار ہوتے ہیں اس لیے نوجوانوں کے انشورنس ریٹ زیادہ ہوتے ہیں۔

آپ کے رویے کیسے ہیں؟ کیا آپ حد رفتار سے بہت زیادہ تیزی سے موٹر چلاتے ہیں؟ کیا آپ محض چکھنے کی خاطر تھوڑی سی کوکین استعمال کرتے ہیں' گو کہ آپ کو معلوم ہے کہ آپ نہ سہی لیکن بعض دوسرے لوگ فوری طور پر اس کے عادی ہو سکتے ہیں؟ کیا آپ ڈبیا پر درج وارننگ کے باوجود سگریٹ پیتے ہیں؟ اگر ایسا ہے تو خبردار رہیے۔

آپ کا (ایسا رویہ) ایسی عادت بن سکتی ہے جو مشکلات کا باعث ہو گی۔ اس قسم کی تمام عادتیں، تمام رویے ان سے مختلف نہیں ہیں جو انسان کے پیدا کردہ بڑے بڑے مصائب کا سبب بنتے رہتے ہیں۔

بہرطور ہمیں یہ حقیقت یاد رکھنی چاہیے کہ اس قسم کی عادتیں اور رویے ہمیں محض یہ احساس نہیں دیتے کہ ہم محفوظ ہیں اور کوئی خطرہ درپیش نہیں ہے۔ ان کا اطلاق کم وبیش خیالات اور آراء کے سبھی شعبوں پر ہوتا ہے۔ ہم مانوس رشتوں اور واقعات کے اس قدر عادی ہو جاتے ہیں کہ ہم کو امید ہوتی ہے کہ وہ ہمیشہ یونہی ہوتے رہیں گے۔ یوں جب تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں تو ہم ان کو خوش دلی کے ساتھ قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ تبدیلیاں ہمیں سوگوار کر دیتی ہیں۔

نتائج کی طرف چھلانگیں

ستمبر کے ایک دن کا قصہ ہے کہ سڈ نیو مین کو سکول سے نکلتے ہوئے یاد آیا کہ وہ اپنی نوٹ بک ڈیسک پر ہی چھوڑ آیا ہے۔ نوٹ بک لینے وہ واپس گیا تو اس نے دیکھا کہ استانی کا پرس فرش پر گرا ہوا ہے۔ سڈ نیو مین نے پرس اٹھا کر استانی کے ڈیسک پر رکھ دیا۔ اسی لمحے استانی مس ہیرس کمرے میں داخل ہوئیں۔

سڈ کو پرس رکھتے دیکھ کر انہوں نے پوچھا ''یہ میرا پرس تم نے کیوں پکڑ رکھا ہے؟''

''یہ مجھے فرش پر گرا ہوا ملا تھا''

مس ہیرس نے پرس کھول کر دیکھا اور کہنے لگیں ''پانچ ڈالر کا ایک نوٹ غائب ہے۔ اپنا بٹوا دکھاؤ مجھے''۔

سڈ کا رنگ فق ہو گیا۔ اسے یاد آیا کہ اپنی دوست کے لیے کرسمس کا تحفہ خریدنے کے لیے اس نے جو پانچ ڈالر جمع کیے تھے، وہ اس کے بٹوے میں رکھے ہیں۔ اس نے مس ہیرس کو بٹوا دکھانے سے انکار کر دیا۔

''چلو میرے ساتھ پرنسپل کے پاس'' سڈ کو گھورتے ہوئے استانی نے کہا۔ اس کو یقین تھا کہ سڈ نے ہی اس کے پرس سے پانچ ڈالر چرائے ہیں۔

اس کہانی کے کئی مختلف انجام ہو سکتے ہیں۔ تاہم یہاں ہم کو جس بات میں دلچسپی ہے وہ استانی کا طرزِ استدلال ہے۔ وہ اس نتیجے تک چھلانگ لگا رہی تھی کہ سڈ نے ہی پیسے چوری کئے ہیں۔

اچھا تو یہاں ہم لفظ ''چھلانگ'' کیوں استعمال کر رہے ہیں؟ اس لیے کہ تمام حقائق مل کر مس ہیرس کے اخذ کردہ نتیجے کی توثیق نہیں کرتے۔ اس کے استدلال میں مغالطہ اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ اس کے پاس تمام حقائق نہ تھے اور اس نے سڈ کے بیان کو آنکھیں بند کر کے غلط تسلیم کر لیا تھا۔ اس نے اپنی آنکھوں سے سڈ کو چوری کرتے نہ دیکھا تھا۔ اس کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ اس کی غیر موجودگی میں پرس کے ساتھ کیا بیتی تھی، نہ ہی یہ جانتی تھی کہ سڈ نے اپنا بٹوا دکھانے سے کیوں انکار کر دیا تھا۔ البتہ مس ہیرس نے پرس کو سڈ کے ہاتھوں میں ضرور دیکھا تھا۔ اس لحاظ سے اس کے پاس یہ مفروضہ بنانے کا جوز موجود تھا کہ سڈ پیسے چوری کر رہا تھا۔ لیکن چونکہ اس کو تمام حقائق کا علم نہ تھا۔ (مثلاً یہ کہ سڈ کمرے میں کیوں واپس آیا تھا اور یہ کہ پرس اس کے ہاتھ میں کیوں تھا) لہٰذا وہ صرف واقعات شہادت پر انحصار کر رہی تھی۔ بلاشبہ وہ یقین سے نہیں کہہ سکتی تھی کہ اس کا مفروضہ درست ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ہم ملزموں کے ساتھ انصاف کرنا چاہتے ہیں تو پھر ہمیں ''کھلے ذہن'' کی ضرورت ہوگی، یعنی ایسا ذہن جو فیصلہ کرنے سے پہلے حقائق فراہم کرتا ہے اور غیر جانبداری سے ان کا جائزہ لیتا ہے۔

''واقعاتی شہادت'' کی بنیاد پر نتائج کی طرف چھلانگ لگانے کی عادت بے شمار بے گناہ لوگوں کے ساتھ ظلم و زیادتی کا سبب بنتی ہے۔ ولی جونز کی مثال ہی لے لیجئے۔ اس کو ریلوے سٹیشن کے دروازے سے چوری چھپے نکلنے پر گرفتار کیا گیا تھا اور الزام یہ تھا کہ وہ ٹکٹ کے پیسے بچانا چاہتا تھا۔ اس کا نام پولیس کے محکمے کے کمپیوٹر میں داخل کر دیا تھا۔ کمپیوٹر نے یہ اطلاع دی کہ ولی جونز نامی شخص منشیات فروشی کے سلسلے میں پولیس کو مطلوب ہے اور اس کے کوائف یہ ہیں، نام ولی جونز ہے، سیاہ فام ہے، عمر تیس برس کے لگ بھگ ہے، پتلا دبلا ہے۔ قد تقریباً پانچ فٹ دس انچ ہے اور وزن تقریباً ۱۵۰ پونڈ ہے۔ یہ کوائف ریلوے سٹیشن سے پکڑے جانے والے ولی جونز کے کوائف سے ملتے جلتے تھے۔ لہٰذا اس پر

منشیات فروشی کا الزام لگا دیا گیا۔

اب جونز صاحب کا قصہ یہ ہے کہ وہ کنگلے تھے' پیسہ ان کی جیب میں نہ تھا۔ لہٰذا انہیں مفت قانونی امداد مہیا کی گئی۔ مختلف مقامات پر پانچ وکیلوں نے اس کا انٹرویو کیا۔ ان میں جونز صاحب کا موقف یہ تھا کہ پولیس ریکارڈ میں ان کے خلاف جو الزامات درج ہیں' وہ درست نہیں ہیں۔ لیکن پانچوں میں سے کسی ایک وکیل کو بھی اس کی باتوں کا یقین نہ آیا۔ وجہ ظاہر ہے کہ پولیس ریکارڈ میں ملزم کے جو کوائف بیان کیے گئے تھے' وہ ولی جونز پر فٹ آتے تھے۔ اس کے علاوہ وکلاء کے ذہنی رویے اور شاید ان کے تعصّبات بھی جونز کے خلاف کام کر رہے تھے۔ وہ غریب' نادار اور سیاہ فام تھا۔ اس کی ظاہری حالت بھی اچھی نہ تھی۔ اگر وہ خوش پوش' سفید فام اور شائستگی سے گفتگو کرنے والا کوئی شخص ہوتا اور اگر وہ بے کس چوکیدار کے بجائے انجینئر ہوتا تو ایک منٹ میں اس کو جیل سے رہائی مل جاتی۔ خیر' جونز نے وکلاء کے سامنے اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے بہت کچھ کیا' لیکن وہ اس کی بات ماننے پر تیار نہ ہوئے۔ وہ اسے مجرم ہی سمجھتے رہے۔ اس کے وکیل نے یہ تکلیف بھی گوارا نہ کی کہ پولیس سے جونز کی شناخت کی تصدیق کروالیتا۔

مقدمہ شروع ہونے سے صرف ایک روز پہلے یہ ہوا کہ ایک وکیل سے جونز کے فنگر پرنٹس کا موازنہ فائل پر درج فنگر پرنٹس سے کرنے کے لیے کہا۔ یوں جب دونوں فنگر پرنٹس کا موازنہ کیا گیا تو فوراً ہی معلوم ہو گیا کہ پولیس نے غلط ولی جونز کو قابو کر رکھا ہے۔

اکثر اوقات اہم حقائق کی عدم موجودگی میں ہی فیصلے کرنے پڑتے ہیں۔ لیکن جب ہمیں تمام حقائق کے دستیاب ہونے کا یقین نہ ہو تو پھر ہمیں اپنے فیصلوں کے غلط ہونے کا امکان ذہن میں رکھنا چاہیے۔ ہمیں اپنے ذہن کو کھلا رکھنا چاہیے اور نامعلوم حقائق کی جستجو جاری رکھنی چاہیے جو ممکن ہے کہ ہمارے غیر حتمی نتائج کو بدل دیں۔

غلط فہمیاں

سکول بورڈ کے ایک رکن کو بورڈ کے دیگر ارکان بتاتے ہیں کہ اس کے نزدیک ان کے ڈسٹرکٹ میں طالبِ علموں کی بڑی بڑی خامیاں کیا ہیں۔ ان میں سے ایک کمزوری یہ ہے کہ ریاضی کے امتحان میں لگ بھگ پچاس فی صد طلبہ نے ''اوسط'' درجے سے بھی کم

نمبر حاصل کئے تھے۔ رکن نے اپنی بحث سے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ شہر کے طلبہ کی کارکردگی غیر تسلی بخش ہے۔

لگتا ہے کہ بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح سکول بورڈ کے اس رکن کا ''اوسط'' کا تصور واضح نہیں تھا۔ امر واقعہ یہ ہے کہ اگر پچاس فی صد ''اوسط سے کم تر'' ہیں تو باقی پچاس فی صد ''اوسط سے برتر'' ہیں۔ چنانچہ اگر بورڈ کا کوئی رکن رجائیت پسند ہوتا تو وہ طالب علموں کی صورت حال کو یاں بیان کرتا کہ ''ہمارے شہر کے پچاس فی صد طالب علم ریاضی میں' اوسط سے برتر' ہیں''۔ اصل میں یہ وہی معاملہ ہے کہ پانی سے آدھے بھرے ہوئے گلاس کو دیکھ کر آپ کہہ سکتے ہیں کہ ''آدھا گلاس خالی ہے'' اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ''آدھا گلاس بھرا ہوا ہے۔''

غلط فہمیوں کے بہت سے روپ ہوتے ہیں۔ اکثر اوقات غلط خیالات' غلط آرا اور غلط فہمیوں کے پیچھے غلط فہمیاں بھی کرم کر رہی ہوتی ہیں۔ نویں باب میں ہم نے بعض خاص قسم کی غلط فہمیوں پر بحث کی ہے۔

یہاں ایک بات پیشِ نظر ہے کہ سکول بورڈ کے ارکان کے جس اجلاس کا خاکہ یہاں پیش کیا گیا ہے اس کے تمام ارکان سفید فام مرد دکھائی دے رہے ہیں۔ گویا کانے سے اس عام غلط فہمی کی توثیق ہو رہی ہے کہ یہ صاحبان عورتوں یا سیاہ فام شہریوں کے مقابلے میں زیادہ دانا اور ذمے دار ہیں۔ لہٰذا تعلیم جیسے بہت اہم عوامی معاملے پر صرف ان کی رائے اہم ہو سکتی ہے۔

مغالطہ آمیز تعمیمات

چوتھے بات میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ دنیا کے بارے میں علم استقرائی استدلال کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔ اس طرزِ استدلال میں ہم انفرادی مشاہدوں سے تعمیمات مرتب کرتے ہیں جو ہمارے استدلال کے لیے واقعاتی بنیاد مہیا کرتی ہیں۔ اس طریقے سے جو عمومی حقائق حاصل ہوتے ہیں' ان کو ہم استخراجی استدلال کے مقدمات کے طور پر بروئے کار لاتے ہیں۔ یوں مزید معلومات مہیا کرنے والے نتائج تک رسائی حاصل ہوتی ہے۔

تاہم اکثر اوقات تعمیمات نامناسب طریقے سے بنائی جاتی ہیں اور وہ ہمیں ناقص حقائق فراہم کرتی ہیں۔عموماً ہمارے پاس اتنے مشاہدات نہیں ہوتے جتنے موزوں تعمیم سازی کے لیے درکار ہوتے ہیں۔اس لیے بہت سی مستثنیات کی گنجائش پیدا ہو جاتی ہے۔اکثر یوں ہوتا ہے کہ تعصب کے سبب لوگ بے جا طور پر بعض مشاہدات کو منتخب کر لیتے ہیں اور دوسرے مشاہدات کو لاشعوری طور پر مسترد کر دیتے ہیں۔(یہ معاملہ نویں باب میں زیرِ بحث آئے گا) پھر یہ بھی ہوتا ہے کہ لوگ گپ اور افواہ کو حقیقت سمجھ لیتے ہیں۔

اس قسم کی غلط تعمیمات کو جب استخراجی استدلال میں مقدمات کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے تو غلط نتائج سامنے آتے ہیں۔ درج ذیل بحث استدلال کے اس مغالطے کی وضاحت کرتی ہے۔

''قیصر میاں ذرا اس لڑکے پر نظر رکھنا جو تمہارے بھتیجے سہیل کے ساتھ آیا ہے۔ اس کا نام رشید ہے موقع پا کر وہ تمہارا بٹوا لے اڑے گا۔''

''واقعی؟ تمہیں کیسے پتہ چلا؟''

''بھئی وہ ریلوے لائن کے پار اچکوں کے محلے میں رہتا ہے۔سب کو پتہ ہے کہ یہ اٹھائی گیرے ہیں''۔

اس گفتگو میں جو استدلال پیش کیا گیا ہے اس کو منطقی قیاس کی صورت میں یوں بیان کیا جاسکتا ہے:

پہلا مقدمہ: ریلوے لائن کے پار اچکوں کے محلے میں رہنے والے اٹھائی گیرے ہیں۔

دوسرا مقدمہ: رشید اس محلے میں رہتا ہے۔

نتیجہ: اس لیے رشید اٹھائی گیرا ہے (لہٰذا اپنے بٹوے پر نظر رکھئے)

اب اس میں دیکھئے کہ پہلا مقدمہ ایسی تعمیم ہے جس کا اطلاق ہم کسی بستی کے تمام بلکہ اکثر مکینوں پر بھی نہیں کر سکتے۔یعنی ہم بجا طور پر یہ نہیں کہہ سکتے کہ فلاں بستی کے رہنے والے تمام یا اکثر لوگ چور، ٹھگ اور اٹھائی گیرے ہیں۔اس قسم کے بیان غالباً وہ لوگ دیتے ہیں جو اخباروں میں کسی بستی میں جرائم کی بھرمار کے بارے میں خبریں پڑھتے رہتے ہیں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس بستی کے کسی شخص نے انہیں دھوکہ دیا ہو یا انکے کسی

دوست کو لوٹا ہو۔ یہ بات بھی درست ہو سکتی ہے کہ کسی بستی میں جرائم کی شرح گرد و نواح کے علاقوں کی نسبت زیادہ ہو۔ لیکن ان ساری باتوں سے درست طور پر یہ نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا کہ وہاں کے سارے مکین ہی جرائم پیشہ ہیں۔

فرض کیجئے کہ کسی بستی کے دس مکینوں میں سے ایک چور ہے۔ اس لحاظ سے وہاں جرائم کی شرح بہت زیادہ ہو جائے گی اور بستی کے باسیوں کے لیے زندگی بہت دشوار ہو جائے گی۔ وہاں آنا جانا خطرناک ہو جائے گا۔ اس کے باوجود بستی کے دس میں سے نو مکین چور نہ ہوں گے۔ یوں مندرجہ بالا منطقی قیاس کا پہلا مقدمہ درست نہ ہو گا۔ اس میں تمام لوگوں کے بارے میں بیان دیتے ہوئے احتیاط سے کام نہیں لیا گیا۔ اس میں ایک ایسی بات کہی گئی ہے جو ریلوے لائن کے پار رہنے والے بعض لوگوں ے بارے میں درست ہو گی۔ لیکن وہاں کے تمام لوگوں کے بارے میں درست نہیں ہو سکتی۔

اس مغالطہ آمیز استدلال کو ہم حقائق کو نظر انداز کر کے تعصب' لاعلمی یا بے احتیاطی سے عمومی کلئے تیار کرنے کا نام دے سکتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو تعمیم تیار کی گئی ہے' وہ درست نہیں ہے کیونکہ اس کا اطلاق اس کی جائز حدود سے باہر تک کیا گیا ہے۔ چنانچہ اس سے جو نتائج اخذ کئے جائیں گے وہ غلط اور گمراہ کن ہو سکتے ہیں۔

بے احتیاطی سے اخذ کر جانے والی تعمیمات بہت سی غلط فہمیوں کو جنم دیتی ہیں۔ خاص طور پر جب ہم مختلف گروہوں' افراد اور اہم مسائل کے معاملے میں اس بے احتیاطی سے کام لیتے ہیں تو گوناگوں غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اس لیے جب لوگ دوسروں پر نکتہ چینی کریں تو ان ک یبات غور سے سنئے اور یہ دیکھئے کہ آیا جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں' اس کی بنیاد حقائق پر ہے؟

بے احتیاطی سے اخذ کی جانے والی تعمیمات تعصب سے پیدا ہوتی ہیں یا پھر تعصب کا باعث بن جاتی ہیں۔ پھر وہ بے انصافی' فساد اور انسانی مصائب کو جنم دیتی ہیں۔ (اس سلسلے میں نواں باب بھی ملاحظہ کیجئے۔)

شہادت اور ثبوت

بہت سے لوگ غلطی سے شہادت کو ثبوت سمجھ لیتے ہیں۔ حالانکہ ان دونوں میں

فرق ہے۔ اس فرق کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔ اس امر کی وضاحت کے لیے مندرجہ ذیل استدلال پر توجہ فرمائیے:

جمیل: حمید چور ہے۔

سلیم: بالکل غلط۔ ثابت کیجئے

جمیل: بھئی اس وقت بھی اس پر ایک ڈرگ سٹور سے پیسے چرانے کا مقدمہ چل رہا ہے۔

یہ بات سن کر جمیل صاحب سے اتفاق کرنا اور حمید کو چور قرار دینا جائز نہ ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس امر کی کوئی شہادت موجود ہے کہ حمید چور ہے۔ جس شے کو ہم شہادت قرار دیتے ہیں وہ کوئی مشاہدہ یا واقعہ ہے کو کسی نتیجے، فیصلے یا تعمیم کی تائید میں استعمال کیا جاتا ہے۔ دوسری طرف ہم کسی ثبوت کو اس وقت تک معقول قرار نہیں دے سکتے جب تک اس کے حق میں قائل کرنے والی شہادتیں میسر نہ آ جائیں۔ اس کے باوجود ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ عملی زندگی میں ایسا ثبوت شاذونادر ہی ملتا ہے جو مکمل یقین پیدا کرنے کی اہلیت رکھتا ہو۔ روزمرہ کی زندگی میں ثبوت اور شہادت کے فرق کو عموماً نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ لوگ اپنے پسندیدہ عقائد و خیالات کے حق میں تھوڑی بہت شہادت ملنے پر اسے ثبوت کا درجہ دے دیتے ہیں اور اپنے نقطہ نظر کو غلط ثابت کرنے والی شہادت کو وہ نظرانداز کر دیتے ہیں۔

حمید کے خلاف اگر چوری کے الزام میں مقدمہ چل رہا ہے تو ہم اس حقیقت کو ایک مفروضے کی شہادت کے طور پر قبول کر سکتے ہیں اور جائز طور پر یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ چور ہوگا۔ اب اگر عدالت میں اس کے خلاف چوری کا الزام ثابت ہو جاتا ہے اور اس کو سزا دی جاتی ہے تو اکثر لوگوں کے نزدیک یہ بات اس امر کا ثبوت ہوگی کہ حمید چور ہے۔ لیکن یہ بھی ہو تو ہو سکتا ہے کہ حمید کسی اور کی آڑ میں قابو آ گیا ہو یا وہ عدالت میں اپنا کیس مناسب طور پر پیش نہ کر سکا ہو۔ بہر طور محض مقدمے کو ہم حمید کے جرم کا ثبوت قرار نہیں دے سکتے۔ ساری دنیا میں امر کی بے شمار مثالیں موجود ہیں ہ بے گناہ لوگوں پر مقدمے چلتے ہیں، انہیں سزائیں ہو جاتی ہیں۔ بے گناہ اس دنیا میں پھانسی پر بھی چڑھا دیئے جاتے ہیں۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ عدالتیں انصاف سے کام نہیں لیتیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ کسی ملزم کے خلاف ''حتمی'' ثبوت ملنے پر ہی اسے مجرم ٹھہراتی ہیں۔ اس کے باوجود کبھی کبھار یوں بھی ہوتا ہے کہ جج صاحبان نتائج کی طرف ''چھلانگ'' لگا دیتے ہیں اور بے گناہوں کو سزا دے دیتے ہیں۔ پولیس بھی بسا اوقات اپنے تعصبّات اور مفادات کے حوالے سے کسی ملزم کو سزا دلوانے پر تل جاتی ہے۔ یوں ایسی ''شہادتیں'' میسر آ جاتی ہیں جو ملزم کے خلاف جاتی ہیں۔

امریکہ میں اس موضوع پر تحقیق کی گئی تھی۔ اس تحقیق میں یہ بتایا گیا ہے کہ کم از کم ۳۴۳ ایسے افراد ہیں جو بے گناہ تھے لیکن وہ عدالتوں میں قتل کے مجرم قرار پائے۔ ان بے گناہ لوگوں میں سے ۲۵ کو موت کی سزا دی گئی۔ ان بدقسمت افراد کے معاملے میں شہادت زیادہ تر حالات پر مبنی تھی۔ خیر، ہم حتمی طور پر یہ نہیں کہہ سکتے کہ امریکہ میں سزا پانے والے بے گناہوں کی تعداد محض ۳۴۳ ہے۔ ممکن ہے کہ زیادہ تحقیق سے ایسے اور افراد بھی سامنے آ جائیں۔ آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اگر امریکہ میں یہ حال ہے جہاں پولیس، قانون اور عدالتوں کا نظام بہت ترقی یافتہ ہے، تو پھر ہمارے ملک میں صورتِ حال کیا ہو گی جہاں ان محکموں میں رشوت کا عام چلن ہے اور جہاں یہ تینوں ادارے پسماندہ ہیں اور ان کے پاس وسائل بھی بہت کم ہیں۔

لوگوں کو بسا اوقات ان تعمیمی حقائق کی صداقت کا پورا یقین ہوتا ہے جو عمر بھر کے مشاہدے کی شہادت پر مبنی ہوتے ہیں۔ لیکن بعد ازاں وہ غلط ثابت ہو جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ۱۳۰۰ عیسوی میں اس بات کو یقینی حقیقت سمجھا جاتا تھا کہ زمین چپٹی ہے اور سورج روزانہ اس کے گرد چکر لگاتا ہے۔ اب یہ بات دیو مالائی کہانی معلوم ہوتی ہے۔ خیر یہ تو پرانی بات ہے۔ صرف ایک صدی پہلے تک دنیا میں ہر جگہ یہ یقین پایا جاتا تھا کہ عورتیں ذہین اعتبار سے مردوں سے کمتر ہوتی ہیں اور وہ کوئی مردانہ کام نہیں کر سکتیں۔ ہمارے ہاں آج بھی بہت سے لوگ اس بوسیدہ عقیدے پر یقین رکھتے ہیں۔ لیکن اس صدی کے دوران دنیا بھر میں عورتوں نے بے مثال ترقی کی ہے۔ وہ اجتماعی زندگی کے بہت سے شعبوں میں آگے بڑھی ہیں اور اب وہ کم و بیش ہر جگہ مردوں کا مقابلہ کر رہی ہیں۔ اس طرح انہوں نے اپنی پیش قدمی کے ذریعے مردوں سے کمتر ہونے کے تصور کی دھجیاں بکھیر

دی ہیں۔

اس قسم کے عقیدے عموماً اپنے آپ کو درست ثابت کرنے کا ماحول بنا دیتے ہیں۔ کیونکہ ہوتا یہ ہے کہ ان عقیدوں کے سبب لوگوں کا طرزِ عمل ہی ایسا ہو جاتا ہے کہ جن سے یہ عقیدے درست محسوس ہونے لگتے ہیں۔ چنانچہ عورتوں کو چونکہ مردوں سے کمتر سمجھا جاتا تھا اس لیے لڑکیوں کی تعلیم وتربیت پر لڑکوں جتنی توجہ دینے کا جواز نہ رہا تھا۔ انہیں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے یا کسی شعبے میں مہارت حاصل کرنے کے مواقع سے محروم رکھا جاتا تھا۔ ان کی زندگی کو چار دیواری تک محدود کرایا جاتا تھا۔ یوں ایسا اجتماعی ماحول بن گیا تھا جن میں عورتوں کو اپنی فطری صلاحیتوں کے اظہار کے مواقع حاصل نہ تھے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت حال میں عورتیں زندگی کی دوڑ میں مردوں سے بہت پیچھے رہ گئیں۔ ان کی پسماندگی کو اس امر کا ثبوت قرار دیے دیا گیا کہ وہ مردوں سے کمتر ہیں۔ یہ ہے اصل ستم ظریفی۔

شہادت کس قدر قابلِ اعتماد ہے؟

ٹیلی وژن اور فلموں کے باعث ہم پولیس کے اس طریقہ کار سے واقف ہیں کہ ملزموں کی شناخت کے لیے مشتبہ افراد کو ایک قطار میں کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ پھر جرم کے عینی شاہدوں سے کہا جاتا ہے کہ وہ ان افراد میں سے ملزموں کی نشاندہی کریں۔ تھانے کی بولی میں اس عمل کو ''شناخت پریڈ'' کا نام دیا جاتا ہے۔ بظاہر یہ طریقہ کار معقول ہے اور اس سے ملزموں تک رسائی حاصل کرنے میں مدد ملنی چاہیے۔ تاہم ماہرِ نفسیات' اے دانیال یارمے کو اس بات سے اتفاق نہیں۔ انہوں نے اس معاملے کی باقاعدہ تحقیق کی ہے اور اس نتیجے تک پہنچے ہیں کہ شناخت پریڈوں میں عموماً بے گناہ لوگ ملزم قرار پاتے ہیں۔ شاید اسی وجہ سے ترقی یافتہ ملکوں میں کسی ایک ایک عینی شاہد کی طرف سے نشاندہی پر کسی مشتبہ فرد کو ملزم یا بے گناہ قرار نہیں دیا جاتا۔

کسی واقعہ کے عینی شاہدوں میں کئی وجوہ سے مغالطے پیدا ہو سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں بہت سی باتوں کا انحصار حالات پر ہوتا ہے۔ شناساؤں کے مقابلے میں اجنبیوں کو شناخت کرنا دشوار ہوتا ہے۔ اسی طرح اپنی نسلی گروہ کے افراد کے مقابلے میں دوسرے

گروہوں کے افراد کی نشاندہی بہت مشکل ہوتی ہے۔ جب کوئی جرم سرزد ہوتا ہے تو عینی شاہدوں کو مجرم کو اچھی طرح سے دیکھنے کا موقع کم ہی ملتا ہے۔ یہ بھی ہے کہ جرم کو دیکھنے والے لوگ اشتعال اور ہیجان کا شکار ہو جاتے ہیں اور اس کیفیت میں وہ جرم کی تفصیلات کو اچھی طرح نہیں دیکھ سکتے۔ چنانچہ بعد ازاں جب پولیس انہیں مختلف مشتبہ افراد میں سے مجرموں کو منتخب کرنے یا مشتبہ افراد کی تصاویر دیکھ کر مجرموں کی نشاندہی کرنے کو کہتی ہے تو وہ کنفیوژ ہو جاتے ہیں۔ عام لوگوں کی یادداشت عموماً اچھی نہیں ہوتی اور تصاویر کے معاملے میں تو یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ تصاویر ہمیشہ اصلی چہروں سے مختلف ہوا کرتی ہیں۔

ملزموں کی شناخت میں پولیس جو رویہ اختیار کرتی ہے اس کا اثر مقدمے پر بھی پڑتا ہے۔ بہرطور کسی عینی شاہد کے ذریعے ملزم کا تعین کوئی اچھا طریقہ کار نہیں ہے۔ جب کسی شخص پر الزام لگ جاتا ہے تو ذہنی طور پر تذبذب کے شکار گواہ اپنی خفت مٹانے یا اپنے آپ کو چاق و چوبند ثابت کرنے کے لیے سارا الزام ملزم پر دھر دیتے ہیں۔ مشتبہ افراد کی شناخت پریڈ میں سے کسی ایک کو ملزم کے طور پر منتخب کرنے کا انحصار عموماً اس کے لباس، پریڈ میں شریک دیگر افراد کی ظاہری حالت اور کئی دوسری باتوں پر ہوتا ہے۔ اس طریقہ کار کو معقول اور معروضی قرار دینا بے حد دشوار ہے۔

مدرسوں میں اساتذہ نے ایسے کھیل سٹیج کئے ہیں جن میں گواہوں کے ناقابلِ اعتماد ہونے کی وضاحت کی گئی ہے۔ ایسے ہی ایک کھیل میں ایک طالب علم بھاگ کر کلاس روم میں جاتا ہے اور یوں ظاہر کرتا ہے کہ جیسے اس نے دوسرے طالب علم کو گھونسا مارا ہے۔ پھر وہ اونچی آواز پیدا کرنے کے لیے کوئی شے فرش پر گراتا ہے اور کمرے سے باہر بھاگ جاتا ہے۔ کلاس روم میں بیٹھے ہوئے طالب علم حیران ہو جاتے ہیں۔ پھر ان سے پوچھا جاتا ہے کہ انہوں نے کیا دیکھا ہے۔ جو کچھ وہ بتاتے ہیں وہ ایک دوسرے کے بیان سے بہت مختلف ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ بعض طالبِ علم یہ بھی کہتے ہیں کہ انہوں نے گولی چلنے کی آواز سنی تھی۔ حالانکہ، جیسا کہ ہم نے کہا، کلاس روم میں آواز پیدا کرنے کے لیے محض کوئی شے گرائی گئی تھی۔ چنانچہ یہ امر بالکل واضح ہے کہ گواہوں کے بیان کے ذریعے ہم کسی واقعہ کو صحیح طور پر سمجھنے میں مشکلات کا شکار ہو سکتے ہیں۔

دوری استدلال

استدلال میں ایک عام مغالطہ یہ ہے کہ جس بیان کو درست ثابت کرنا ہوتا ہے اس کو ہم ایک نئی شکل دیتے ہیں اور اس نئی شکل کو (جو اصل میں پہلے بیان جیسا ہی ہوتا ہے) اس امر کے 'ثبوت' کے طور پر استعمال کرتے ہیں کہ پہلا بیان اصل میں درست ہے۔ گویا ایک بیان کی نئی شکل تیار کر کے اس کو اصل بیان کے ثبوت کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اس طرزِ استدلال کو دوری یا سرکلر استدلال کا نام دیا جاتا ہے۔ اس کی ایک مثال حسبِ ذیل ہے:

اقصیٰ: آمدنی پر ٹیکس سب لوگوں کے مفاد میں ہوتا ہے۔

سونیا: وہ کیسے؟

اقصیٰ: یوں کہ آمدنی پر ٹیکس آخر کار تمام شہروں کے مفاد میں ہے۔

یہاں ہم غور کریں تو دیکھیں گے کہ اقصیٰ نے اپنی دلیل کے حق میں کوئی حقیقی شہادت پیش نہیں کی۔ اس نے اپنے پہلے بیان کو ذرا مختلف لفظوں میں بیان کر دیا ہے۔ گویا ایک ہی بیان کو اس نے لفظوں کے ہیر پھیر کے ساتھ دہرایا ہے۔ ایک اور مثال دیکھئے:

استاد: سورج اس قدر روشنی کیوں دیتا ہے؟

فراز: اس لیے کہ وہ چمکتا ہے

استاد: اچھا تو سورج چمکتا کیوں ہے؟

فراز: وہ اس لیے چمکتا ہے کہ اس میں روشنی بہت ہے۔

اس مکالمے میں استاد کو اس جواب کی توقع تھی کہ ''سورج بہت گرم ہے۔ حرارت کی شدت کے باعث وہ چمکتا ہے اور یوں اس سے روشنی نکلتی ہے''۔ لیکن جواب دینے والے بچے' فراز' کی اپنی منطق ہے۔ وہ 'چمکنے' کو ''اس میں بہت روشنی ہے' سے بدل دیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس نے سورج کی روشنی کی توجیہ کر دی ہے۔ وہ اپنے جملے سے پہلے الفاظ' اس لیے کہ' استعمال کر کے یہ دکھانا چاہتا ہے کہ گویا اس نے 'کیوں' کا جواب دے دیا ہے۔ پھر جب استاد اپنے نکتے کو آگے لے جانا چاہتا ہے تو فراز استاد کے پہلے سوال کے الفاظ دہرا کر جواب دینے سے کنی کتراتا ہے۔

دوری استدلال کی ایک زیادہ پیچیدہ صورت کی ایک اہم مثال کی طرف ڈاکٹر رچرڈ فین مان نے توجہ دلائی تھی۔ ڈاکٹر صاحب امریکہ کے اس صدارتی کمیشن کے رکن تھے جو ۱۹۸۶ء میں چیلنجز نامی خلائی شٹل کی تباہی کے اسباب کی چھان بین کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ اس حادثے میں سات خلاباز ہلاک ہو گئے تھے۔ ڈاکٹر فین مان کا ایک بیان اخبارات میں شائع ہوا تھا جس میں انہوں نے کہا تھا کہ چونکہ شٹل کسی ناکامی کے بغیر کئی بار اڑائی جا چکی تھی' لہٰذا اس امر کو اس بات کی دلیل کے طور پر قبول کر لیا گیا تھا کہ وہ آئندہ بھی حفاظت سے اڑے گی۔ ڈاکٹر صاحب کا کہنا تھا کہ ''اس طرزِ فکر کے سبب بعض واضح خامیوں کو بار بار قبول کیا گیا۔ دوری استدلال کی اس مثال میں بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بار بار کی کامیابی کے باعث ایک رویہ بن چکا تھا جس کو مخالفانہ شہادتوں کے باوجود برقرار رکھا گیا۔ آخر کار وہ المناک حادثے کا سبب بن گیا۔

جھوٹی مشابہتیں

امریکہ میں ایک تیل بردار جہاز کے کپتان اور اس کی بیوی میں طلاق کا مقدمہ عدالت میں تھا۔ مقدمے کے فیصلے کے بارے میں ایک اخبار میں مندرجہ ذیل رپورٹ شائع ہوئی تھی:

کل' جج ٹیلر نے یہ فیصلہ دیا کہ عورت جہاز نہیں ہوتی۔ چونکہ عورت اور جہاز میں فرق ہے' لہٰذا اس نے مسز سٹیو مورلے کو اس کے شوہر رچرڈ مورلے سے طلاق دلوا دی جو ایک آئیل ٹینکر کا کپتان ہے۔ گواہوں کا کہنا تھا کہ مورلے کی ماں نے ایک ڈنر پارٹی میں اپنے بیٹے کو تلقین کی تھی کہ وہ اپنی بیوی کا زیادہ خیال رکھا کرے۔

مورلے کا جواب تھا کہ ''اصل مسئلہ یہ نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ ہر جہاز کا ایک کپتان ہوتا ہے اور اس کا حکم مانا جانا چاہیے''۔

اس کی ماں نے جواب دیا ''تمہاری بیوی عورت ہے' جہاز نہیں ہے''۔

جج صاحب نے اس دلیل سے اتفاق کیا۔

آیئے ہم مورلے صاحب کے بیان کا تجزیہ کریں۔ کسی تمثیل میں یہ فرض کیا جاتا ہے کہ اگر دو چیزیں کسی ایک اعتبار سے مشابہ ہیں تو وہ بعض دوسرے پہلوؤں کے حوالے

سے بھی مشابہ ہوسکتی ہیں۔ بعض لوگ' سکتی ہیں' اور' ہیں' کے درمیان فرق کو محسوس نہیں کر سکتے۔ چنانچہ وہ امکان کو حقیقت سمجھنے لگتے ہیں۔ مورلے صاحب کا قصہ یہ ہے کہ انہوں نے جہاز کو گھر سے تشبیہ دی کیونکہ دونوں پناہ مہیا کرتے ہیں۔ اس مشابہت کی بناء پر انہوں نے یہ دلیل دی کہ اگر جہاز پر ان کا حکم چلتا ہے تو پھر گھر میں بھی میرا حکم بلا چون و چرا مانا جانا چاہیے۔

یہ تمثیل غلط ہے۔ مورلے نے دراصل جہاز اور گھر میں جو اہم فرق ہیں' ان کو نظر انداز کر دیا ہے۔ جہاز کی سلامتی کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ اس کا عملہ کپتان کے احکام پر عمل کرے۔ مشکل حالات میں کپتان فوری اور اہم فیصلہ کرتا ہے اور اس کے فیصلوں پر جہاز کے عملے اور مسافروں کی زندگی کا دارومدار ہوتا ہے۔ گھریلو صورتِ حال اکثر حوالوں سے بہت مختلف ہوتی ہے۔ مثلاً مورلے کی بیوی اس کی شریک حیات ہے' اس کے عملے کی ایک رکن نہیں ہے۔ وہ زندگی کے سفر میں اس کی رفیق ہے۔ اس کو ماتحت نہیں سمجھا جا سکتا۔

مورلے صاحب نے جو یہ تمثیل استعمال کی ہے تو اس سے اکثر لوگ یہ نتیجہ اخذ کریں گے کہ وہ ایسا غلبہ پسند شخص ہے جو دوسروں پر حکم چلانا چاہتا ہے۔ وہ جہاز کے اصولوں کا اطلاق اپنے گھر پر کرنا چاہتا ہے۔ وہ گھر سے جہاز جیسا سلوک کرنا چاہتا ہے۔

بیوی پر حکم چلانے کے جواز میں مورلے بعض دوسری تمثیلوں سے بھی کام لے سکتا تھا۔ مثلاً جہاز کے کپتان کی جگہ کسی فیکٹری کے مینجر کا ذکر ہوسکتا ہے' کیونکہ فیکٹری کا تمام عملہ مینجر کا ماتحت ہوتا ہے۔ مینجر کی حیثیت سے وہ تمام عملے سے کام لیتا ہے۔ لیکن یہاں بھی یاد رکھنے والی بات یہ ہے کہ جس طرح گھر جہاز سے مختلف ہے' اسی طرح وہ فیکٹری سے بھی مختلف ہوتا ہے۔

دوسری طرف مورلے کی بیوی بھی اپنے نقطہ نظر کی تائید میں تمثیلیں ڈھونڈ سکتی تھی۔ مثلاً وہ کہہ سکتی تھی کہ تجارتی شراکت میں دونوں حصے دار مساوی حیثیت رکھتے ہیں۔ خانگی زندگی میں بیوی شریک کار ہوتی ہے' لہٰذا اس کی حیثیت بھی شوہر کے برابر ہونی چاہیے۔

اس قسم کی غیر منطقی تمثیلیں روزمرہ کے استدلال میں مغالطّوں کا بڑا ذریعہ ہیں۔ ماضی میں کسی ماہی گیر کے ہاتھ سٹارفش لگ جاتی تو وہ اس کو کاٹ کر سمندر میں پھینک

دیتا، کیونکہ یہ سمجھا جاتا تھا کہ اگر چوہوں، مچھلیوں اور اس قسم کے دوسرے جانداروں کے ٹکڑے کر دیئے جائیں تو وہ مر جاتی ہیں۔ لیکن سٹارفش کا خاتمہ اس طرح نہیں ہوتا ہے۔ اگر اس کے بازو کاٹ دیئے جائیں لیکن مرکزی منہ باقی رہ جائے تو وہ نہ صرف زندہ رہتی ہے بلکہ اس کے بازو پھر سے پیدا ہو جاتے ہیں۔ یوں ہم دیکھتے ہیں کہ سٹارفش کے معاملے میں یہ تمثیل کام نہیں دیتی کہ اگر مچھلیوں، چوہوں اور اس قسم کے دیگر جانداروں کو کاٹ دیا جائے تو وہ مر جاتے ہیں۔ سٹارفش کے معاملے میں ضروری ہوتا ہے کہ اس کے منہ کو کاٹا جائے۔

مشابہتوں کی اساس پر کوئی تمثیل تیار کرنا اچھی بات ہے۔ البتہ ہم کو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ استدلالی عمل کے ابتدائی مرحلے پر تمثیل محض ایک مفروضہ ہوتی ہے۔ گویا اس کی حیثیت ایک معقول قیاس آرائی سی ہوتی ہے۔ اس کو درست تسلیم کرنے سے پہلے اس کی جانچ پڑتال اور تصدیق ضروری ہوتی ہے۔ جانچ پڑتال اور تصدیق کے بغیر ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ جو تمثیل ہم نے تیار کی ہے یا جو نتیجہ اخذ کیا ہے، وہ درست ہے۔

فیصلہ سازی میں تماثیل کا استعمال

سیاسی فیصلے کرتے وقت عموماً تمثیل سے دلائل دیئے جاتے ہیں۔ ہم اپنے زمانے میں درست پالیسیوں کا تعین کرتے وقت ایسی ملتی جلتی صورت حالوں کی تلاش میں ماضی کی تاریخ کا جائزہ لیتے ہیں جو ہماری رہنمائی کر سکیں۔ ہم بھول جاتے ہیں کہ وقت کے ساتھ حالات بدل جائیں تو ماضی اور حال کے درمیان تمثیلیں زیادہ کام نہیں دیتیں۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد ۱۹۵۰ء کے عشرے میں ماضی سے مشابہت تلاش کرنے والے اکثر لوگوں کا کہنا تھا کہ جرمنی اور فرانس ایک دوسرے کے شدید دشمن رہیں گے۔ تاریخ اس دعویٰ کی تائید کرتی تھی۔ ۱۹۴۵ء سے پہلے کی ایک صدی میں ان دونوں ملکوں کے درمیان، متنازعہ سرحدی علاقوں کے سبب، تین جنگیں ہو چکی تھیں۔ لہٰذا ان کے درمیان دیرپا پرامن بقائے باہمی کی امید کم تھی۔

تاہم آج، دوسری جنگ عظیم کے نصف صدی بعد، لگتا ہے کہ جرمنی اور فرانس میں گہری دشمنی ختم ہو چکی ہے۔ اختلافات اب بھی ان کے درمیان موجود ہیں، لیکن وہ عموماً ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتے ہیں۔

جرمنی اور فرانس کے درمیان عرصے سے جاری رہنے والے اس امن کو ہم ایک تمثیل کے طور پر استعمال کر سکتے ہیں جو ہم کو مستقبل میں عالمی امن کے بارے میں پر امید بنا سکتی ہے۔ اگر اس قسم کی گہری دشمنیاں ختم ہو سکتی ہیں اور دشمن قومیں دوست بن سکتی ہیں۔ تو پھر دوسرے ملک ایسا کیوں نہیں کر سکتے۔ ظاہر ہے کہ آنے والا وقت ہی اس تمثیل کے درست یا غلط ہونے کا فیصلہ کرے گا۔ البتہ ہم یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ بعض اہم حالیہ عالمی واقعات اس امر کی امید دلاتے ہیں کہ اقوام عالم ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر رہنا سیکھ جائیں گی۔

لوگ کہاوتوں میں بیان ہونے والی مشابہتوں سے بہت متاثر ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص کسی کاروبار میں اپنی بچت کی سرمایہ کاری کرنے پر سوچ رہا ہو تو اس کو کوئی دوست یہ مشورہ دے سکتا ہے کہ ''بہتی گنگا میں ہاتھ دھو لینے چاہیں''۔ اصل میں وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ ''جب اچھا موقع موجود ہو تو اس کے ضائع ہونے سے پہلے کاروبار شروع کر دینا چاہیے۔ اب اگر اس شخص کے کسی دوسرے دوست کی رائے یہ ہو کہ اس وقت کاروبار میں پیسہ لگانا مناسب نہیں تو غالباً وہ یہ کہے گا کہ ''جلدی میں سراسر نقصان ہے''۔ اس طرح وہ احتیاط سے کام لینے کی تلقین کر رہا ہوگا۔ اس کی رائے یہ ہو گی کہ کاروبار میں سرمایہ کاری کے لیے یہ مناسب وقت نہیں، لہٰذا اس سلسلے میں کوئی قدم اٹھانے سے پہلے اس کے دوست کو اچھی طرح سوچ بچار کرنا چاہیے۔

اس صورتِ حال میں بعض دوسری کہاوتوں سے بھی کام لیا جا سکتا ہے۔ مثلاً یہ کہ ''عقل مند کے لیے اشارہ کافی ہے'' یا یہ کہ ''خدا ان کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں''۔ وہ یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ ''احمق اپنی دولت سے جلد محروم ہو جاتا ہے''۔ اس قسم کی بہت سی کہاوتیں اور مقولے موجود ہیں جن سے ہم اپنی ہر قسم کی آراء کی تائید حاصل کر سکتے ہیں۔ تاہم فیصلے کرتے ہوئے ان سے زیادہ مدد کی امید نہیں کی جا سکتی۔ وجہ یہ ہے کہ زندگی کی ہر صورت حال منفرد ہوتی ہے اور کہاوتوں یا ضرب المثلوں کی مدد سے ان کو پوری طرح نہیں سمجھا جا سکتا۔ اگر کسی صورت حال میں کوئی تمثیل کام دیتی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ دوسری صورت حالوں میں بھی وہ کام آ سکتی ہے۔

کاذب ''حقائق'' یا مقدمات کی اساس پر استدلال

ہمارا خیال یہ ہوسکتا ہے کہ اگر ہم استدلال میں' کاذب' حقائق یا مقدمات کو بنیاد بنائیں تو ان سے جو نتیجہ ہم اخذ کریں گے وہ بھی غلط ہوگا۔ عام طور پر یہ بات درست ہے۔ لیکن کبھار کبھار معاملہ مختلف بھی ہو جاتا ہے۔

قیاس کی صورت میں مندرجہ ذیل استدلال پر ایک نگاہ ڈالیے:

(۱) جانور پتھر ہیں۔ تمام الف' ب ہیں۔

(۲) پتھر جاندار اشیاء ہیں۔

تمام ب' ج ہیں۔

(۳) لہٰذا جانور جاندار اشیاء ہیں۔

تمام الف' ج ہیں۔

یہاں آپ دیکھئے کہ جو نتیجہ اخذ کیا گیا ہے (یعنی یہ کہ جانور جاندار اشیاء ہیں) وہ درست' ہے' کیونکہ ہمارا تجربہ اس کی توثیق کرتا ہے۔ مزید برآں یہ نتیجہ بالکل منطقی انداز میں اخذ کیا گیا ہے۔ گویا استدلال' منطقی' ہے۔ اس کے باوجود ے نتیجہ جن مقدمات سے اخذ کیا گیا ہے' وہ قطعی طور پر غلط ہیں۔ مذکورہ بالا مثال میں یہ جاننا بہت آسان ہے کہ مقدمات غلط ہیں۔ تاہم بعض صورتوں میں مقدمات کے کذب کو تلاش کرنا سہل نہیں ہوتا۔ علاوہ ازیں ہم یہ بھی سوچ سکتے ہیں کہ چونکہ نتیجہ درست ہے' لہٰذا وہ مقدمات بھی درست ہوں گے جن سے اس نتیجے کو اخذ کیا گیا ہے۔

اس مثال میں یہ سبق پوشیدہ ہے کہ درست نتیجہ یہ ثابت نہیں کرتا کہ مقدمات بھی درست ہیں۔ عام طور پر درست نتائج درست مقدمات کی شہادت ہوتے ہیں' لیکن کبھی کبھی معاملہ الٹ جاتا ہے۔ لہٰذا ہم بس یہی کہہ سکتے ہیں کہ نتیجہ مقدمات سے ہم آہنگ ہوا کرتا ہے۔ تاہم نتیجہ مقدمات کی تصدیق نہیں کرتا۔ ان کو درست ثابت نہیں کرتا۔

ایک اور استدلال ملاحظہ کیجئے:

مقدمہ (۱) احمق اقوام بڑے بڑے مفکر پیدا نہیں کرتیں۔

مقدمہ (۲) گارگولیا ایک احمق قوم ہے۔

نتیجہ: لٰہذا گارگولیا بڑے بڑے مفکر پیدا نہیں کر سکتے۔

اب فرض کیجئے کہ اس معاملے کی چھان بین کیجاتی ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ بظاہر گارگولیا نامی قوم نے عظیم مفکر پیدا نہیں کیئے۔ ہمیں اس امر سے آگاہی نہیں کہ آیا کبھی اس قوم نے کوئی بڑا مفکر پیدا کیا تھا یا نہیں۔ اب چونکہ مقدمات سے جو نتیجہ اخذ کیا گیا ہے وہ درست دکھائی دیتا ہے تو اس سے یہ خیال بھی پیدا ہو سکتا ہے کہ دونوں مقدمات بھی درست ہیں۔ اس سے بعض لوگ یہ نتیجہ اخذ کریں گے کہ ''احمق اقوام واقعی بڑے بڑے مفکر پیدا نہیں کرتیں'' اور یہ کہ ''گارگولیا ایک احمق قوم ہے''۔

بہر طور یہ دونوں مقدمات غلط ہو سکتے ہیں۔ کسی قوم کے افراد کے ذہنی حاصلات پیچیدہ حالات کا نتیجہ ہوتے ہیں اور یہ بات گارگولیا قوم کے بارے میں بھی درست ہے۔ ممکن ہے کہ گارگولیا کا تعلیمی نظام بہت پسماندہ ہو' قدرتی وسائل ناکافی ہوں' غربت اور افلاس عام ہو' اس قوم کے افراد کو مناسب خوراک دستیاب نہ ہو اور بیماری کا غلبہ ہو۔ اسی قسم کے بعض دوسرے عوامل بھی موجود ہو سکتے ہیں۔ اگر یہ بات درست ہو کہ اس قوم نے کبھی بڑے مفکر پیدا نہیں کیئے تو بھی اس کا یہ مطلب نہیں کہ آئندہ کبھی اس قوم میں بڑے مفکر پیدا نہ ہوں گے۔ تحقیق و مطالعہ کے بعد ہم زیادہ سے زیادہ یہی بات ثابت کر سکتے ہیں کہ گارگولیا نامی قوم میں ابھی تک کوئی عظیم مفکر پیدا نہیں ہوا۔

یہی نہیں' بلکہ یاد رکھنے والی بات یہ ہے کہ انسانوں کے کسی گروہ یا قوم کو 'احمق' قرار دینے کا حق کسی کو نہیں ہے۔ یہ لفظ اپنے بولنے والے کے تعصب کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس معاملے میں جس استدلال سے کام لیا گیا ہے وہ بے حد سادہ ہے۔ جن مقدمات سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے وہ بھی ناموزوں ہیں۔ اس استدلال میں ایک پیچیدہ انسانی مسئلے پر فیصلہ دیا گیا ہے جس میں درحقیقت بہت سے عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔ مندرجہ ذیل جملوں میں تعمیم کو بہت زیادہ پھیلا دیا گیا ہے:

(۱) احمق اقوام بڑے بڑے مفکرین کو جنم نہیں دیتیں۔

(۲) گارگولیا احمق افراد پر مشتمل ایک قوم ہے۔

اصل میں یہ جملے بہت مبہم ہیں اور ان کی سچائی کو ثابت کرنا کم و بیش محال ہے۔ لفظ 'احمق' ایک مبہم لفظ ہے جس کا مطلب عمومی ذہانت سے محروم ہونا ہے۔ علاوہ ازیں یہ

ایک توہین آمیز لفظ بھی ہے جو دوسرے لوگوں کے احترام کو کم کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔لہٰذا کسی معروضی استدلال میں اس کو استعمال کرنے سے گریز کیا جانا چاہیے۔

آخر ہم یہ بات کس طرح ثابت کر سکتے ہیں کہ کسی قوم کے تمام افراد 'احمق' ہیں؟ کیا اس سلسلے میں ذہانت کے امتحان سے مدد لی جاسکتی ہے؟ ہمیں یاد رکھنا ہوگا کہ اس قسم کے امتحانوں میں نمبر حاصل کرنے کا بڑی حد تک دارومدار ثقافتی پس منظر' خواندگی کے معیار' محرک' صحت کی کیفیت اور بعض دوسرے عوامل پر ہوا کرتا ہے۔اگر ہم سکول کی تعلیم و تربیت سے محروم کسی دیہاتی شخص کی ذہانت کا امتحان لیں تو عام طور پر وہ بہت کم نمبر حاصل کر سکے گا۔ اس سے بعض لوگ اس غلطی کا شکار ہو سکتے ہیں کہ وہ دیہاتی شخص ''احمق'' ہے۔لیکن اگر ہم کسی دور افتادہ ویرانے میں زندگی کو برقرار رکھنے کی اس دیہاتی کی صلاحیت کا مقابلہ کسی شہری سے کریں تو پھر ہم کو وہ شہری 'احمق' معلوم ہونے لگے گا۔

چلیئے ہم فرض کرتے ہیں کہ 'حماقت' کی پیمائش کا کوئی معروضی طریقہ دریافت کر لیا گیا ہے اور اس کی مدد سے یہ بھی ثابت ہو گیا ہے کہ گارگولیا کے تمام افراد 'احمق' ہیں۔ پھر ہم اپنے ابتدائی مقدمات کی طرف رخ کرتے ہیں۔ ہمارا مقدمہ یہ تھا کہ ''احمق اقوام بڑے بڑے مفکر پیدا نہیں کرتیں''۔اس مقدمے کا درحقیقت مفہوم یہ ہے کہ عظیم مفکر احمق قوم میں پیدا نہیں ہوتے ہیں۔ یہ مفہوم اس امر کا اشارہ دیتا ہے کہ اس قسم کی قوم میں آئندہ کوئی بڑا مفکر پیدا ہو سکتا ہے۔گویا مستقبل میں امکان موجود ہے' اگرچہ ماضی میں ایسا نہیں ہوا۔مقدمے میں استعمال شدہ زبان غیر موزوں ہے اور اس قسم کی زبان استدلال کے عمل میں گڑبڑ پیدا کر دیتی ہے۔

کاذب مقدمات کی ایک کیس سٹڈی

ایمانوئل ولیکووسکی نامی ایک نفسیاتی معالج نے ۱۹۵۰ء میں Worlds in Collision کے عنوان سے ایک کتاب شائع کروائی تھی۔اس کتاب سے علمی حلقوں میں ایک اختلاف شروع ہو گیا تھا جو پچیس برس جاری رہا اور آخر کار مصنف کی وفات پر ختم ہوا۔اس مصنف کا دعویٰ یہ تھا کہ سیارہ زہرہ اصل میں ایک دمدار ستارہ تھا جو مشتری سے الگ ہو کر زمین کی طرف آ نکلا تھا۔اس نے زمین کے گرد کئی چکر لگائے تھے۔پھر وہ ہٹ کر

خود ایک سیارہ بن گیا تھا۔ اپنے اس نظریئے کی بنیاد پر ولیکووسکی نے بائبل میں بیان ہونے والے کئی واقعات کی توجیہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ ان میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ جب جو شوا نے لڑائی دی تھی تو سورج ایک دن اپنی جگہ پر ساکن رہا تھا۔ دوسرا واقعہ یہ ہے کہ جب حضرت موسیٰ یہودیوں کے ساتھ مصر سے نکلے تھے تو بحیرہ احمر نے انہیں راستہ دیا تھا۔ بائبل کے تیسرے واقعہ کا تعلق یہودیوں کے لیے آسمان سے من وسلویٰ کا نازل ہونا ہے۔

علم فلکیات سے بے خبر بہت سے لوگ ان قصہ کہانیوں سے بہت متاثر ہوئے جن کو ولیکووسکی نے ''شہادت'' کے طور پر پیش کیا تھا۔ یہاں تک کہ وہ سیارہ زہرہ کے منبع سے متعلق اس کے فلکیاتی دعوؤں کو درست تسلیم کرنے لگے۔

ماہرین فلکیات نے یک زبان ہوکر سیارہ زہرہ کے بارے میں ولیکووسکی کے دعوؤں کی تردید کی کیونکہ وہ سائنس کے عرصہ دراز سے تسلیم شدہ اصولوں اوران کے ساتھ ساتھ علمِ فلکیات کے بنیادی مشاہدوں کی نفی کرتے تھے۔ بعض ماہرین تو زیادہ ہی ناراض ہو گئے اوران سے یہ مطالبہ کرنے کی شدید غلطی بھی سرزد ہوگئی کہ ولیکووسکی کی کتاب کا اشاعت اور تقسیم پر پابندی عائد کردی جائے۔ اس پر ولیکووسکی کو ''شہری آزادیوں'' کی آڑ میں پناہ لینے کا موقع مل گیا اور وہ ماہرین فلکیات کی تنگ نظر اور آزادی اظہار کا دشمن قرار دینے لگا۔

ولیکووسکی نے اپنے 'نظریے' کی بنیاد پر بعض پیش گوئیاں کی تھیں۔ ان میں سے چند ایک درست ثابت ہوگئیں۔ اس پر بحث ومباحثہ میں مزید شدت پیدا ہوگئی۔ ولیکووسکی کی ایک دلیل یہ تھی کہ زہرہ بہت گرم ہے' کیونکہ یہ ایک نیا سیارہ ہے جو صرف تین ہزار سال پرانا ہے۔ یوں اسے ٹھنڈا ہونے کے لیے مناسب وقت نہیں ملا ہے۔ بعدازاں جب یہ معلوم ہوا کہ زہرہ کی سطح پر درجہ حرارت ۹۹۰ فارن ہائیٹ ہے تو ولیکووسکی نے فوراً اسے اپنے نظریئے کی سچائی کا ایک ''ثبوت'' قرار دے دیا۔ تاہم معاملہ یہ ہے کہ سیارہ زہرہ کی غیر متوقع طور پر زیادہ درجہ حرارت ''گرین ہاؤس اثر'' کا نتیجہ ہے کیونکہ زہرہ کا ماحول اور فضا کاربن ڈائی آکسائیڈ ہے جو حرارت کو جذب کر لیتی ہے۔

ولیکووسکی نے یہ پیش گوئی بھی کی تھی کہ سیارہ مشتری سے ریڈیائی لہریں خارج ہوتی ہوں گی' کیوں نہ اگر اس نے زہرہ کو جھٹک کر پھینکا تھا تو اسے ایک 'فعال' سیارہ ہونا

چاہیے۔ سائنس دانوں کو اس بارے میں شبہ نہ تھا کہ مشتری سے ریڈیائی لہریں خارج ہوتی ہوں گی۔ بعدازاں ماہرین فلکیات نے اس امر کی تصدیق بھی کر دی کہ اس سیارے سے ریڈیائی لہریں خارج ہوتی ہیں۔

ولیکووسکی نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ اس نے یہ دو پیش گوئیاں کی تھیں اور وہ درست ثابت ہوئی ہیں۔ اس نے اور بھی کئی پیش گوئیاں کی تھیں جو درست ثابت نہ ہوئیں۔ تاہم اس نے اپنی مذکورہ دونوں پیش گوئیوں کی سچائی کا بڑے پیمانے پر چرچا شروع کر دیا۔ یوں بہت سے لوگ یہ سمجھنے لگے کہ اس کا نظریہ اور اس کے استدلال کے مقدمات درست ہیں۔ یہ اسی امر کی ایک ڈرامائی مثال تھی کہ کس طرح قطعی طور پر غلط مقدمات سے محض اتفاقی طور پر درست نتائج اخذ ہو سکتے ہیں۔

ولیکووسکی اپنے خیالات کے دفاع میں لڑنے کا فن خوب جانتا تھا۔ چنانچہ وہ اپنے خیالات کو پھیلانے اور مخالفوں کو نیچا دکھانے کے لیے بھرپور جدوجہد کرتا رہا۔ یوں ۱۹۸۸ء میں اس کی وفات تک ان خیالات پر بحث و مباحثہ جاری رہا۔ تاہم کاذب مقدمات پر مشتمل اکثر دوسرے مباحثوں کی طرح یہ معاملہ بھی اب ختم ہو چکا ہے۔ جلد ہی اس کو فراموش کر دیا جائے گا۔

اعداد وشمار کا استحصال

اکثر اوقات اعداد وشمار قاری یا سامع کو یہ احساس دلانے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں کہ جو معلومات اس کو فراہم کی جا رہی ہیں وہ درست اور سائنٹفک ہیں۔ سیاسی جلسے جلوسوں اور بحثوں میں جان بوجھ کر درست اعداد وشمار کی غلط تعبیر کی جاتی ہے۔ اپنے خصوصی مفادات یا عزیز عقائد کے حق میں بحث کرتے ہوئے عام لوگ بھی یہی کچھ کرتے ہیں۔ اقتدار پرست حکمران عوام کو یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ ان کے زمانے میں معاشی حالات اچھے ہیں۔ چنانچہ وہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ بے روزگاری کی شرح پانچ فی صد ہے۔ اس شرح کو بہت کم خیال کیا جاتا ہے اور یوں یہ تاثر ملتا ہے کہ ملک میں معاشی استحکام موجود ہے۔ حزب مخالف کے لوگ اس کے مقابلے میں کوئی اور سروے کے اعداد وشمار پیش کرتے ہیں جس میں بے روزگاری کی شرح دس فی صد بتائی گئی ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ

دوسرے سروے میں ان گروہوں کو بھی شامل کیا گیا ہوتا ہے جن کو سرکاری سروے میں نظر انداز کیا گیا تھا۔ ان گروہوں میں عرصہ درواز سے بے روزگار چلے آنے والے افراد بھی شامل ہوتے ہیں۔ جن کے کوئی باقاعدہ پتے نہیں ہوتے' اس لیے انہیں بھی نظر انداز کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔ علاوہ ازیں بڑی تعداد میں ایسے جز وقتی کارکن بھی ہوتے ہیں جو مزید کام کے متلاشی رہتے ہیں۔ تاہم انہیں بے روزگار نہیں سمجھا جاتا۔

جس شے کو ہم ''اوسط'' قرار دیتے ہیں' اس کی آسانی سے غلط تعبیریں کی جاسکتی ہیں۔ اعداد کے کسی گروپ کا اوسط' فہرست میں شامل تمام اعداد کو جمع کر کے اندراجات کی تعداد پر اس کو تقسیم کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر ہمارے پاس دس اعداد ۱'۲'۳'۳'۴'۵'۷'۷'۸ ہوں تو ان کا اوسط ان دس اعداد کے مجموعہ یعنی ۴۲ کو دس پر تقسیم کرنے سے حاصل ہوگا۔ اس مثال میں یہ اوسط ۴۲ ہے۔

اکثر لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا رہتے ہیں کہ اگر کسی گروپ یا معاشرے کی اوسط آمدنی زیادہ ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ گروپ یا معاشرہ' خوش حال' ہے۔ اس نکتے کی وضاحت کے لیے ہم دو بستیوں' لاک ول اور گیرٹاؤن کی مثال پیش کرتے ہیں اور حساب کتاب کو آسان فہم رکھنے کے لیے فرض کرتے ہیں کہ ان دونوں بستیوں میں دس دس خاندان آباد ہیں۔ ان خاندانوں کی آمدنی کا گوشوارہ حسبِ ذیل ہے۔

لاک ول اور گیرٹاؤن کے خاندانوں کی سالانہ آمدنی

	لاک ول	گیرٹاؤن
(۱)	۱۰،۰۰۰ ڈالر	۱۰،۰۰،۰۰۰ ڈالر
(۲)	۱۰،۰۰۰	۵،۰۰۰
(۳)	۱۰،۰۰۰	۵،۰۰۰
(۴)	۱۰،۰۰۰	۵،۰۰۰
(۵)	۱۰،۰۰۰	۵،۰۰۰
(۶)	۱۰،۰۰۰	۵،۰۰۰
(۷)	۱۰،۰۰۰	۵،۰۰۰

(۸)	۱۰،۰۰۰	۵،۰۰۰
(۹)	۱۰،۰۰۰	۵،۰۰۰
(۱۰)	۱۰،۰۰۰	۵،۰۰۰
	....	....
میزان:	۱۰۰،۰۰۰ ڈالر	۱،۰۴۵،۰۰۰ ڈالر
	....	....
اوسط=	۱۰۰،۰۰۰ ڈالر	۱،۰۴۵،۰۰۰ ڈالر
	....	....
	۱۰	۱۰
=	۱۰،۰۰۰ ڈالر	۱۰۴،۵۰۰ ڈالر

اب فرض کیجیے کہ جم باٹلر صاحب گیر ٹاؤن کے میئر ہیں اور دوبارہ میئر منتخب کے لیے وہ انتخابی مہم چلا رہے ہیں۔ بستی کے لوگوں کے سامنے پر جوش انداز میں تقریر کرتے ہوئے وہ منادی کرتے ہیں کہ ''ہماری بستی کے افراد کی اوسط آمدنی دس لاکھ پینتالیس ہزار ہے جو کہ دریا کے اس پار ہماری ہمسایہ بستی لاک ول کے شہریوں کی اوسط آمدنی سے دس گنا سے بھی زیادہ ہے۔ اس سے آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ میری انتظامیہ نے بستی کے لوگوں کو دس گناہ زیادہ خوش حال بنا دیا ہے!''

اس تقریر کے بعد مخالف امیدوار دونوں بستیوں کے اعداد و شمار کا جائزہ لیتا ہے اور ان کی تعبیر یوں کرتا ہے کہ ''گیر ٹاؤن کے نوے فی صد خاندانوں کی آمدنی (پانچ ہزار ڈالر فی خاندان) لاک ول کے خاندانوں کی اوسط آمدنی (دس ہزار ڈالر فی خاندان) سے آدھی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جم باٹلر امیروں کا حامی ہے جو گیر ٹاؤن کے بیشتر وسائل ہڑپ کر جاتے ہیں جبکہ باقی شہریوں کی حالت پتلی ہو رہی ہے۔ لوگو! بستی کے تمام لوگوں کی خوشحالی کے لیے مجھے ووٹ دو''۔

ایک حوالے سے دیکھا جائے تو جم باٹلر صاحب غلط نہیں کہتے اور ان کے مخالف امیدوار کی بات بھی درست ہے۔ لہٰذا ہمیں دیکھنا چاہیے کہ 'اوسط' کی فریب کاری کیونکر پیدا ہوتی ہے؟ اصل میں سبب یہ ہے کہ 'اوسط' سے عمومی صورتِ حال سامنے آتی ہے' جب

کہ اعداد کی حقیقی تقسیم نظروں سے اوجھل رہ جاتی ہے۔ پسماندہ ملکوں کی حکومتیں 'اوسط' کی اس فریب کاری سے پورا پورا فائدہ اٹھاتی ہیں۔ اور فرضی اعداد و شمار اور 'اوسط' میں اضافے کے اعلان کر کے عوام کو جھوٹی تسلی دینے کی کوشش میں رہتی ہیں۔

ہم نے یہاں دو بستیوں کی مثال درج کی ہے۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ جب چند ایک بڑی آمدنیوں کو شامل کر لیا جائے تو اوسط رقم میں بہت سا اضافہ ہو جاتا ہے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ''اعداد و شمار جھوٹ نہیں بولتے' لیکن ان کو استعمال کرنے والے جھوٹ بول سکتے ہیں''۔ گویا اعداد و شمار بذات خود مسئلہ نہیں ہیں بلکہ مسئلہ وہ لوگ ہیں جو ان کو ناجائز استعمال کرتے ہیں۔

اضافی بمقابلہ مطلق

دوستوں کی ایک ٹولی پہاڑی کی چوٹی پر پہنچی تو وہ سب وادی کے خوبصورت منظر سے لطف اندوز ہونے لگے۔

راشدہ خوشی سے اچھلتے ہوئے کہنے لگی ''دیکھو دیکھو! کتنی خوبصورت جھیل ہے!''

''جھیل؟ جھیل اتنی چھوٹی ہوتی ہے کیا؟ ارے یہ تو جوہڑ ہے''۔ وسیم نے طنزیہ انداز کے ساتھ جواب دیا۔

اب سب دوست جھیل اور جوہڑ کے مسئلے پر بحث کرنے لگے۔ خوش قسمتی سے سیانا بابا یونس بھی چوٹی پر موجود تھا۔ اس نے آخر کار مسئلہ یوں حل کیا کہ ''بھئی جن کو یہ جھیل نظر آتی ہے ان کے لیے یہ جھیل ہے اور جن کو جوہڑ دکھائی دیتا ہے' ان کے لیے یہ جوہڑ ہے۔ یہ سارا مسئلہ ہی 'اضافی' ہے۔ واپس جا کر ہم نقشہ دیکھ کر جان سکیں گے کہ ماہر اس کو کیا کہتے ہیں۔''

بابا یونس نے جو یہاں لفظ ''اضافی'' استعمال کیا ہے تو اس سے مراد یہ ہے کہ اس سوال کا جواب ''ہاں'' یا ''نہ'' میں پورے اعتماد کے ساتھ نہیں دیا جا سکتا۔ اگر آپ کسی ایسے علاقے میں رہتے ہیں جہاں بڑی بڑی جھیلیں ہیں تو پھر جھیلوں اور جوہڑوں کے بارے میں آپ کا تصور ان لوگوں سے مختلف ہو گا جن کے گرد و نواح میں پانی کے بڑے ذخیرے نہیں ہیں۔ یہ بات بالکل ممکن ہے کہ ملک کے ایک حصے میں پانی کے جس ذخیرے

کو جو ہڑ سمجھا جاتا ہے' دوسرے حصے میں اس کو جھیل قرار دیا جاتا ہو۔ گویا اس بارے میں کوئی طے شدہ معیار موجود نہیں ہے۔

ہمارا بہت سا استدلال ایسی صورتِ حال کے بارے میں ہوتا ہے جو مطلق ہونے کے بجائے اضافی ہوا کرتی ہیں۔ سوالات کے جواب کا دارومدار بہت سی چیزوں پر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک جیسی معلومات رکھتے ہوئے بھی مختلف لوگ مختلف نتائج تک پہنچتے ہیں۔

جذبات بمقابلہ استدلال

ہمارے ذہنوں کی ساخت ایسی ہے کہ واقعات کا ردِعمل ہم بنیادی طور پر دو طریقوں سے کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک جذبات کے ذریعے ردِعمل ظاہر کرنا ہے اور دوسرا استدلال کے ذریعے۔ ان دونوں طریقوں میں فرق بہت بڑا ہے' تاہم انسانی بقاء کے لیے دونوں ناگزیر ہیں۔

جسم میں پیدا ہونے والے ہارمون جذبوں میں بنیادی رول ادا کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر جب ہمیں کسی ایسی خطرناک صورتِ حال کا سامنا ہوتا ہے جو ہم سے لڑنے یا بھاگ جانے کا تقاضہ کرتی ہے تو کلوی غدود خون میں کلوی رطوبت نامی ہارمون داخل کر دیتے ہیں۔ اس سے ہمارے پٹھوں کو ان کی کارکردگی بہتر بنانے کے لئے توانائی حاصل ہوتی ہے۔ یوں ہم پیش آمدہ خطرناک صورتِ حال سے تیزی کے ساتھ بھاگ سکتے ہیں یا پھر زیادہ جارحانہ انداز میں اس کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ خوف کا یہ ردِعمل کئی قسم کے جانداروں میں پایا جاتا ہے اور زندگی کی بقاء میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔

ہارمونز کا تعلق دوسرے جذبوں جیسے جنسی کشش' ماں باپ کی محبت' نفرت اور غصہ وغیرہ سے بھی ہے۔ بدقسمتی سے نازک معاملات میں جذبے استدلالی قوت پر غالب آ جاتے ہیں اور نقصان کا سبب بنتے ہیں۔ مثلاً کسی پرہجوم جگہ یا ریسٹورنٹ وغیرہ میں آگ لگ جائے تو لوگ حواس باختہ ہو کر باہر نکلنے کا راستہ ہی بند کر دیتے ہیں۔ یوں چند لوگ جان بچانے میں کامیاب ہوتے ہیں جب کہ اکثر آگ کی نذر ہو جاتے ہیں۔ اس کے بجائے اگر لوگ عقل مندی سے کام لیں تو شاید سب کے سب محفوظ رہ سکتے ہیں۔ ایسی کئی

مثالیں موجود ہیں کہ بھیڑ بھاڑ کی وجہ سے دروازے اندر کی طرف نہ کھل سکے' یوں لوگ آگ میں پھنس کر رہے گئے۔ اس لیے عموماً عمارتوں کے دروازے باہر کی طرف کھلتے ہیں۔

ایسے حادثے بھی ہوتے ہیں جن میں لوگ ہجوم تلے کچلے جاتے ہیں۔ بڑے بڑے مذہبی اور سیاسی اجتماعات میں ایسے حادثات ہوتے رہتے ہیں اور کئی قیمتی جانیں ضائع ہو جاتی ہیں۔

اس کے برخلاف عملے کے پرسکون ارکان کی بدولت بحری اور ہوائی حادثات میں بسا اوقات لوگوں کی جانیں بچ جاتی ہیں۔

محبت ہمارے طاقتور جذبوں میں سے ایک ہے۔ محبت کا بنیادی اظہار بچوں کے لیے اکثر والدین کے تعلق کی صورت میں ہوتا ہے۔ یہ محبت مشکل یا خطرناک حالات میں شخصی قربانی کا سبب بن جاتی ہے۔ محبت کا جذبہ عموماً مثبت ہوتا ہے' کیونکہ اس سے انسانی بقاء میں مدد ملتی ہے۔ لیکن کبھی کبھار یوں بھی ہوتا ہے کہ والدین کی محبت استدلالی قوت پر غالب آ جاتی ہے۔ اس صورت میں وہ بچوں کی نقصان دہ حد تک زیادہ نگہداشت کا سبب بنتی ہے۔ یوں بچوں کو آزادی سے پھلنے پھولنے کا موقع نہیں ملتا اور ان کی شخصیت پر برا اثر پڑتا ہے۔

مرد و زن میں جسمانی محبت کا شدید جذبہ پایا جاتا ہے اور یہ جذبہ انسانی زندگی کے سفر کو جاری رکھنے کے لیے ناگزیر ہے۔ تاہم کبھی کبھی یہ جذبہ معقول حدیں پھلانگ جاتا ہے اور اس کے زیرِ اثر لوگ ایسی حرکتیں کرتے ہیں جو مصائب کا باعث بنتی ہیں۔ اس قسم کے جذبے عموماً غیر معقول نفرت کا روپ دھار لیتے ہیں۔ یوں ازدواجی زندگیاں تباہ ہو جاتی ہیں اور برس ہا برس تک ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر زندگی بسر کرنے والے میاں بیوی نہ صرف ہمیشہ کے لیے الگ ہو جاتے ہیں بلکہ جائیداد یا بچوں کے حصول کے لیے ان میں قانونی جنگ بھی شروع ہو جاتی ہے۔ دوستانہ مداخلت سے بسا اوقات نوبت طلاق تک پہنچنے سے رک سکتی ہے۔ لیکن دونوں میاں بیوی یا ان میں سے کوئی ایک اس قدر جذباتی ہوتا ہے کہ وہ کسی کی بات سننا بھی گوارا نہیں کرتا۔ یہی نہیں' بلکہ کبھی کبھار معاملہ بچوں کو اغوا کرنے' ایک دوسرے پر حملہ کرنے بلکہ قتل تک جا پہنچتا ہے۔

بڑے پیمانے پر دیکھا جائے تو عوامی لیڈر یا آمر عوام کو اپنی گرفت میں رکھنے بلکہ جنگیں شروع کرنے کے لیے بھی جان بوجھ کر لوگوں کے جذبات ابھارتے ہیں۔ قید و بند کی سزاؤں، تشدد اور بسا اوقات پھانسیوں کے ذریعے وہ شدید خوف کی فضا پیدا کر دیتے ہیں۔ آمروں کو اطلاعات کے وسائل پر کنٹرول حاصل ہوتا ہے اور وہ کسی مدد سے اپنے حامیوں میں عموماً حب الوطنی کا شدید جذبہ ابھارتے ہیں۔ سیدھی سی بات ہے کہ جذبات انسانی کردار میں بنیادی رول ادا کرتے ہیں، تاہم ان کو ایک حد میں رکھنا چاہیے اور ان کو استدلال، فہم و دانش کے ماتحت رہنا چاہیے۔

روزمرہ کی زندگی میں عوامی اور مذہبی رہنماؤں کی جذباتی تقریریں اور اخباروں، ریڈیو اور ٹیلی وژن کی اشتہار بازیاں ہمیں جذباتی طور پر متاثر کرتی ہیں۔ تاہم ہماری استدلالی صلاحیت ہم کو جذبات سے مغلوب ہو کر کوئی غلط قدم اٹھانے سے روکتی ہے۔ (دسویں اور گیارھویں ابواب میں ہم نے اشتہار بازی کے شعبے اور دوسرے لوگوں کی رائے کو متاثر کرنے کے ضمن میں جذبات اور استدلال پر مزید بحث کی ہے۔)

انتہا پسند فیصلے

ایک نوجوان اپنے ٹولے کے ساتھ کھیل کے میدان میں داخل ہوتا ہے۔ مخالفوں سے لڑتا ہے اور اس دوران چاقو کے وار کر کے ایک نوجوان کو ہلاک کر دیتا ہے۔ جب اس کو گرفتار کیا جاتا ہے تو لگتا ہے کہ اسے کوئی افسوس نہیں۔ نوجوانی کے باوجود عدالت اس کو موت کی سزا دے دیتی ہے۔ اکثر لوگ اس سزا سے اتفاق کرتے ہیں۔ البتہ، بعد ازاں، گورنر موت کی سزا کو عمر قید میں بدل دیتا ہے۔

اس واقعہ کے کئی سال بعد اس لڑکے کے پسِ منظر کا مطالعہ کیا جاتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا ہی سے اس کے حالات قابلِ رحم تھے۔ اس کے والدین الگ ہو چکے تھے۔ کبھی وہ ماں کے پاس رہتا اور کبھی باپ کے پاس۔ کئی اور گھر بھی اس کا عارضی ٹھکانہ بنتے رہے تھے۔ اکثر اوقات اس کو گلیوں بازاروں میں سونا پڑتا تھا اور بھوک اس کا پیچھا کرتی رہتی تھی۔ آہستہ آہستہ اس کے دل میں امیروں کے خلاف نفرت پیدا ہونے لگی۔ وہ ان کو اپنی مصیبتوں کا سبب سمجھتا تھا۔ سکول سے اس کا کوئی تعلق نہ بن سکا، کیونکہ اس کے

روزمرہ مسائل کا حل سکول کے پاس نہ تھا۔ یوں وہ ان پڑھ رہا۔

جیل میں اس کو سوچ بچار کا موقع ملا۔ وہیں اس نے لکھنا پڑھنا سیکھا۔ دنیا کے بارے میں اس کا رویہ بدلنے لگا۔ اسی طرح اس کو برا بھلا کہنے والوں کے رویے بھی بدلنے لگے۔ ان کو احساس ہونے لگا کہ اس نوجوان کے نا قابلِ معافی جرم کے پیچھے اہم حالات کارفرما تھے۔ اس قسم کے حالات میں ہم میں سے کوئی بھی ایسا گھناؤنا قدم اٹھا سکتا ہے۔

زندگی میں اس قسم کے حالات غیر معمولی نہیں ہیں۔ شاذ و نادر ہی لوگ سراسر اچھے یا سراسر برے ہوتے ہیں۔ ان کے اعمال بھی اچھے برے دونوں قسم کے ہوا کرتے ہیں۔ اہم سماجی امور کے بارے میں لوگوں کے رویے بھی دونوں قسم کے ہوتے ہیں۔ اکثر اوقات لوگ محسوس کرتے ہیں کہ حالات میں تبدیلی یا نئے حقائق کے منظر عام پر آنے سے انہیں اپنے محبوب خیالات میں ردوبدل کرنا پڑتا ہے۔

ہمیں ایسے فیصلے کرنے سے گریز کرنا چاہیے جو انسانی طرز عمل یا مسائل کو ضرورت سے زیادہ سادہ بنا دیتے ہیں۔ ہمارے انتہائی فیصلے یا حل عموماً خام ثابت ہوتے ہیں کیونکہ وہ جذباتی ہوتے ہیں اور ان میں بہت سے حقائق نظر انداز کر دیئے جاتے ہیں۔

اخلاقی اقدار اور رویوں کا کردار

خیر و شر، حق و باطل، نیکی بدی نیز انصاف اور بے انصافی جیسے اکثر تصورات کے بارے میں لوگوں کا نقطہ نظر مختلف ہوتا ہے۔ جمہوریت و آمریت اور حفاظت و خطرہ جیسے امور کے بارے میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ ایسے امور میں فیصلوں کا دارومدار عموماً فیصلہ کرنے والوں کی اخلاقی اقدار پر ہوتا ہے۔ مسائل اور فیصلوں کو پیش کرنے والے الفاظ کو جو معنی دیئے جاتے ہیں، وہ بھی اس عمل میں نمایاں حصہ لیتے ہیں۔

نیکی و بدی اور خیر و شر کے مطالعہ کو اخلاقیات کا نام دیا جاتا ہے۔ اخلاقی اقدار (عموماً انہیں محض ''اقدار'' کہا جاتا ہے) سے مراد وہ عقائد ہیں جو لوگ خیر و شر اور حق و باطل کے بارے میں رکھتے ہیں۔

اخلاقی اقدار اور ان سے پیدا ہونے والے رویے کئی ذرائع سے سیکھے جاتے

ہیں۔ان ذرائع میں والدین، اہل خانہ، استاد، دوست، مذہبی رہنما، گردوپیش کے لوگ، اخبارات، کتابیں، رسالے، ریڈیو، ٹیلی وژن اور فلمیں وغیرہ شامل ہیں۔ہم اپنے ثقافتی وتہذیبی پسِ منظر سے مکمل فرار حاصل نہیں کر سکتے۔مختلف ثقافتیں مختلف اخلاق اقدار پیدا کرتی ہیں۔ان کا اختلاف واقعات کے بارے میں مختلف آراء یا فیصلوں کا باعث بنتا ہے۔

عموماً لوگوں کی تقسیم ان کی اصل کے حوالے سے ہوتی ہے۔مثلاً ہمارے ملک میں جو بڑے گروہ ہیں ان میں پنجابی، سندھی، پٹھان، بلوچ اور مہاجر شامل ہیں۔ایک اور تقسیم مسلم اور غیر مسلم کے حوالے سے یا پھر امیر، غریب اور متوسط طبقے کے حوالے سے کی جاتی ہے۔ہم میں سے اکثر کا تعلق ان میں سے کسی ایک گروہ کے بجائے ایک سے زیادہ گروہوں سے ہوتا ہے۔مثلاً کوئی شخص پنجابی ہوسکتا ہے، مسلمان (یا پھر شیعہ سنی وغیرہ) اور درمیانے طبقے سے بھی اس کا تعلق بیک وقت ہوسکتا ہے۔ان سب گروہوں کی اخلاقی اقدار اور طرز ہائے فکر وعمل میں بہت سا اختلاف ہوسکتا ہے۔اس صورت میں ہم مل جل کر اسی وقت رہ سکتے ہیں جب ہم ایک دوسرے کے بارے میں فیصلے دیتے ہوئے انتہا پسندی سے گریز کریں اور اپنے ذہنوں کو تعصب کے زہر سے محفوظ رکھیں۔ہمیں ایک دوسرے کے خیالات کا احترام کرنا چاہیے۔رواداری اور بردباری کو فروغ دینا چاہیے۔

بعض خطرات ایسے ہیں جو آج کے دور میں تمام انسانوں کو درپیش ہیں۔سرد جنگ ختم ہوچکی ہیں، لیکن خوفناک ایٹمی ہتھیار ابھی تک موجود ہیں اور وہ اس قدر تباہی پھیلا سکتے ہیں کہ جس سے کرۂ ارض پر زندگی ختم ہوسکتی ہے۔اور بھی خطرات ہیں۔مثلاً آلودگی کی مختلف صورتوں، آبادی میں بے تحاشا اضافے اور جنگلات کے خاتمے نے انسانوں کے لیے گمبھیر مسائل پیدا کر دیئے ہیں۔ان خوفناک مسائل کا حل ہم سب انسانوں کا مشترک مفاد ہے۔یہ مفاد اس امر کا تقاضا کرتا ہے کہ تمام قومیں مل جل کر انسانی زندگی کو لاحق خطرات کا مقابلہ کریں۔

کھلے ذہن کی اہمیت

ابھی تک ہم نے دیکھا ہے کہ عام طور پر لوگ کن طریقوں سے استدلال میں غلطیاں کرتے ہیں۔عموماً یہ غلطیاں اس وقت پیدا ہوتی ہیں جب منطقی استدلال میں

حقائق کو مقدمات کے طور پر غلط طریقے سے استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ حقائق خود بھی مبہم ہو سکتے ہیں۔ ہم ایسے ذہنی رویوں کا آسانی سے شکار ہو جاتے ہیں جو عموماً بند ذہن پیدا کرتے ہیں۔ یوں اس قسم کے واضح حقائق بھی ہم کو دکھائی نہیں دیتے جو کھلے ذہن والوں کو صاف نظر آتے ہیں۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ فیصلہ کرنے کے لیے درکار حقائق فراہم کئے بغیر ہی ہم نتائج تک چھلانگ لگا کر پہنچ جاتے ہیں یا اگر حقائق موجود نہ ہوں یا غیر واضح ہوں تو نتائج تک پہنچنے کی خواہش میں ہم تخیل سے کام لینے لگتے ہیں۔

یہ سب وہ طریقے ہیں جن سے استدلال میں مغالطے پیدا ہوتے ہیں۔ غلط انسانی فیصلوں کی طویل تاریخ سے ہمیں سبق سیکھنا چاہیے اور نتائج تک پہنچنے میں جلدی بازی سے کام نہیں لینا چاہیے۔ کھلے ذہن' کا مفہوم زیادہ تر یہی ہے۔ یعنی ہمیں تعصّبات سے حتیٰ الوسع بچنا چاہیے' ضروری حقائق کو پرکھے بغیر نتائج اخذ نہ کرنے چاہئیں اور ان معلومات کا پوری توجہ سے جائزہ لینا چاہیے جو ہمارے عقائد سے متصادم ہوں۔

کھلے ذہن رکھنے والوں کو عموماً اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ یہ کہا جاتا ہے کہ وہ ضرورت سے زیادہ محتاط ہیں اور فیصلہ کرنے کی قوت سے محروم ہیں۔ بلاشبہ ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں جو زندگی کی پیچیدگیوں سے اس قدر گھبرا جاتے ہیں کہ کبھی کوئی فیصلہ نہیں کر پاتے۔ رکاوٹوں سے خوف زدہ ہو کر اس قدر گھبرا جاتے ہیں کہ کبھی کوئی فیصلہ نہیں کر پاتے۔ رکاوٹوں سے خوف زدہ ہو کر وہ ہمت ہار جاتے ہیں اور کسی نئے کام میں ہاتھ نہیں ڈالتے۔ متنازعہ موضوعات پر وہ کوئی پختہ رائے نہیں بنا سکتے۔

سچے طور پر کھلا ذہن رکھنے والے شخص کا معاملہ البتہ مختلف ہے۔ وہ بے یقینی کا شکار نہیں ہوتا۔ ضرورت پڑنے پر وہ فیصلے کرتا ہے اور اس کے فیصلے قابلِ حصول حقائق پر مبنی ہوتے ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے فیصلے یا رائے سے چمٹا نہیں رہتا۔ چونکہ کسی معاملے سے متعلق تمام حقائق عموماً ہمیں حاصل نہیں ہوتے' لہٰذا ہمیں ایسی نئی معلومات کی گنجائش رکھنی چاہیے جو ہمارے فیصلوں پر اثر انداز ہو سکیں اور جن کی روشنی میں ہم پرانے فیصلوں پر نظر ثانی کر سکیں۔ اگر ہم اس قسم کے کھلے ذہن کا رویہ اختیار کر لیں تو ہم فوراً ہی ان متضاد حقائق کی نشاندہی کر سکیں گے جو رکنے' دیکھنے اور غور کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔

اس کے برخلاف بند ذہن رکھنے والے لوگ اپنے عقائد سے متصادم حقائق کی پرواہ نہیں کرتے۔ وہ ایسے حقائق پر توجہ دیئے بغیر آنکھیں بند کیے اپنی راہ پر سرپٹ بھاگتے چلے جاتے ہیں۔ اس بات کی وضاحت کے لیے خلائی شٹل چیلنجر کی مثال دوبارہ لیجئے۔ ۱۹۸۶ء میں اس شٹل کے حادثے میں سات خلاباز ہلاک ہوگئے تھے۔ ہم اس حادثے کا ذکر پہلے بھی کر چکے ہیں۔ بہرطور جب یہ شٹل اپنے سفر پر روانہ ہونے والی تھی تو اس شٹل کے لیے بوسٹر راکٹ تیار کرنے والی کمپنی کے دو انجینئروں نے شدید مخالفت کی تھی۔ انہوں نے امریکی خلائی ادارے' ناسا کے حکام پر واضح کر دیا تھا کہ فلوریڈا کے لانچ سائٹ پر درجہ حرارت بہت کم ہونے کی وجہ سے شٹل کی پرواز خطرناک ثابت ہوسکتی ہے۔ ان انجینئروں کا موقف یہ تھا کہ فیول ٹینکس کی بعض سیلیں اتنا کم درجہ حرارت برداشت نہیں کر سکتیں۔ لہٰذا پرواز کے دوران دباؤ سے وہ ٹپک سکتی ہیں اور یوں شٹل اور عملے کو خطرہ لاحق ہوسکتا ہے۔

اس واضح تنبیہ کے باوجود ناسا کے حکام نے انجینئروں کی بات ماننے سے انکار کر دیا' حالانکہ وہ انجینئر خلائی پرواز کے پیچیدہ فنی مسائل کے ماہر تھے۔ ان کے مشورے کو نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے تھا۔ حکام نے دوسرے اور ثانوی قسم کے امور کو ترجیح دی۔ اصل میں اس خلائی شٹل کی پہلے بھی کئی پروازیں ملتوی ہو چکی تھیں۔ یوں ایک اور پرواز کو ملتوی کرنا اچھا نہ لگتا تھا۔ عوام اور اخباری نمائندوں کے ہجوم پرواز دیکھنے کے لیے جمع ہو چکے تھے۔ حکام نے غالباً سوچا ہوگا کہ ان سب کو مایوس کرنے سے کوئی اچھا تاثر پیدا نہ ہوگا۔ حکومت کے بڑے بڑے عہدیدار ٹیلی وژن کی سکرین پر ظاہر ہو کر ایک اور کامیاب خلائی پرواز کا تمغہ اپنے سینے پر سجانے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ یہ تھی وہ صورتِ حال جس میں کامیابی کی امید سے سرشار ناسا کے حکام نے انجینئروں کی بات پر کان نہ دھرا اور چیلنجر کی پرواز کا حکم دے دیا۔

بند ذہن کے اس رویے سے نہ صرف سات خلابازوں کی قیمتی جانیں ضائع ہو گئیں بلکہ اس حادثے اور اس کے مضمرات سے برسوں کے لیے شٹل پروازیں بند ہوگئیں۔ حادثے کے فوراً بعد تمام متعلقہ صاحبان کے بند ذہن بھی کھل گئے۔ وہ محتاط ہو گئے اور دوسرے ماہرین کی رائے کو اہمیت دینے لگے۔ لیکن امریکی قوم کو ناسا کے حکام کے بند

ذہنوں کی بھاری قیمت ادا کرنا پڑی۔ چنانچہ شٹل پروازیں دوبارہ شروع کرنے سے پہلے آلات کی از سرِ نو صورت گری پر اربوں ڈالر خرچ کیے گئے۔

جب آپ کو اپنی منتخب کردہ راہ کے غلط ہونے کے اشارے ملنے لگیں تو ان اشاروں کو نظر انداز کر کے' آنکھیں بند کیے چلے جانے میں کوئی فائدہ نہیں ہے۔ یوں تو سبھی شعبوں میں بند ذہن کے رویے ملتے ہیں' لیکن سیاسی مہموں اور مباحثوں میں یہ رویے خاص طور پر دکھائی دیتے ہیں۔ اکثر لوگ کسی ایک سیاسی امیدوار کے حامی بن جاتے ہیں اور پھر اس کے خلاف کوئی بات سننا گوارا نہیں کرتے۔

حقائق سے انہیں قائل کرنے کی کوشش کی جائے تو بھی وہ ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ اپنے پسندیدہ امیدوار کی ہر بات ان کے لیے حرف آخر کی حیثیت رکھتی ہے اور وہ آنکھیں بند کیے اس کی پیروی کیے جاتے ہیں۔

کھلا ذہن رکھنے والوں کا منشور بس یہ ہے کہ ''میرا علم مکمل نہیں۔ بہت سے حقائق میری آنکھوں سے اوجھل ہیں۔ لہٰذا میرے لیے اچھی بات یہ ہے کہ میں نئے حقائق کی تلاش میں اپنا ذہن' آنکھیں اور کان کھلے رکھوں''۔ اگر ہم سب یہ رویہ اختیار کر لیں تو یہ دنیا بہتر اور محفوظ تر ہو سکتی ہے۔

آئندہ ابواب میں ہم استدلال میں مغالطّوں کے دوسرے منابع پر بحث کریں گے۔

علم نجوم

خام استدلال کا مطالعہ

۱۹۹۰ء میں جون کوئگلی کی کتاب ?What Does Joan say شائع ہوئی تھی جس میں اس خاتون نے دنیا کو چونکا دینے والا یہ دعویٰ کیا تھا کہ وہ ایسی جوتشی ہے جو امریکہ کے مشہور سابق صدر رونالڈ ریگن کی اہلیہ نینسی ریگن کو مشورے دیا کرتی تھی۔ کوئگلی نے لکھا ہے کہ:

''نینسی ریگن کے وسیلے سے میرا صدر ریگن سے براہِ راست رابطہ تھا۔ صدر کی تمام پریس کانفرنسوں، اکثر تقریروں، قوم کے نام سرکاری خطاب اور صدارتی طیارے کے اڑنے اور اترنے کے اوقات کا تعین میرے حوالے سے ہوتا تھا۔ یہ میں ہی تھی جس نے صدارتی انتخاب کی مہم کے زمانے میں صدارت کے ایک امیدوار جمی کارٹر کے ساتھ ایک، اور صدارت کے ایک اور امیدوار واٹر مونڈیل کے ساتھ ریگن کے دو مباحثوں کا وقت طے کیا تھا۔ صدر کے تمام طویل اور مختصر غیر ملکی دوروں کے اوقات کا تعین بھی میرے مشورے سے ہوتا تھا۔ تمام سربراہ کانفرنسوں کے لیے بریفنگ کا وقت بھی میں متعین کرتی تھی، تاہم ماسکو میں سوویت یونین کے سربراہ کے ساتھ وقت کا تعین میرے مشورے سے نہ ہوا تھا، البتہ صدر کے ماسکو دورے کا وقت میں نے ہی طے کیا تھا۔

کوئگلی کا دعویٰ ہے کہ وہ سیکنڈ تک کا تعین بھی کرتی تھی۔ اس کی مثال اس نے یہ دی ہے کہ ۱۱ نومبر ۱۹۸۷ء کو صدر ریگن کو اخباری نمائندوں کے سامنے سپریم کورٹ کے جج

انتھونی کینیڈی کے تقرر کا اعلان کرنا تھا۔ کوئگلی نے اس اعلان کے لیے۳۳:۱۰ کے ۲۵ سیکنڈ بعد کا وقت مقرر کیا۔ اس پر سٹاپ واچ دے کر ایک آدمی کو مقررہ لمحے کا اشارہ دینے کا فرض سونپا گیا۔ جونہی لمحہ آیا صدر صاحب نے متعلقہ شخص کے اشارے پر جج کی تقرری کا اعلان کر دیا۔

علم نجوم میں مہارت کا دعویٰ کرنے والی جون کوئگلی نے یہ بھی لکھا ہے کہ ۱۹۸۵ء میں جب صدر ریگن کا کینسر کے سلسلے میں آپریشن ہوا تھا تو انہوں نے نینسی ریگن کو تین روز تک یہ آپریشن ملتوی کرنے کا مشورہ دیا تھا۔

کوئگلی کا کہنا ہے کہ سرکاری امور پر بھی وہ نینسی ریگن پر اثر انداز ہوا کرتی تھی اور اس نے سابق سووے صدر گورباچوف کے بارے میں صدر ریگن کی رائے بدلنے کی خاطر ایڑی چوٹی کا زور لگایا تھا۔ یہاں تک کہ اس نے گورباچوف کا زائچہ بھی تیار کیا تھا۔ اس زائچے سے معلوم ہوا تھا کہ گورباچوف اپنی ذہانت کے بل بوتے پر اقتدار میں آئے تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ روسی نژاد ہونے اور روسی تربیت کے باوجود گورباچوف میں انسان نوازی کی جبلت موجود تھی۔

خیر ہمارا سوال یہ ہے کہ آیا زائچے کی بنیاد پر کسی شخص کے کردار کا تعین کیا جا سکتا ہے؟ کیا کوئگلی کے حیرت انگیز دعوے درست ہیں؟ کیا واقعی اسے امریکہ کے قومی امور پر اس قدر اثر و رسوخ حاصل تھا؟ قومی نوعیت کے مختلف کاموں، صدر کی اہم میٹنگوں اور پریس کانفرنسوں کے وقت کا تعین کیا واقعی نجوم میں مہارت رکھنے کا دعویٰ کرنے والی یہ خاتون کرتی تھی؟

صدر ریگن کی اہلیہ نینسی ریگن نے بھی ایک کتاب لکھی ہے جس کا عنوان ''میری باری'' ہے۔ اس میں وہ لکھتی ہیں کہ نجوم دان کوئگلی مددگار و معاون تھیں...... ایک قسم کی معالج...... تاہم ان کا اثر و رسوخ صرف تعین اوقات تک محدود تھا''۔ ظاہر ہے کہ خاتون اول کی اس شہادت کے بعد اس امر کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ کوئگلی صاحبہ کو صدر ریگن کے کام کے کم از کم بعض پہلوؤں پر اثر و رسوخ حاصل تھا۔

نجوم و جوتش کی مقبولیت

اب معاملہ یہ ہے کہ اگر کوئنگلی کا کوئی ایک دعویٰ بھی درست ہے تو پھر اس سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ امریکہ جیسے بڑے اور ترقی یافتہ ملک کے ایوان صدر میں بھی اہم فیصلے کرتے وقت نجومیوں اور جوتشیوں سے مشورہ کرنا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ یہ صرف صدر ریگن کا قصہ نہیں۔ دنیا کے مختلف علاقوں سے تعلق رکھنے والے بہت سے دوسرے حکمران بھی اس قسم کے مشوروں کے محتاج رہتے ہیں اور ماضی میں تو نجومیوں اور جوتشیوں کو بادشاہوں اور شہنشاہوں کے درباروں میں بہت اثر ورسوخ حاصل ہوا کرتا تھا۔

یہی حال عام لوگوں کا ہے۔ ان کی اکثریت نجوم و جوتش جیسے پراسرار علوم پر یقین رکھتی ہے۔ چنانچہ صرف ہمارے ہاں ہی نہیں بلکہ تمام ملکوں کے بڑے اخبار ہر روز نجومیوں کی پیش گوئیاں شائع کرتے ہیں۔ بعض بڑے اخباروں کا ایک صفحہ کارٹون' پہیلیوں اور لطیفوں کے لیے مخصوص ہوتا ہے۔ اسی پر پیش گوئیوں کا کالم بھی مستقل شائع ہوتا ہے۔ اسی طرح آپ کسی بک سٹور پر جائیں تو وہاں بھی آپ کو نجوم پر کتابیں مل جائیں گی۔ ان میں سے بعض کتابیں بہت دیدہ زیب ہوتی ہیں' ان کی قیمت بھی کافی ہوتی ہیں' تاہم وہ اچھی خاصی تعداد میں فروخت ہوتی ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو نجوم و جوتش کو پائیدار علم خیال کرتے ہیں جس سے روزمرہ کی زندگی میں رہنمائی حاصل کی جاسکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بہت سے لوگ اس کو سائنس کا درجہ دیتے ہیں جس کا موضوع فزکس اور بیالوجی سے اگرچہ مختلف ہے' لیکن وہ ان جیسی ٹھوس ہے۔

ہمارے مقصد کے حوالے سے نجوم اس امر کی ایک عمدہ مثال ہے کہ کسی طرح استدلال کے مغالطّوں سے ایسا ''علم'' پیدا ہو جاتا ہے جو دراصل توہمات کی پیچیدہ صورت سے زیادہ نہیں ہوتا۔ دعویٰ کرنا ایک بات ہے اور اس کو ثابت کرنا اور اور بات ہے۔ آخر ہم کیسے جان سکتے ہیں کہ نجوم حقیقت نہیں' بلکہ افسانہ ہے' محض توہم ہے؟

یہ جاننے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ ہم نجومیوں کے دعووٴں اور طریقوں کا تجزیہ کریں۔ اس استدلال اور ''حقائق'' کا معروضی انداز میں جائزہ لیا جائے جس پر نجومیوں کے نظریوں کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ یہ کام بالکل لینگ میور جیسا ہے جس کی مثال ہم نے اس کتاب کے دوسرے باب میں دی تھی اور جس نے ثابت کیا تھا کہ ڈیرفلائی سات سو میل فی

گھنٹہ کی رفتار سے نہیں اڑتی ہے۔ نجوم کا اس قسم کا تجزیہ ہمیں اس امر کی بہت اچھی مثال مہیا کرتا ہے کہ کس طرح انسان اپنے تخیل سے بت بناتا ہے اور پھر ہزاروں برس تک ان کو پوجتا رہتا ہے۔

نجوم کا نظریہ کیا ہے؟

نجومیوں کا دعویٰ یہ ہے کہ اس وقت زمین پر پانچ ارب سے زیادہ جو انسان آباد ہیں ان کی شخصیت و کردار کی تشکیل میں اہم ترین کردار سورج' چاند' ستاروں اور سیاروں کی پوزیشن نے ادا کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہی صورت حال ماضی میں تھی اور آئندہ بھی جو افراد پیدا ہوں گے ان کا مقدر سورج' چاند' ستاروں اور سیاروں کی زد میں رہے گا۔ وہ افراد کی پیدائش کے وقت ان اجرام فلکی کی پوزیشن کی اساس پر زائچے تیار کرتے ہیں۔ اس طرح وہ افراد کی پوری زندگی کا نقشہ کھینچ دیتے ہیں۔ نجومی چونکہ حساب کتاب کے لیے معیاری فلکیاتی اعداد و شمار سے کام لیتے ہیں' اس لیے وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کا کام سائنسی ہے۔

زائچہ تیار کرنے کے لیے سب سے پہلے کسی فرد کے ''ستارے'' کا تعین کیا جاتا ہے۔ اس مقصد کے لیے استعمال ہونے والی جدول ہم یہاں پیش کریں گے۔ (دیکھئے جدول اول) اس میں اس چکر کے بارہ تارا منڈل شامل ہیں' یعنی آسمان میں تارا منڈلوں کا وہ مجموعہ جن سے زمین سورج کے گرد ہر سال اپنا چکر پورا کرتے ہوئے گزرتی دکھائی دیتی ہے۔

ستاروں کا یہ جھرمٹ دن کے وقت دکھائی نہیں دیتا' تاہم سورج گرہن کے وقت نظر آ جاتا ہے۔ ستاروں کے درمیان سورج کی پوزیشن کا اندازہ تارا منڈل سے طلوع آفتاب سے پہلے اور غروب آفتاب کے بعد کیا جا سکتا ہے۔

نجومی لوگ اس تارا منڈل کو بہت اہمیت دیتے ہیں جن میں پیدائش کے وقت سورج کی موجودگی کو فرض کیا جاتا ہے۔ اس تارا منڈل کے نام کو فرد کا ستارہ قرار دیا جاتا ہے اور اسی مناسبت سے زائچے بنائے جاتے ہیں۔ دعویٰ یہ کہا جاتا ہے کہ یہ ستارہ فرد کی شخصیت اور اس کی زندگی کے واقعات کا تعین کرتا ہے۔

کسی شخص کے ستارے کا تعین کرنے کے لیے جدول اول میں اس کی تاریخ پیدائش دیکھیے' مثلاً اگر کوئی شخص ۴ ستمبر کو پیدا ہوا ہے تو اس کا ستارہ سنبلہ ہے اور اگر اس کی تاریخ پیدائش ۱۱ مارچ ہے تو اس کا ستارہ حوت ہے۔ یہاں ہم متعلقہ جدول درج کر رہے ہیں۔اس کی مدد سے آپ ستارے ڈھونڈ سکتے ہیں:

جدول اول

	تاریخ پیدائش	ستارہ
۱۔	۲۱ مارچ تا ۲۰ اپریل	حمل
۲۔	۲۱ اپریل تا ۲۰ مئی	ثور
۳۔	۲۱ مئی تا ۲۰ جون	جوزا
۴۔	۲۱ جون تا ۲۰ جولائی	سرطان
۵۔	۲۱ جولائی تا ۲۰ اگست	اسد
۶۔	۲۱ اگست تا ۲۰ ستمبر	سنبلہ
۷۔	۲۱ ستمبر تا ۲۰ اکتوبر	میزان
۸۔	۲۱ اکتوبر تا ۲۰ نومبر	عقرب
۹۔	۲۱ نومبر تا ۲۰ دسمبر	قوس
۱۰۔	۲۱ دسمبر تا ۲۰ جنوری	جدی
۱۱۔	۲۱ جنوری تا ۲۰ فروری	دلو
۱۲۔	۲۱ فروری تا ۲۰ مارچ	حوت

ملاحظہ فرمائیے کہ ستارے ۲۱ مارچ کو حمل سے شروع ہوتے ہیں جو بہار کا پہلا دن ہوتا ہے۔اس کے بعد ہر ستارہ کم وبیش ایک ماہ کے بعد شروع ہوتا ہے۔سرطان ۲۲ جون سے شروع ہوتا ہے۔ جب کہ یورپ میں موسم گرما کا آغاز ہوتا ہے۔میزان ۲۱ ستمبر سے شروع ہوتا ہے جو خزاں کا روز اول قرار پا سکتا ہے۔جدی ۲۱ دسمبر سے شروع ہوتا ہے جس کو سرما کا پہلا دن کہنا چاہیے۔نجومیوں کے سال کا آخری مہینہ حوت ہے جو ۲۰ مارچ کو ختم ہوتا ہے۔اس کے بعد نیا سال شروع ہو جاتا ہے۔

یہ چار تاریخیں چاروں موسموں سے براہِ راست منسلک ہیں۔ ہزاروں سال

پہلے نجومیوں اور جوتشیوں نے جو چارٹ بنانے شروع کئے تھے' ان میں یہ تاریخیں بنیادی حوالے کا کام دیتی ہیں۔ آج بھی ان کو اسی انداز میں استعمال کیا جاتا ہے۔

نجومیوں کے لیے ایک ستم ظریفی یہ ہے کہ ان کے مذکورہ بالا بنیادی چارٹ میں دی جانے والی تمام تاریخیں غلط ہیں۔ عرصہ دراز پہلے جب نجومیوں نے انہیں تیار کیا تھا تو اس زمانے میں وہ درست تھیں۔ اس بات کو ہزاروں سال بیت گئے ہیں۔ اس دوران میں فلکیاتی تبدیلیاں بتدریج رونما ہوتی رہی ہیں۔ ان کے سبب متعلقہ تارا منڈل میں سورج کے داخلے کی تاریخیں بدل گئی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ جب بہت دور افتادہ ستارے آسمان میں آہستہ آہستہ حرکت کرتے ہیں تو خود تارا منڈلوں کی صورت بھی بدل جاتی ہے۔

نجومیوں نے ان تبدیلیوں کو یکسر نظر انداز کئے رکھا ہے اور وہ اب بھی قدیم اور غلط جدول استعمال کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ جو لوگ عقرب' دلو یا میزان کو اپنا ستارہ سمجھتے ہیں وہ غلطی کا شکار ہیں۔ ان کے ستارے اصل میں اور ہیں۔

اچھا تو وہ فلکیاتی تبدیلیاں کون سی ہیں جنہوں نے نجومیوں کے طے کردہ تمام ستاروں کو غلط کر دیا ہے؟

گیارہ دن گم گئے

ایک دلچسپ معاملہ یہ ہے کہ امریکی تاریخ کا ہیرو جارج واشنگٹن جب جوان تھا تو اس کا ستارہ دلو تھا کیونکہ وہ ۱۱ فروری کو پیدا ہوا تھا۔ لیکن زندگی کے آخری حصے میں اس کی شخصیت میں تو کوئی نمایاں تبدیلی نہ ہوئی' البتہ اس کا ستارہ بدل کر دلو سے حوت ہو گیا۔ سوال یہ ہے کہ یہ تبدیلی کیونکر پیدا ہوئی؟

بات یہ ہے کہ اٹھارہویں صدی کے وسط میں برطانوی حکومت نے گریگورین کیلنڈر کو رائج کر دیا تھا۔ یہ کیلنڈر پوپ گریگوری ہشتم نے کیلنڈر کی ایک اہم مشکل کو دور کرنے کے لیے ۱۵۸۲ء میں تیار کیا تھا۔ قبل ازیں جولیس سیزر کے زمانے سے جولین کیلنڈر رائج چلا آ رہا تھا۔ اس کیلنڈر میں سال کے ۳۶۵ دن رکھے گئے تھے' تاہم اس تعداد میں ایک چوتھائی دن ضائع ہو جاتا تھا۔ یوں وہ کیلنڈر بتدریج شیڈول سے پیچھے جا رہا تھا۔ اس خامی کو دور کرنے کی خاطر برطانوی حکومت نے اٹھارہویں صدی کے وسط

میں یہ فیصلہ کیا کہ ایک سال سے گیارہ دن خارج کر دیے جائیں تاکہ صحیح تر گریگورین کیلنڈر اپنایا جا سکے۔

اس فیصلے کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ جارج واشنگٹن سمیت برطانوی سلطنت کے تمام شہریوں کی تاریخ پیدائش میں اچانک گیارہ روز کی تبدیلی واقع ہوگئی۔ گویا جارج واشنگٹن کی سالگرہ پہلے گیارہ فروری کو آتی تھی' اب وہ ۲۲ فروری بن گئی۔ اس کے ساتھ ہی اس کا ستارہ دلو سے تبدیل ہو کر حوت بن گیا۔

ہمارے لیے یہ ایک دلچسپ بات ہے لیکن جو بات نجوم پر سنجیدگی سے یقین رکھتے ہیں' ان کے لیے یہ تبدیلی بہت اہم ہونی چاہیے۔ زائچہ سازی میں پیدائش کے صحیح لمحے کا تعین بہت اہم عامل ہے اور یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ ایک سرکاری فیصلے کے سبب لاکھوں کروڑوں افراد کی پیدائش کی تاریخیں ہی بدل گئی تھیں۔

اچھا تو نجومیوں اور جوتشیوں نے اپنے بنیادی مقدمہ کو لاحق ہونے والے اس چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے کیا اقدامات کیے ہیں؟ آپ کو یہ جان کر تعجب ہوگا کہ انہوں نے اس سلسلہ میں کچھ بھی نہیں کیا۔ وہ بدستور پرانی ڈگر پر چل رہے ہیں۔ گم ہو جانے والے گیارہ دنوں کو انہوں نے یکسر بھلا رکھا ہے۔ گیارہ روز کی تبدیلی ان کے اپنے نقطہ نظر سے بے حد اہم ہونی چاہیے تھی' لیکن ان کے کان پر جوں تک نہیں رینگی۔

غلط ستاروں سے پیدا ہونے والے تضاد

عرصہ دراز پہلے جب افراد کے ستاروں کا تعین کرنے کا نظام وضع کیا گیا تھا تو اس زمانے میں جدول اول میں درج تواریخ درست تھیں۔ برسوں کے محتاط فلکیاتی مشاہدات سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ ایک سال مکمل ہونے پر سورج راج چکر کے کسی تارا منڈل میں واپس آ جاتا تھا۔

تاہم صدیوں کے مشاہدے کے بعد ماہرین نے یہ دیکھا کہ ایک سال کے مکمل ہونے پر سورج راج چکر کے کسی تارا منڈل میں بالکل پہلے والی جگہ نہیں ہوتا بلکہ پہلے مقام سے کسی قدر مغرب کی طرف ہوتا ہے۔ یہ بظاہر معمولی سا فرق ہے لیکن ہزاروں برس یک یہ فرق بڑھتا رہا ہے اور یوں اب سورج جدول اول میں تواریخ کے مطابق تارا منڈلوں

میں نہیں ہوتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جدول اول میں درج زدہ معلومات غلط ہیں۔

نتیجہ یہ ہے کہ نجومیوں کو اپنے علم کے بنیادی تصورات سے متعلق بہت سی اہم چیلنج درپیش ہے۔ ایک طرف تو وہ لوگوں کو بتاتے ہیں کہ کسی فرد کی قسمت کا اس کی شخصیت اور اس کی زندگی کے اہم واقعات کا تعین اس کے ستارے سے ہوتا ہے' یعنی اس امر سے کہ اس کی پیدائش کے وقت سورج راج چکر کے کس تارا منڈل میں تھا۔ دوسری طرف جن تواریخ کے حوالے سے نجومی کسی فرد کے ستارے کا تعین کرتے ہیں' وہ غلط ہو چکی ہیں۔

نجومیوں کو اگر معروضیت اور سچائی میں دلچسپی ہوتی اور وہ اپنے علم کو واقعی سائنٹفک بنانے کی لگن رکھتے تو پھر وہ اپنی قدیم جدول کو درست کرتے اور جو تبدیلیاں کیلنڈر میں رونما ہوئی ہیں' ان سے مطابقت پیدا کرتے' لیکن وہ صدیوں سے اس اہم کام سے بے نیاز ہیں اور انہوں نے ستاروں کے چکر میں لوگوں کو مغالطوں میں الجھا رکھا ہے۔

سوال یہ ہے کہ نجومی صاحبان جدول اول میں غلطیوں کو دور کر کے اس کو درست کیوں نہیں بناتے؟ فرض کیجئے کہ وہ کسی روز ایسا کرنے کا فیصلہ کر لیتے ہیں تو پھر انہیں اپنے تمام گاہکوں اور مداحوں کو یہ بھی بتانا ہوگا کہ ان غلطیوں کو دور کرنے کے نتیجے میں ان کے ستارے بھی بدل گئے ہیں۔ آپ خود ہی اندازہ کر لیجئے کہ اس سے دنیا کے لاکھوں کروڑوں نجوم پرست ضعیف الاعتقاد لوگوں پر کے ابیتے گی۔ ایک شخص جو زندگی بھر حمل کو اپنا برج جان کر اپنی قسمت کا حال دیکھتا رہا ہے۔ اب اس کو معلوم ہوگا کہ اس کا اصل برج تو حوت ہے۔ اس قسم کے لوگ پھر نجومیوں سے پوچھیں گے کہ وہ صدیوں سے لوگوں کو دھوکہ کیوں دیتے آئے ہیں۔

ظاہر ہے کہ نجومیوں کے لیے یہ گھاٹے کا سودا ہوگا۔ لہٰذا انہوں نے اپنی غلطیوں کا اعتراف کرنے کے بجائے ایک چالاکی سے کام لیا ہے۔ چنانچہ انہوں نے یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ قسمت کے ستاروں کا مفہوم اب وہ نہیں رہا جو پہلے ہوا کرتا تھا۔ ان کا نیا دعویٰ یہ ہے کہ برجوں کا حقیقی دنیا اور راس چکر کے تارا منڈلوں میں سورج کی پوزیشن سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ چنانچہ جب کوئی نجوم پرست یہ کہتا ہے کہ اس کا برج عقرب ہے تو اب اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس شخص کی پیدائش کے وقت عقرب میں تھا۔ وہ کہیں بھی ہو سکتا تھا'

البتہ جو نام برجوں کے لیے استعمال کیے جاتے تھے' ان کی اہمیت برقرار ہے۔

نجوم پر ایک مشہور کتاب میں اس نکتے کی وضاحت یوں کی گئی ہے کہ راس چکر کے بارہ نشان اور نجومیوں کے بارہ برج مختلف اشیاء ہیں۔ ان میں کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ محض اتفاق ہے کہ ان بارہ نشانوں اور بارہ برجوں کے نام ایک جیسے ہیں' تاہم محض ناموں کی مشابہت سے ان دونوں کو گڈ مڈ کرنا درست نہیں۔

ان قلابازیوں سے آپ علمِ نجوم کی حقیقت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ اس مفروضہ علم میں افسانے کی حقیقت پر ترجیح دی جاتی ہے اور منطقی تضاضوں پر کوئی دھیان نہیں دیا جاتا۔ لہٰذا اس میں کوئی سچائی نہیں ہے۔ اس کو کسی طور بھی سائنس نہیں سمجھا جا سکتا۔

عالمگیریت کے مبالغہ آمیز دعوے

ایک اور دلچسپ بات یہ ہے کہ جب نجومی کسی خاص برج (مثلاً سرطان یا سنبلہ یا عقرب وغیرہ) کے تحت پیدا ہونے والے افراد کے مقدر کی پیش گوئیاں کرتے ہیں تو وہ گروہی امتیاز کو پیشِ نظر نہیں رکھتے' مثلاً وہ امریکیوں' پاکستانیوں' بھارتیوں یا انگریزوں میں فرق نہیں کرتے۔ وہ سب کو ایک ہی کھاتے میں ڈال دیتے ہیں۔

اس وقت ہماری دنیا کی آبادی پانچ ارب سے زیادہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بارہ برجوں میں سے ہر برج کے تحت لگ بھگ پچاس کروڑ افراد آتے ہیں' چنانچہ جب کوئی نجومی برج دلو کے تحت پیدا ہونے والوں کے بارے میں پیش گوئی کرتا ہے تو اس کا اطلاق دنیا بھر میں پھیلے ہوئے تقریباً پچاس کروڑ افراد پر ہوتا ہے۔ یہی حال دوسرے برجوں کا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ بہت بے ہودہ سی بات ہے۔ پچاس کروڑ افراد کے بارے میں کوئی بامعنی دعویٰ درست نہیں ہو سکتا۔

نجوم و جوتش کے ماہرین اس حقیقت پر بھی کوئی توجہ نہیں دیتے کہ ان کا علم چار ہزار سال پرانے علم ہیت پر مبنی ہے جس میں زمین کو کائنات کا مرکز قرار دیا گیا تھا۔ یہ نظریہ اب قطعی طور پر غلط ثابت ہو چکا ہے اور سائنس اس کو رد کر چکی ہے۔ لیکن آج بھی نجومی اور جوتشی صاحبان سورج اور چاند کو ایسے سیارے قرار دیتے ہیں جو زمین کے گرد

گردش کر رہے ہیں۔ سائنس کی دریافت اس کے برعکس ہے' چنانچہ اس نے یہ ثابت کیا ہے کہ سورج زمین کے گرد چکر نہیں لگاتا' بلکہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے۔ نجوم و جوتش سے تعلق رکھنے والے لوگ آخر ہزاروں برس پرانے ان تصورات سے کیوں چمٹے ہوئے ہیں جن کو سائنس واضح طور پر غلط ثابت کر چکی ہے؟ اس کی وجہ محض یہ ہے کہ ان لوگوں کو علم اور سچائی سے کوئی تعلق نہیں' وہ اپنی ہی بوسیدہ دنیا بسائے ہوئے ہیں۔

علت و معلول سے بے نیازی

چاند' سورج' اور ستاروں کی پوزیشن زمین پر بسنے والے کروڑوں اربوں انسانوں کی شخصیت اور مقدر پر کیسے اثر انداز ہوسکتی ہے؟ کیا یہ اثر کششِ ثقل کی قوت کا کرشمہ ہے؟ کائنات کی تمام اشیاء اپنی کمیت کے تناسب کششِ ثقل کی قوت کے سبب ایک دوسرے کو اپنی طرف کھینچتی ہیں۔ فاصلے زیادہ ہونے سے یہ قوت کمزور ہوتی جاتی ہے۔ سائنس دانوں نے زمین پر بسنے والے لوگوں پر مریخ یا عطارد کی کششِ ثقل کے اثرات کا حساب لگایا ہے اور وہ عملی طور پر صفر ثابت ہوئے ہیں۔ بچے کی پیدائش پر اس کے قریب موجود ڈاکٹر کی اس بچے پر کشش کسی بھی سیارے کے مقابلے میں زیادہ ہوتی ہے' جہاں تک ستاروں کا تعلق ہے' سورج کے علاوہ جو ستارہ زمین کے قریب ترین ہے' اس کا فاصلہ بھی زمین سے چوبیس ہزار ارب میل ہے۔ اس کی قوت ثقل ہمارے نظامِ شمسی کے کسی سیارے سے بھی کم ہے۔

اچھا تو یہ اثر کیا برقی یا مقناطیسی قوتوں کے سبب ہے؟ اگر ایسا ہوتا تو پھر کسی سیارے یا ستارے کی برقی قوت کے مقابلے میں گھر کے اندر نصب برقی تاروں کی قوت ہم پر زیادہ اثر انداز ہوتی۔ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہوتا۔ گویا حقیقت کی دنیا میں ان کا کوئی وجود نہیں۔ یہ وہ فسانے ہیں جو نجومیوں اور جوتشیوں نے گھڑ رکھے ہیں۔

اگر اجرامِ فلکی کے اثرات انسانوں تک ایکس ریز' کاسمک ریز یا تابکاری کی دیگر صورتوں کے وسیلے سے پہنچتے ہیں اور ان اثرات کو جاننے کے لیے بے حد حساس آلات درکار ہوتے ہیں تو سوال یہ ہے کہ نجومیوں نے زائچے بناتے وقت ان اثرات کو کبھی پیشِ نظر کیوں نہیں رکھا۔

اس قسم کے اثرات کا تعلق طبعی دنیا سے ہوسکتا ہے، لیکن وہ انسانوں کی زندگی، شخصیت اور مقدر کی صورت گری میں بنیادی کردار کیونکر ادا کر سکتے ہیں؟ اس ساری بحث کا حاصل یہ ہے کہ نجومیوں کے پاس ایسے نظریے کو ثابت کرنے کے لیے ایک ہی جواز باقی رہ جاتا ہے، لیکن وہ اس کا ذکر کرنا پسند نہیں کرتے۔

وہ جواز جادو ہے۔ اگر وہ اس کا سہارا لیں اور اپنے کام کو جادوٹونے کے خانے میں رکھیں تو ان کا موقف زیادہ قابل فہم ہوسکتا ہے۔

بات اصل میں یہ ہے کہ نجوم و جوتش کی بنیاد زمانہ قدیم میں رکھی گئی تھی، جب یہ یقین کیا جاتا تھا کہ دیوتا آسمان میں سورج، چاند اور سیاروں کو کھینچتے ہیں اور یہی دیوتا انسانوں کے مقدر کے مالک بھی سمجھے جاتے تھے۔ آج کے زمانے کے نجومی بھی چونکہ قدیم زمانے میں مرتب ہونے والے طریقے استعمال کرتے ہیں جن کی بنیاد دیوتاؤں کی مافوق الفطرت قوتوں پر رکھی گئی تھی، اس لیے ان کے زائچوں کی بنیاد بھی اصل میں پرانے زمانے کی دیوی دیوتاؤں اور ان کی مفروضہ قوتوں پر ہے۔

پرانے زمانے کے نجوم یہ سوال نہیں کرتے تھے کہ دیوتا انسانوں کی زندگی پر کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس زمانے میں چونکہ تمام لوگ دیوتاؤں اور ان کی بے پناہ قوتوں پر یقین رکھتے ہیں، اس لیے اس سوال کی گنجائش ہی موجود نہ تھی۔ ہمارے زمانے کے نجومیوں نے قدیم توہم پرست اندازِ فکر کے نتائج تو قبول کر رکھے ہیں، تاہم دیوی دیوتاؤں کو بیچ سے خارج کر دیا ہے۔ بہرحال اس کے باوجود یہ طے شدہ بات ہے کہ نجوم کا علم سراسر توہمات پر مبنی ہے۔

برجوں کا قصہ

یونانی لوگ قسمت کی دیوی ٹائکی پر عقیدہ رکھتے تھے جو خوش قسمتی کو بدقسمتی سے اور غالباً بدقسمتی کو خوش قسمتی سے بدلنے کے لیے ایک پہیہ گھماتی رہتی تھی۔ آج کے نجومی اور جوتشی بھی یہی کام کرتے ہیں، البتہ وہ دیوی کا نام نہیں لیتے۔ انہوں نے پوری زمین کو قسمت کا پہیہ بنا رکھا ہے۔

نجومیوں کا دعویٰ ہے کہ آسمان مختلف خانوں میں منقسم ہے جن کو برجوں کا نام دیا

جاتا ہے۔ یہ برج زمین کے ساتھ گردش کرتے ہیں۔ ہر برج کا مختلف انسانی امور جیسے صحت، دولت، مزاج، سفر، آرزو اور خاندان وغیرہ سے تعلق ہوتا ہے۔ جب زمین رُخ بدلتی ہے تو ساتھ ہی برج بھی رُخ بدلتے ہیں۔ اس گردش کے دوران آسمان کے مختلف حصے ان غیر مرئی برجوں میں داخل ہوتے اور نکلتے رہتے ہیں۔

جب کوئی سیارہ کسی برج میں داخل ہوتا ہے تو اس برج کی صفات اس سیارے کے قبضے میں چلی جاتی ہیں اور وہ انسانی امور پر اثر ڈالتا ہے۔ برج میں چند گھنٹے گزارنے کے بعد زمین کی گردش کے باعث سیارہ بھی اس برج سے نکل آتا ہے اور کسی دوسرے برج میں داخل ہو جاتا ہے۔ یہ ہے وہ سوچ جس کے مطابق نجومی زائچے بناتے ہیں۔

کسی تمثیل میں دو یا دو سے زیادہ مختلف اشیاء یا واقعات کی صفات میں مشابہتیں تلاش کی جاتی ہیں۔ بعد ازاں ان مشابہتوں کی بنا پر ان اشیاء یا واقعات کے درمیان امکانی روابط کے بارے میں کوئی مفروضہ تیار کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ ہم نے چھٹے باب میں دیکھا، تماثیل استدلال کی ایک اہم صورت ہیں اور وہ عمومی اصولوں یا واقعات کے اسباب سے متعلق مفروضے مرتب کرنے میں بہت مفید ثابت ہوتی ہیں، تاہم مفروضے درست ہو سکتے ہیں اور غلط بھی، جب تک تجرباتی مشاہدوں سے مفروضوں کو پرکھا نہ جائے اور ان کی تصدیق نہ ہو جائے، اس وقت تک وہ زیادہ اہم نہیں ہوتے۔

نجومی صاحبان اس تکلف میں نہیں پڑتے۔ تخیل کے زار پر وہ حقائق کو روند دیتے ہیں۔ ہزاروں کی تعداد میں وہ تعمیمات بناتے ہیں اور انہیں پرکھنے کی تکلیف گوارا نہیں کرتے۔

ذرا اس بات پر توجہ فرمایئے کہ نجومی صاحبان آسمان پر اپنے برجوں سے کیا سلوک کرتے ہیں۔ پہلے تو وہ کسی دلیل یا کسی ثبوت کے بغیر آسمانوں کو خانوں میں (یعنی برجوں میں) تقسیم کرا دیتے ہیں۔ یہ ان کے منہ زور تخیل کا کرشمہ ہے، وگرنہ حقیقت میں ان خانوں یا برجوں کا کوئی وجود نہیں۔ اگرچہ کبھی وہ آپس میں ان برجوں کی تعداد پر اختلاف کرتے ہیں، تاہم ان کی اکثریت اس بات پر متفق ہے کہ ان برجوں کی تعداد بارہ ہے۔

آسمان کو اس طرح تقسیم کرنے کے بعد بھی ان کا منہ زور تخیل سرد نہیں ہوتا بلکہ وہ ہر برج سے مختلف صفات منسوب کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر نجوم کے ایک نظام میں

پہلا برج انسانی ذات، فرد، مزاج اور شخصیت سے متعلقہ صفات کا حامل ہے۔ دوسرا برج جذبات، احساسات، دنیاوی وسائل خصوصاً مال وزر سے تعلق رکھتا ہے۔ جب کہ تیسرا برج چھوٹے موٹے سفر، ہمسایوں اور ذہنی دلچسپیوں کی صفات رکھتا ہے۔ باقی نو برج بھی اس قسم کی دوسری صفات وخصوصیات کو کنٹرول کرتے ہیں۔

اس کے بعد نجومی کسی دلیل یا ثبوت کے بغیر انسانی صفات سیاروں سے منسوب کر دیتے ہیں۔ ہر سیارے کے بارے میں یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ پانچ ارب انسانوں کے مقدر پر کسی نہ کسی طور پر اہم انداز میں اثر انداز ہوتا ہے، تاہم سیارہ انسانوں کے مقدر پر اس وقت تک مکمل طور پر اثر انداز نہیں ہوسکتا جب تک وہ کسی برج میں داخل نہ ہو۔ گویا نجومیوں کا دعویٰ یہ ہے کہ جب کسی سیارے جیسا طاقت ور اثر کسی برج میں داخل ہوتا ہے تو وہ اس برج کی تمام صفات پر کنٹرول حاصل کر لیتا ہے۔ چنانچہ جب مریخ (جس کے بارے میں نجوم کہتے ہیں کہ وہ دیگر صفات کے علاوہ متشدد کردار کا مالک ہے برج اول میں داخل ہوتا ہے (یعنی آسمان کا وہ خانہ یا حصہ جو مزاج اور شخصیت کے بنانے بگاڑنے کا کام سرانجام دیتا ہے) تو یہ متشدد سیارہ ان انسانی صفات پر حاوی ہو جاتا ہے اور اس وقت جو بچے پیدا ہوتے ہیں، ان کے کردار وشخصیت میں تشدد پسندی کے رجحانات نمایاں طور پر شامل ہو جاتے ہیں۔

ہم جانتے ہی ہیں کہ یہ بات ممکن نہیں کہ اس وقت پیدا ہونے والے تمام بچوں کے مزاج میں تشدد پسندی ہو۔ ان میں سے بعض دھیمے مزاج کے اور معقول قسم کے بھی ہوں گے۔ لیکن نجومیوں کو ان حقائق سے کوئی سروکار نہیں۔ وہ آنکھیں بند کئے اپنی بوسیدہ ڈگر پر چلتے رہتے ہیں۔ سیارہ زہرہ کو وہ محبت اور حسن کا انچارج قرار دیتے ہیں۔ اگر وہ بارہویں برج میں ہو جو مخفی قابلیتوں کا برج ہے تو اس وقت پیدا ہونے والے بچے معقولیت پسند قرار پاتے ہیں۔

خیر، اس مرحلے پر نجومی کو اس امر کا فیصلہ کرنا ہوگا کہ مریخ کا اثر ورسوخ زیادہ ہوتا ہے یا زہرہ کا، زہرہ زیادہ چمکدار دکھائی دیتا ہے یا مریخ؟ نجومی صاحبان کے نزدیک چمک کا مطلب زیادہ بااثر ہونا ہے۔ اس لیے انسانوں پر چمک دار زہرہ کا اثر مدھم مریخ کی نسبت زیادہ سمجھا جاتا ہے۔ یوں گویا بچہ کم متشدد اور زیادہ شریف النفس ہوگا۔ بصورت

دیگر، فرض کیجیے کہ مریخ زیادہ چمکدار ہے اور زہرہ مدھم ہے، تب مریخ کا زیادہ اثر پڑے گا۔غریب بچے کی حالت کا آپ خود ہی اندازہ کر لیجیے کہ اس کی شخصیت اور مقدر کا تعین ایسے سیاروں کی مدد سے کیا جا رہا ہے جن کو اس نے ابھی دیکھا ہے اور نہ ہی ان کا ذکر سنا ہے۔

گویا نجومی اصل میں یہ کہے گا کہ فلاں دن اور فلاں وقت پر پیدا ہونے والے جوجی پر پہلے برج میں مریخ کا اثر تھا جس کے تحت اس کی شخصیت پر تشدد پسندی غالب رہے گی۔ دوسری طرف بارہویں برج میں زہرہ کا اثر تھا جس کا تقاضا یہ ہے کہ جوجی معقول اور نرم مزاج رہے، غالباً یہ معاملہ اب جوجی کے والدین پر چھوڑ دیا جائے گا کہ وہ اپنے بچے کے لیے کسی قسم کا مقدر پسند کرتے ہیں۔فرض کیجیے کہ بڑا ہو کر جوجی ڈاکو بنتا ہے تو نجومی کہے گا: ''دیکھا جناب، میں نے پہلے ہی پیش گوئی کر دی تھی کہ جوجی زندگی میں مار دھاڑ کرتا رہے گا۔'' اس کے برعکس اگر وہ بڑا ہو کر امن کا نوبیل انعام حاصل کرتا ہے تو پھر بھی نجومی جھوٹا ثابت نہ ہوگا۔ وہ فوراً کہے گا کہ ''میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ جوجی معقول اور امن پسند بنے گا''۔

یوں ہم دیکھتے ہیں کہ علم نجوم ایسا کھیل ہے جس میں اس علم کو جاننے کا دعویٰ کرنے والے کبھی نہیں ہارتے۔ان کی پیش گوئیاں ہی ایسی غیر منطقی اور گول مول ہوتی ہیں کہ ان کی متضاد تشریحات بھی کی جا سکتی ہیں۔

آیئے ہم اب اس سوال پر توجہ دیں کہ آسمان میں خیالی برجوں کی تعداد کتنی ہے؟ ماہرین فلکیات آر بی کلور اور پی اے لانہ نے جوتشی نظاموں کا مطالعہ کیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ:

اب تک برج نظاموں کی جو تعداد پیش کی گئی ہے وہ زیادہ سے زیادہ پچاس ہے (بعض نظاموں میں ۲۴ اور بعض میں ۲۸ جداگانہ برج ہیں) تاہم ان میں سے صرف چوبیس برجوں کو بظاہر کارآمد سمجھا جاتا ہے اور چار ایسے ہیں کہ جن کو نجومی صاحبان بہت زیادہ استعمال کرتے ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ قسمت کی دیوی نے انسانوں کے مقدر کے پچاس مختلف ماڈل تیار کر رکھے ہیں اور نجومی ان میں سے کسی کو چن کر اپنا کام چلا سکتے ہیں۔نتیجہ یہ ہے

کہ جب کوئی گاہک ۱۲ برجوں کے نظام سے کام چلانے والے نجومی کے پاس جاتا ہے تو اس کی قسمت اور ہوتی ہے اور جب وہی شخص بیس برجوں والے نظام سے کام لینے والے نجومی کے پاس جاتا ہے تو نجومی کے بدلنے سے اس کا مقدر بھی بدل جاتا ہے۔ اس کے باوجود نجومی صاحبان کو اصرار ہے کہ ان کا علم سائنٹیفک ہے۔

استدلال کا وہ کون سا نظام ہے جس کے تحت نجومی اس امر کا تعین کرتے ہیں کہا نہیں بارہ برجوں والا نظام استعمال کرنا چاہیے یا بیس یا چوبیس برجوں والا؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ سب کچھ ان کی مرضی پر منحصر ہے' مثلاً کوئی نجومی کہہ سکتا ہے کہ دن میں بارہ گھنٹے ہوتے ہیں' لہٰذا بارہ برجوں والا نظام بہتر رہے گا۔ یا وہ یوں سوچ سکتا ہے کہ دن رات میں چوبیس گھنٹے ہوتے ہیں' اس لیے چوبیس برجوں والا نظام اچھا ہے۔ شاید اس کو یہ خیال آ سکتا ہے کہ ہاتھوں اور پاؤں کے انگوٹھوں اور انگلیوں کی تعداد بیس ہوتی ہے' لہٰذا بیس برجوں والا نظام ہی ٹھیک ہے۔ کلور اور الانہ ذکر ہم نے ابھی کیا تھا۔ انہوں نے اس قسم کے استدلال کی ایک مثال درج کی ہے۔ آپ بھی سن لیجئے وہ لکھتے ہیں کہ:

''فگان کا کہنا ہے کہ آسمان کی ابتدائی تقسیم بارہ خانوں کے بجائے آٹھ خانوں میں تھی کیونکہ قدیم زمانے میں رات اور دن کو چار حصوں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ بعدازاں ان کے آٹھ حصے کر دیے گئے۔ چونکہ یہ آٹھ حصے رات دن کو مکمل کرتے ہیں' اس لیے آسمان کے خانوں کی تعداد بھی اسی قدر ہونی چاہیے۔''

گویا جو نجومی آٹھ برجوں والے نظام کو قبول کرتا ہے وہ قدیم روایت پر عمل پیرا ہے۔ اس کا نظریہ یہ ہو گا کہ جو شے جس قدر پرانی ہے اس قدر بہتر ہو گی' لیکن اس کو بھی ایک مس ءلہ درپیش ہے اور وہ یہ ہے کہ جو انسانی صفات بارہ برجوں میں تقسیم کی جاتی ہیں وہ ان کو سمیٹ کر کس طرح آٹھ خانوں میں رکھے گا۔ نجومیوں نے اس کا سادہ سا حل تلاش کر رکھا ہے۔ وہ نویں' دسویں' گیارہویں اور بارہویں برج کو ہی مسمار کر دیتے ہیں۔

سوچ کا یہ انداز ہمیں قرونِ وسطیٰ کی یاد دلاتا ہے جب لوگ اس مسئلے پر جوش و خروش سے بحث کیا کرتے تھے کہ کسی سوئی کی نوک پر کتنے فرشتے کھڑے ہو سکتے ہیں۔

علامتوں کی مختلف تعبیریں

اس ساری گڑبڑ سوچ کا عملی نتیجہ کیا ہے؟ آیئے ہم فرض کرتے ہیں کہ ۱۰ جنوری کو پیدا ہونے والا کوئی فرد نجوم کی کتاب سے کچھ رہنمائی حاصل کرنا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ سب سے پہلے وہ اس کتاب کی مدد سے اپنا ستارہ ڈھونڈے گا۔ کتاب اس کو بتائے گی کہ چونکہ وہ ۱۰ جنوری کو پیدا ہوا تھا لہٰذا اس کا ستارہ جدی ہے۔ اس کے بارے میں نجومیوں کی ایک مشہور کتاب کے دعوے مندرجہ ذیل ہیں:

> جدی ستارے والے شخص کو ایسے لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے جن کے ساتھ وہ شخصی رشتے استوار کر سکے' کیونکہ اس قسم کے رشتوں کے بغیر وہ آرزو مندانہ سکیموں اور بڑے پیمانے کی سماجی منصوبہ بندی میں یا پھر صوفیانہ اور کائناتی دلچسپیوں میں الجھا رہے گا۔ جدی صاحبان ایسے تجربوں اور استعداد کا حوالہ دے سکتے ہیں جن کو اکثر لوگ ''صوفیانہ'' قرار دیں گے۔ تاہم یہ حوالہ عموماً شعور کی ایک خاص قسم کے بارے میں ہوتا ہے جو نظم کی ماورائی قسم یا ماورائی کائناتی نظام میں کارفرمائی کا دلدادہ ہوتا ہے۔ اس قسم کی قوت کے ذریعے جدی شخص دوسروں پر غالب آنے کی خواہش کر سکتا ہے تا کہ جس شے کو وہ اپنا مقدر خیال کرتا ہے' اس کو حاصل کر سکے۔

اس اقتباس سے آپ کے پلے کچھ پڑا ہے؟ کوئی بات صاف طور پر آپ کی سمجھ میں آئی ہے؟ یہ نظم کی ماورائی قسم' آخر کیا بلا ہے اور ''ماورائی کائناتی نظام میں کارفرمائی' کا کیا مطلب ہے؟'' اس اقتباس سے ۱۰ جنوری کو پیدا ہونے والے کسی شخص کو کوئی رہنمائی ملتی ہے تو وہ بس یہ ہے کہ اس کو دوسرے لوگوں کے ساتھ رشتے بنانے چاہئیں۔ بلاشبہ یہ ایک اچھا مشورہ ہے' لیکن یہ اچھا مشورہ تو سب لوگوں کے لیے ہے اور اس کے لیے نجومی کو نذرانہ پیش کرنے کی ضرورت کیا ہے؟

یہاں ہم نے نجوم و جوتش کی کتابوں میں سے محض ایک اقتباس پیش کر کے ان کی کتابوں کے ابہام اور لغویت کو اجاگر کرنا چاہا ہے۔ اصل میں ان کی تمام تحریروں کی یہی کیفیت ہے۔ وہ صرف ذہنی الجھاؤ پیدا کرتی ہیں اور لکھنے والے جان بوجھ کر یہ الجھاؤ پیدا

کرتے ہیں' وجہ اس کی یہ ہے کہ ان کے پاس کوئی ٹھوس بات کہنے کے لیے نہیں ہوتی۔

اخباری کالموں کے لیے نجومی صاحبان زائچے تیار کرتے ہوئے ایسے ہی حربوں سے کام لیتے ہیں۔ وہ اپنے قارئین یا گاہکوں کے بارے میں سوائے تاریخ پیدائش کے اور کچھ نہیں جانتے۔ زائچوں میں عمر' قومیت' نسل' ثقافتی پسِ منظر یا حالاتِ زندگی سے متعلق کچھ نہیں کہا جاتا۔ حالانکہ انسانی شخصیت کی تشکیل میں یہ اور بعض دوسرے عوامل بہت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ان کے بجائے نجومیوں اور جوتشیوں کو بس پیدائش کے وقت اور تاریخ میں دلچسپی ہوتی ہے جس کے حوالے سے وہ کسی شخص کی پیدائش کے وقت چاند' سورج اور سیاروں کے مقام کا تعین کرتے ہیں۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ وہ کسی فرد کی شخصیت کو جاننے کے لیے ضروری باتوں کو تو نظرانداز کر دیتے ہیں اور اجرامِ فلکی کی حرکت پر انحصار کرتے ہیں۔

سیاروں کے لیے دوراز کار تمثیل

نجوم کی ہر کتاب پانچ ارب سے زیادہ انسانوں پر چاند' سورج' سیاروں اور ستاروں کے ''اثرات'' کے بارے میں سیکڑوں دعوے پیش کرتی ہے۔ بعض کتابوں میں تو ہزار سے بھی زیادہ دعوے شامل ہوتے ہیں۔ ان کتب میں سے کسی کو پڑھتے ہوئے جب ہم یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ نجومیوں کو یہ کیسے پتہ چلتا ہے کہ ان کے دعوے درست ہیں' تو ہم کو اس سوال کے جواب میں کسی تجربے' جانچ پڑتال یا تصدیق کا کوئی اشارہ نہیں ملتا۔ حالانکہ تجربے' جانچ پڑتال اور تصدیق کے بغیر کسی دعویٰ یا بیان کو درست تسلیم کرنے کا جواز موجود نہیں۔ نجومیوں کی کتابوں میں البتہ ہمیں جو شے ملتی ہے وہ دوراز کار قسم کی تمثیلیں ہیں۔

اس قسم کی تمثیلیں خاص طور پر انسانی زندگی اور خصوصاً نوزائیدہ بچوں پر ستاروں اور سیاروں کے اثرات بیان کرنے کے لیے استعمال کی جاتی ہیں۔ وہ کون سی نمایاں خصوصیات ہیں جو کسی سیارے کو دوسرے سیاروں سے ممتاز کرتی ہیں؟ پرانے زمانے کے نجومیوں کا خیال تھا کہ ہر سیارے کا کوئی نہ کوئی دیوتا ہوتا ہے جو اس کو حرکت دیتا ہے۔ چنانچہ ان صفات کے حوالے سے ہم اس دیوتا کی فطرت کو جان سکتے ہیں۔ لہٰذا

پرانے زمانے میں یہ بات فطری محسوس ہوتی تھی کہ ان صفات کو دیوتاؤں سے منسوب کیا جائے۔ گویا نجومی سیاروں سے جو صفات منسوب کرتے تھے' اصل میں وہ سیاروں کے دیوتاؤں کی صفات تھیں۔ دیوتا یہی صفات انسانوں تک منتقل کر دیتے تھے۔ وہ زمانے اور ان کے قصے کہانیوں کا وقت اب بیت چکا ہے۔ لیکن آج کے نجومی اور جوتشی انہی بوسیدہ ہتھیاروں سے کام چلاتے ہیں۔

یہ استدلال اس قدر واہیات ہے کہ ہم کو تعجب ہوتا ہے کہ کوئی شخص کیونکر اس پر یقین کر سکتا ہے' تاہم امر واقعہ ہے کہ بہت سے لوگ آج بھی نجوم و جوتش پر ایمان رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اجرام فلکی ہمارے مقدر پر اثر انداز ہوتے ہیں لہٰذا یہ جاننا اہم ہے کہ یہ اثرات کیونکر اخذ کئے گئے تھے۔

یہاں ہم مثال کے طور پر سیارہ مریخ پر توجہ کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ جب وہ آسمان میں بعض خاص مقامات پر ہوتا ہے تو اس سے انسانی معاملات پر کس قسم کے ''اثرات'' پیدا ہوتے ہیں۔

تلازم: بیرونی دنیا کے ساتھ جارحانہ ربط' تشدد' جذبہ' فتح' بقا' عمل' قوت' توانائی' حرکت' جرأت۔

علامتی اہمیت: زندگی میں کامیابی مردانہ جنس' قوت حیات' حرارت' عمل' تباہی' تباہی و تعمیر نو' رقیب' فولادی آلات اور ہتھیار وغیرہ کے حصول کے لیے جدوجہد۔

عضویاتی رابطے: فعالیت اور کرخت لہجہ' بیرونی مردانہ جنسی اعضا' غصہ' جسمانی بال' جسمانی قوت اور ناک۔

اچھا اب ہمارا سوال یہ ہے کہ نجومیوں' جوتشیوں اور ستارہ شناسوں کو مریخ کے بارے میں ان مفروضہ' حقائق کا علم کیونکر حاصل ہوتا ہے؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ انہوں نے یہ علم چار ہزار سال پرانے جوتشیوں سے حاصل کیا ہے۔ خیر یہ بات ہے تو پوچھنا چاہیے کہ ہزاروں سال پرانے جوتشیوں نے یہ علم کہاں سے حاصل کیا تھا؟ جواب اس کا یہ ہے کہ زمانہ قدیم کے ان جوتشیوں نے دیکھا کہ ایک سیارے کا رنگ سرخ سا ہے۔ سرخ رنگ خون کا رنگ ہے اور خون جنگ و جدل میں بہایا جاتا ہے۔ یوں وہ یہ دور

کی کوڑی لائے کہ مریخ کوئی خونخوار قسم کا سیارہ ہے اور ضرور جنگ کا دیوتا ہی اس کو آسمان میں حرکت دیتا ہوگا۔

اوپر درج کی جانے والی انسانی صفات کو دوبارہ پڑھئے۔ پرانے زمانے کے جوتشیوں کا خیال یہ تھا کہ ان تمام صفات پر سیارہ مریخ کی حکمرانی ہے۔ ان کی پیروی میں آج کے جوتشی بھی اسی خیال کے حامل ہیں۔ یہ صفات سخت گیر' جھگڑالو اور اس قسم کے افراد میں پائی جاتی ہیں جن کی نمائندگی ہماری پنجابی فلموں کے مقبول اداکار سلطان راہی اور مصطفیٰ قریشی کرتے ہیں۔

یہاں ایک دوراز کار تمثیل سے کام لیا جاتا ہے اور سرخ رنگ سے شروع ہو کر خون' جنگ وجدل اور پھر بے انتہا طاقتور انسان سے مشابہ نڈر دیوتا جبکہ جرنیل کو دوڑایا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں پرانے زمانے کے جوتشیوں کو خیر معاف کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ انکے زمانے میں فلکیات کا سائنسی علم موجود نہ تھا۔ لیکن آج کے جوتشیوں کے پاس تو کوئی بہانہ ہی نہیں ہے۔

اس مثال کو سامنے رکھ کر سیارہ زہرہ کے بارے میں ایسی دوراز کار تمثیل ہم خود ہی تیار کر سکتے ہیں۔ زہرہ کو دیکھیے' وہ ایک خوبصورت دودھیا سا سیارہ ہے۔ سورج اور چاند کے بعد اس کی روشنی بھی سب سے زیادہ ہے اس طرح حسن اور اس سے متعلقہ صفات زہرہ دیوی کے ماتحت آ جاتی ہیں۔ اس کو حسن و عشق کی دیوی قرار دیا جاتا ہے اور جن صفات پر اس کی حکمرانی سمجھی جاتی ہے ان میں کشش' توازن' حسن' احساسات' جسمانی مسرتیں' محبت کرنے کی اہلیت' دولت' جنس اور ملکیت وغیرہ شامل ہیں۔

اس فہرست میں دولت اور ملکیت کو شامل دیکھ کر ہمیں تھوڑا سا تعجب ہوتا ہے۔ شاید ہم دولت اور ملکیت کو حسن و عشق کی فہرست میں شامل کرنا نہیں چاہتے۔ یہاں ان کو فہرست میں شامل کرنے کے پیچھے زمانہ قدیم یا بعد کے زمانے کے کسی جوتشی کے تعصّبات کارفرما ہیں۔ خیر' یہ تو ہم بتا ہی چکے ہیں کہ زہرہ سیارے کو دیوتا کے بجائے دیوی قرار دیا جاتا ہے۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ جدید ماہرین فلکیات زہرہ پر سیٹلائٹ اتار چکے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ سیارہ کسی خاص حسن کا حامل نہیں ہے۔ وہاں کا درجہ حرارت ۹۰۰ فارن ہائٹ ہے۔ اس لحاظ سے اس کو جہنم ہی سمجھنا چاہیے۔ وہاں سطح پر پانی ناپید ہے' کیونکہ سارا

پانی حرارت جذب کر چکی ہے۔ ماحول میں زیادہ تر کاربن ڈائی آکسائیڈ ہے اور آکسیجن کا کوئی وجود نہیں۔ یہ سیارہ گھنے بادلوں میں چھپا ہوا ہے اس لیے اس کی سطح کا براہِ راست مشاہدہ ممکن نہیں۔ ان بادلوں میں سلفیورک ایسڈ کی بھاری مقدار شامل ہے۔ یہ ساری باتیں ظاہر کرتی ہیں کہ کم از کم انسانی نقطہ نظر سے سیارہ زہرہ میں کوئی حسن و جاذبیت نہیں ہے۔ یہاں دوراز کار تمثیلوں کے لیے کافی گنجائش موجود ہے' تاہم ابھی تک کسی جوتشی نے اس چیلنج کو قبول نہیں کیا۔

انسانی مقدر پر سیارہ مشتری کے اثرات بھی ویسے ہی دوراز کار تمثیل سے اخذ کئے جاتے ہیں جیسے کہ مریخ اور مشتری کے اثرات اخذ ہوتے ہیں۔ مشتری' زہرہ اور مریخ کے مقابلے میں سورج سے بہت دور ہے۔ اس لیے وہ سورج کے گرد چکر پورا کرنے میں زیادہ وقت لیتا ہے۔ اس کا چکر گیارہ برس میں پورا ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف زہرہ آٹھ ماہ میں اور مریخ دو سال میں سورج کے گرد چکر مکمل کرتے ہیں۔ یوں جب انسانوں کی زندگی سے تمثیل اخذ کی جاتی ہے تو پھر مشتری دیوتاؤں کا مرد بزرگ قرار پاتا ہے۔ یوں سمجھ لیجئے کہ وہ دیوتاؤں کا صدر ہے۔

مریخ کے لیے جن صفات کی فہرست تیار کی جاتی ہے اس میں بلوغت' رجائیت' بیرون بینی' نیک دلی' اعزازات' اختیار' دانائی' قابلِ اعتماد ہونا' آسائش' دولت' عیش و عشرت' منصف اور آقا ہونے کے صفات شامل ہیں۔ یہ ساری صفات ایک دوراز کار تمثیل کے بل بوتے پر آسمان میں مریخ اور زہرہ کے مقابلے میں مشتری کی باوقار رفتار سے اخذ کی جاتی ہیں۔

اس قسم کے خام اور بچگانہ استدلال کے ذریعے جوتشی بے بنیاد' حقائق کا پہاڑ کھڑا کر دیتے ہیں' حالانکہ ان کے کسی دعویٰ کی تجربے یا مشاہدے سے تصدیق نہیں ہوتی۔ دراصل ان کے حقائق محض تخیل کی پرواز پر مبنی افسانے ہیں۔ جوتشیوں کی دنیا عجیب وغریب ہے۔ اس دنیا میں ہر ترنگ کو سچا مان لیا جاتا ہے۔

زائچہ سازی بھی کھیل ہے

جس طریقے سے جوتشی زائچے بناتے ہیں وہ لوگوں کے بورڈ گیمز کھیلنے کے

طریقے سے بہت ملتا جلتا ہے۔ ویسے نجوم و جوتش کو کھیل قرار دیتے ہوئے بھی احتیاط سے کام لینا چاہیے' کیونکہ کھیلوں میں بھی سنجیدگی' ذمہ داری اور طے شدہ اصولوں کی پاسداری سے کام لینا پڑتا ہے۔ جب کہ نجوم و جوتش میں سب چلتا ہے والا معاملہ ہے۔

آیئے ہم اس بات پر توجہ دیں کہ ہر سال نجومی اور جوتشی اخباری کالموں' کتابوں اور انفرادی زائچوں کے ذریعے لوگوں کے مقدر کے بارے میں ہزاروں' لاکھوں دعوے اور پیش گوئیاں کرتے ہیں' لیکن کیا کبھی کسی نے ان کے دعووٴں اور پیش گوئیوں کی جانچ پڑتال کی ہے؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ شاذ و نادر ہی ایسی کوئی کوشش کی جاتی ہے۔ اس امر کی ایک وجہ یہ ہے کہ جوتشیوں اور ان کے علم پر یقین رکھنے والوں کو جانچ پڑتال میں دلچسپی کم ہی ہوتی ہے' جبکہ جوتش پر یقین نہ رکھنے والے اسے فضول سمجھتے ہیں اور اس کے دعووٴں کی تصدیق میں وقت ضائع کرنا پسند نہیں کرتے۔

بہرحال جانچ پڑتال کے چند معیاری تجربے بھی ہوئے ہیں اور ان سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ زائچے حقیقت کی درست اور ٹھوس عکاسی نہیں کرتے۔ ایسے ہی ایک تجربے میں سیکڑوں افراد میں سے ہر ایک کو کئی مختلف زائچے دیے گئے تھے۔ یہ زائچے شخصیت کی ایسی صفات کو بیان کرتے تھے جن کا مفروضہ طور پر اطلاق مختلف جوتشی علامتوں پر ہوتا تھا۔ ان افراد سے کہا گیا کہ وہ ان مختلف زائچوں میں سے وہ ایک زائچہ منتخب کریں جو ان کے نزدیک ان کی صورتِ حال سے مطابقت رکھتا ہو۔

ظاہر ہے اگر زائچوں میں کوئی حقیقت ہوئی تو کم از کم چند افراد لازماً وہ زائچے منتخب کرتے جن کا تعلق ان کی جوتشی علامتوں یعنی ''ستاروں'' سے ہوتا۔ لیکن مذکورہ تجربے سے ایسا کوئی نتیجہ سامنے نہ آیا۔ لوگوں نے زائچے یوں منتخب کئے جیسے وہ آنکھیں بند کر کے زائچے چن رہے ہوں۔

دوسری طرف کامیاب شخصیت کے بارے میں جوتشیوں کے خاکے اور پیش گوئیاں عام طور پر حکایتیں ہوتی ہیں۔ ان میں ناکامیوں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور صرف کامیابی کے قصے دہرائے جاتے ہیں' وہ سائنسی معیار پر کسی طور پر بھی پورا نہیں اترتیں۔

قصہ مختصر یہ کہ تجرباتی ریکارڈ سے ثابت ہوتا ہے کہ انسانوں کی شخصیت اور کردار

پر سورج، چاند، سیاروں اور ستاروں کے اثرات سے متعلق جاتشیوں کے دعوے محض قصے کہانیاں ہیں۔ ان کی کوئی حقیقت نہیں۔

فرض کیجیے کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ ''مانا کہ جوتش و نجوم سائنسی نہیں ہیں، پھر بھی ان میں کچھ نہ کچھ سچائی ضرور ہے''۔ اس دعویٰ کو پرکھنے کے لیے ہم کیا کریں گے؟

آیئے اس سلسلے میں ہم ایسے چند ''حقائق'' منتخب کریں جن کو جوتشی صاحبان درست قرار دیتے ہیں۔ ہم فرض کر لیتے ہیں کہ ہمارا موکل ۲۹ جون کو پیدا ہوتا تھا۔ اس اعتبار سے اس کا ستارہ سرطان ہوگا۔ جوتشیوں کی کتاب ہمیں بتاتی ہے کہ سرطانی افراد کی عمومی خصوصیات یہ ہیں:

> یہ افراد اپنی ماؤں اور خاندانوں سے گہرا تعلق رکھتے ہیں، وہ ہمیشہ بچپن، ماضی اور یادوں سے اپنے بندھن کو محسوس کرتے ہیں۔ ماضی کے بندھنوں سے آزاد ہو کر خود مختار زندگی بسر کرنا ان کے لیے بہت دشوار ہوتا ہے۔ وہ یہ آزادی کبھی حاصل نہیں کر پاتے۔
>
> ان کے کردار کا میلان حزن و ملال، داخلیت اور مستقبل کے خوف کی طرف رہتا ہے۔ نامعلوم کے خوف کے سائے ان پر بہت گہرے ہوتے ہیں۔ اسی لیے وہ ماضی کی پناہ میں رہنا چاہتے ہیں، خاندان اور روایت سے چمٹے رہنے کو ترجیح دیتے ہیں......
>
> حقیقت کی دنیا انہیں ڈراتی ہے، وہ خوابوں اور تخیل کی دنیا میں پناہ لیتے ہیں......
>
> وہ متلون المزاج اور بے چین ہوتے ہیں، کبھی ان پر داخلیت کا اور کبھی ولولے کا غلبہ رہتا ہے، وہ پیش قدمی میں عجلت سے کام لیتے ہیں اور بہت غیر محفوظ رہتے ہیں......

جوتشیوں کے سرطان کے علاوہ باقی جو گیارہ ستارے ہیں، ان کے تحت آنے والے افراد کی خصوصیات بھی اسی انداز میں پیش کی جاتی ہیں۔ اب آخر کوئی یہ کس طرح ثابت کر سکتا ہے کہ ہماری دنیا میں جو چالیس کروڑ سرطانی افراد موجود ہیں وہ ''متلون مزاج'' ہیں اور ''اپنی ماؤں سے گہرا تعلق رکھتے ہیں''، یا وہ ''اپنے خوابوں میں پناہ لینا پسند کرتے ہیں؟''

اس قسم کے بیانات عموماً سب لوگوں کے لیے درست نہیں ہوتے' زندگی کے کسی نہ کسی مرحلے پر ہماری کیفیت اسی قسم کی ہوتی ہے۔ ان بیانات کو درست ثابت کرنے کے لیے ہمیں دوسرے ستاروں والے لوگوں سے مقابلہ کرنا ہوگا۔ کیا سرطان برج کے تحت پیدا ہونے والے افراد لو اور جدی برجوں کے تحت پیدا ہونے والے لوگوں متلون المزاج ہوتے ہیں؟ ہم یہ کیسے ثابت کر سکتے ہیں کہ دوسرے لوگوں کے مقابلے میں سرطانی افراد اپنی ماؤں سے زیادہ محبت کرتے ہیں؟

سب سے پہلے تو ہمیں کوئی ایسی نفسیاتی آزمائش ڈھونڈنا ہوگی یا تیار کرنا ہوگی جس کے ذریعے ہم یہ جان سکیں کہ آیا کوئی فرد کسی خاص شخصی وصف کا حامل ہے یا نہیں۔ یہ کوئی آسان کام نہیں' کیونکہ لوگوں سے پوچھا جائے کہ آیا وہ اپنی ماؤں سے شدید محبت کرتے ہیں یا نہیں' تو وہ اس قسم کے سوالوں کا صاف صاف جواب کم ہی دیتے ہیں۔ مزید برآں اس قسم کے سوال پوچھنا بھی آسان نہیں ہوتا۔

چلیئے ہم فرض کرتے ہیں کہ اس قسم کی نفسیاتی آزمائش تیار کر لی گئی ہے۔ تب ہمیں یہ مسئلہ درپیش ہوتا ہے کہ چالیس کروڑ سرطانی افراد کو پرکھا کیسے جائے۔ ہم ان میں سے چند افراد کو نمونے کے طور پر منتخب کر لیتے ہیں ویسے ہی جیسے انتخابات سے پہلے رائے عامہ کا جائزہ لینے والے چند رائے دہندگان کو منتخب کر لیتے ہیں۔ یوں نمونے کے طور پر منتخب کیئے جانے والے افراد کا انٹرویو لیا جائے گا یا ان کو سوالنامے پر کرنے کے لیے کہا جائے گا۔ ان سے اس قسم کے ذاتی سوال بھی پوچھے جائیں گے کہ آیا وہ متلون المزاج ہیں یا یہ کہ انہیں اپنی ماؤں سے محبت ہے؟

اب اگر اکثر لوگ اس قسم کے ذاتی سوالات کا جواب دینے سے انکار کر دیں تو پھر نمونے کے چند افراد منتخب کر کے کام چلانے کا معاملہ کھٹائی میں پڑ جائے گا۔ دوسری طرف ایسے لوگ بھی ہوں گے جن کو معلوم نہ ہوگا کہ اس قسم کے سوالات کا جواب کیسے دیا جاتا ہے' جبکہ بعض لوگ ذاتی قسم کے سوالات کا صاف جواب دینے سے گریز کریں گے۔ ان ساری باتوں سے درست نتائج اخذ کرنے میں رکاوٹیں پیدا ہو جائیں گی۔ معاملہ یہیں ختم نہیں ہوتا۔ اگر ہم نے نمونے کے افراد ایک ہی معاشرے سے حاصل کیئے ہیں تو پھر سوال یہ ہے کہ دنیا میں سیکڑوں قسم کے معاشرے ہیں اور سرطانی افراد ہر معاشرے میں

موجود ہیں۔ اس لئے ہم دوسرے معاشرے کو کیسے نظر انداز کر سکتے ہیں۔ گویا سیدھی سی بات یہ ہے کہ یہ سارا کام ہی نا قابلِ عمل ہے۔

آخر اس کا سبب کیا ہے کہ دنیا بھر میں بے شمار لوگ نجوم اور جوتش جیسی خرافات پر یقین رکھتے ہیں اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ بہت سے اخبارات جوتشیوں کے زائچوں اور پیش گوئیوں کو ہر روز شائع کرتے ہیں۔ اس سے بعض لوگ یہ سوچنے لگتے ہیں کہ اگر ان باتوں کی کوئی حقیقت نہ ہوتی تو پھر اخبار شائع ہی کیوں کرتے۔ اب دوسری طرف اخباروں کا حال یہ ہے کہ وہ زائچے اس لیے شائع کرتے ہیں کہ بہت سے لوگ ان کو پڑھنا پسند کرتے ہیں۔ اخبار چونکہ زائچے شائع کرتے ہوئے ان کے خرافات ہونے کا کوئی اشارہ نہیں دیتے، اس لیے اخباروں میں زائچوں کی اشاعت سے ان کے قابلِ یقین ہونے کا تاثر پیدا ہوتا ہے۔

زائچوں پر عام لوگ اس لئے بھی توجہ دیتے ہیں کہ زائچے جان بوجھ کر بہت عمومی انداز میں لکھے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کا اطلاق کم وبیش تمام افراد پر ہوسکتا ہے۔ اسی لیے ان کو غلط ثابت کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ یہاں ہم مثال کے طور پر ایک اخبار میں شائع ہونے والے زائچے سے اقتباسات درج کرتے ہیں۔

''جدی برج والوں کے پاس اپنے مرتبے میں بہتری کے بہت سے امکانات ہیں۔'' ظاہر ہے کہ یہ بے معنی بات ہے کیونکہ ہر جگہ کے تمام لوگوں کے پاس چاہے وہ دجی برج کے ہوں یا کسی اور برج کے، اس قسم کے مواقع ہوتے ہی ہیں، تاہم اس قسم کے عمومی بیان سے بعض لوگوں کو نقصان بھی پہنچ سکتا ہے، مثلاً جوزا برج سے تعلق رکھنے والا کوئی شخص اس سے یہ نتیجہ اخذ کرسکتا ہے کہ آج کا دن تو جدی والوں کی خوش قسمتی کا ہے اور خود اس کے لیے آج کوئی مواقع موجود نہیں ہیں۔

اس زائچے میں آگے چل کر کہا گیا ہے کہ ''حوت برج والوں کو آج شام اپنے خیالات پیش کرنے کا موقع ملے گا۔ حوت والوں کے لیے یہ دن اجلاسوں میں شریک ہونے، کتابیں پڑھنے اور ذہنی کام کرنے کے لیے بہترین ہے......'' دیکھ لیجئے کہ یہ بیان بھی سب لوگوں کے لیے درست ہوسکتا ہے۔

جوزا برج سے تعلق رکھنے والوں کے بارے میں اس زائچے میں لکھا ہے کہ

''اگر وہ دوسروں سے خصوصاً شریکِ حیات اور کاروباری ساتھیوں سے تعاون کریں تو ان کو فائدہ پہنچے گا......'' علاوہ ازیں فلمسازوں' لینڈ لارڈز' اساتذہ' پولیس اور ٹریفک کورٹ کے جج سے بھی تعاون کرنے پر فائدے کی نوید دی گئی ہے۔

''کل کا دن عملی کام کرنے کے لیے ایک اچھا اور تعمیری دن ہے۔'' آگے چل کر یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ''جنس مخالف کی توجہ حاصل کرنے کے کئی دلچسپ مواقع ہاتھ آ سکتے ہیں۔ رومان انگیز ملاقاتیں بھی ہوسکتی ہیں......'' یہاں یہ بات نوٹ کیجیے کہ زائچہ نگار نے ''ہوں گی'' کے بجائے جو الفاظ استعمال کیے ہیں وہ ''ہوسکتی'' ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ''سکتی ہیں'' سے مراد یہ ہے کہ رومان انگیز ملاقاتیں ممکن ہوسکتی ہیں اور نہیں بھی' گویا کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ آپ سارا دن رومان انگیز ملاقاتوں کے انتظار میں بیٹھے رہیں اور سوائے قرض خواہ کے کوئی بھی ملنے نہ آئے تو بھی آپ زائچہ نگار پر انگلی نہیں اٹھا سکتے۔

خیر زائچہ نگار کی سنیئے' وہ مزید کہتا ہے کہ ''آج کے دن اپنے سماجی رابطوں کے بارے میں محتاط رہیے کیونکہ قواعد و رواج کو نظر انداز کرنے کا رجحان رہے گا......'' اب فرض کیجیے کہ زائچہ پڑھنے والا ایک شخص قطار میں کھڑا ہے اور وہ کسی دوسرے کو دھکا دے کر آگے نکلنے کی کوشش کرتا ہے۔ یوں قواعد و رواج کو نظر انداز کرنے پر اس کے ناک پر گھونسا مارا جاتا ہے۔ اس پر وہ یہ کہہ سکتا ہے کہ زائچہ ٹھیک ہی کہتا تھا۔ اگر وہ قواعد کو نظر انداز نہ کرتا تو اسے گھونسا بھی نہ مارا جاتا۔ بصورتِ دیگر اگر دھکا دینے پر کوئی اس سے کچھ نہ کہتا تو پھر زائچے کی پیش گوئی پر انگلی اٹھانے کا موقع بھی نہ ملتا۔

یہ ساری مثالیں ظاہر کرتے ہیں کہ جوتشی اور نجومی صاحبان ہمیشہ ہی راستی پر ہوتے ہیں۔ یوں وہ اپنے زائچوں کے درست ہونے کا دعویٰ بھی کر سکتے ہیں۔ وہ اس قسم کی عمومی پیش گوئیاں کرتے ہیں جو ان کے لیے کسی طور گھاٹے کا سودا نہیں بنتیں۔ ایسا تو نہیں زائچہ لکھنے والے حضرات جو جی میں آئے لکھ دیتے ہیں؟ شاید ایسا ہی ہو' لیکن ہم یہ بات یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ان کے علم' ان کے دعووٰں اور پیش گوئیوں کی کوئی ٹھوس بنیاد موجود نہیں ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ہم سب اپنے اپنے زائچے خود ہی تیار کر سکتے ہیں۔ اس سے کوئی فرق نہ پڑے گا کیونکہ جو زائچہ سازی کے بڑے بڑے ''ماہرین'' ہیں' وہ بھی دراصل ہوا ہی میں تیر چلاتے ہیں۔

متضاد آراء

آیئے فرض کریں کہ ہم ایک طالب علم ہیں جو ایک نفسیاتی تجربے میں شریک ہے۔ ہم سات دوسرے طلباء اور انسٹرکٹر کے ساتھ ایک کمرے میں داخل ہوتے ہیں۔ ہم سب کو باری باری ایک لائن دکھائی جاتی ہے اور پوچھا جاتا ہے کہ دوسری تین لائنوں میں کون سی اس لمبائی کی ہے۔ چند آزمائشوں کے بعد ہمیں اس وقت تعجب ہوتا ہے جب ہم سے آگے کے چھ طلباء ایک ایسی لائن کو مساوی لمبائی کی قرار دیتے ہیں جو بظاہر زیادہ لمبی دکھائی دیتی ہے۔ ہم کو سبب معلوم نہیں، لیکن انسٹرکٹر نے شاید باقی طلباء سے کہہ رکھا تھا کہ وہ جھوٹ بولیں۔

اب ہم کیا کریں؟ اسی رائے کا اظہار کریں جس کو ہم درست سمجھتے ہیں یا پھر وہی جواب دیں جو دوسروں نے دیا ہے تاکہ ہم ان سے ''مختلف'' دکھائی نہ دیں۔

مطابقت پسندی

اس قسم کے کئی تجربوں میں صرف ایک چوتھائی طلباء ایسے تھے جنہوں نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ رہے باقی تین چوتھائی تو انہوں نے مکمل طور یا جزوی طور پر دوسروں کی غلط آراء کو قبول کر لیا۔

ہمارا سوال یہ ہے کہ اگر اس قسم کے سادہ معاملات میں لوگ دوسروں کی رائے سے اس قدر متاثر ہو جاتے ہیں تو پھر زندگی کے پیچیدہ امور میں صورتِ حال کیا ہو گی۔ دوسروں کی رائے سے مطابقت اختیار کرنے کی خواہش سے انتخابات کے نتائج بھی

متاثر ہوتے ہوں گے۔ وجہ یہ ہے کہ لوگ اکثریت کے پیچھے چلنا پسند کرتے ہیں اس لیے جب یہ معلوم ہو جائے کہ کسی امیدوار کا پلہ بھاری ہے تو بہت سے لوگ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کو ووٹ دے دیتے ہیں۔ ڈکٹیٹر اس انسانی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ وہ اطاعت پسندی اور مطابقت پذیری کی حمایت کرتے ہیں اور دھمکیوں اور سزاؤں کے ذریعے آزاد رائے کی حوصلہ شکنی کرتے ہیں۔ یوں ان کے اقتدار کے لاحق خطرے کم ہو جاتے ہیں اور اقتدار کی مدت بڑھ جاتی ہے۔

دوسروں سے مختلف ہونا اور ہجوم سے الگ کھڑا ہونا اکثر لوگوں کے لیے مشکل کام ہے۔ تاہم بعض لوگوں کا طرزِ عمل اس کے برعکس بھی ہوتا ہے۔ وہ دوسروں سے مختلف ہونا پسند کرتے ہیں اور عدم مطابقت کے اظہار کی ہر ممکن کوشش بھی کرتے ہیں۔ لیکن اس قسم کے لوگوں کی تعداد کم ہوا کرتی ہے۔

نوجوان اپنے والدین کے تسلیم شدہ رسوم و رواج کے خلاف بغاوت کا رجحان رکھتے ہیں۔ تاہم ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ مطابقت پذیری کسی نہ کسی حد تک تمام معاشروں کے لیے ناگزیر ہوتی ہے۔ تاکہ اکثر لوگ اپنی ذمہ داریاں ادا کرتے رہیں اور ضروری سماجی کرداروں سے منسلک رہیں۔ مثال کے طور پر ہر معاشرے میں بعض لوگ سرخ ٹریفک لائٹ دیکھ کر رک جاتے ہیں۔ آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اگر سب لوگ اس اصول کے خلاف بغاوت پر اتر آئیں تو کس قدر انتشار برپا ہو جائے گا۔

ہر معاشرے میں لوگوں کی بقاء کے لیے بعض رواج ناگزیر ہوتے ہیں۔ سرد ملکوں میں لوگ ایسا لباس پہنتے ہیں جو ان کے بدن کو اچھی طرح ڈھانپ دے۔ یہ کسی فیشن کا تقاضا نہیں ہوتا بلکہ زندگی کی بقاء کا مطالبہ ہوتا ہے۔

رسوم و رواج سے قطع نظر ہر رائے کی اپنی بنیاد ہونی چاہیے اور ہر رائے کا جائزہ اس کے اپنے حوالے سے لیا جانا چاہیے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اکثریتی رائے کو نسبتاً زیادہ اہمیت دینی چاہیے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر لوگوں کی بڑی تعداد کسی ایک ہی نتیجے پر پہنچے تو اس کا جائزہ زیادہ سنجیدگی سے لینا چاہیے۔ البتہ اپنی رائے بناتے ہوئے ہمیں اس استدلال سے کام نہیں لینا چاہیے کہ چونکہ سب لوگ اس طریقے سے سوچتے ہیں' لہٰذا مجھے بھی ان کے مطابق سوچنا چاہیے۔

رائے کیا ہوتی ہے؟

ایک ڈکشنری میں ''رائے'' کی تعریف یوں کی گئی ہے کہ ''رائے سے مراد ایسا عقیدہ یا اندازہ ہے جو غیر یقینی یا ناکافی شہادت پر مبنی ہو''۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ یہ غائب یا مبہم حقائق والا معاملہ ہے جو قابلِ توثیق نتیجے تک نہیں لے جا سکتا۔ رائے میں کسی نہ کسی حد تک غیر یقینی پن لازماً پایا جاتا ہے اور اکثر آراء مشکوک ہوتی ہیں۔

شک وشبہ کی موجودگی کا اندازہ ہم اس امر سے لگا سکتے ہیں کہ اکثر عوامی مسائل پر لوگوں کی آرا ایک دوسرے سے نہ صرف بہت مختلف ہوا کرتی ہیں بلکہ بسا اوقات متضاد بھی ہوا کرتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں وہ سب آرا درست نہیں ہو سکتیں۔

ہر شخص کی اپنی اپنی آرا ہوتی ہیں۔ ہمسایوں کے بارے میں، موسم، کرکٹ، شادی غرضیکہ کم وبیش ہر موضوع پر لوگ اپنی رائے بنائے رکھتے ہیں۔ اپنی رائے رکھنا ضروری بھی ہوتا ہے کیونکہ عموماً ہمیں اہم حقائق کی عدم موجودگی میں فیصلے کرنے پڑتے ہیں یا کوئی عملی قدم اٹھانا پڑتا ہے۔ بعض لوگ اپنی آرا کے اظہار کو پسند نہیں کرتے۔ ان کو یہ خدشہ ہوتا ہے کہ ان کی رائے غلط نہ ہو۔ جبکہ بعض دوسرے لوگ سوچے سمجھے بغیر اپنی آراء کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ یہ دونوں رویے خیالات کے ابلاغ میں رکاوٹ بنتے ہیں۔

کسی اہم مسئلے پر معقول رائے بنانے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ ہم کافی حقائق اکٹھے کریں۔ یہ کوئی آسان کام نہیں۔ ہم کیونکر جان سکتے ہیں کہ رائے سازی کے لیے ہمارے پاس کافی حقائق جمع ہو گئے ہیں؟ ایک ''معروضی'' رائے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم چیزوں کا توجہ سے مشاہدہ کریں، اندازے لگاتے ہوئے احتیاط سے کام لیں، اخبارات، جرائد اور کتب کا مطالعہ کریں۔ ریڈیو اور ٹیلی وژن پر ہونے والے مباحثوں کو توجہ سے سنیں۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اپنا ذہن کھلا رکھیں تاکہ ہم کسی معاملے میں مختلف نقطہ ہائے نظر کو ہمدردی سے سن کر خود کوئی رائے بنا سکیں۔

ہر طرح کے احتیاط کے باوجود ہمارا اقداری نظام رائے سازی کے عمل پر ضرور اثر انداز ہوتا ہے۔ ہم میں سے اکثر لوگ ان حقائق کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے جو ان کے اخلاقی عقیدوں اور قدروں سے متصادم ہوں۔ بعض دوسرے لوگ کسی فیصلے پر فوراً

ہی ایک رائے قائم کر لیتے ہیں اور پھر صرف ان حقائق کو قبول کرتے ہیں جن سے ان کی رائے کی تائید ہوتی ہے۔ خیر، رائے کا مطلب ہی یہ ہوتا ہے کہ بعض متعلقہ حقائق دستیاب نہیں ہیں۔ لہٰذا ہمیں نئے حقائق کے لیے اپنے ذہن کو کھلا رکھنا چاہیے اور جونہی نئے حقائق سامنے آئیں، ان کی روشنی میں اپنی رائے کا ازسرِ نو جائزہ لینا چاہیے۔

رائے عامہ کے جائزے

آج کی دنیا میں اور خصوصاً ترقی یافتہ ملکوں میں بہت سے موضوعات پر رائے عامہ کے جائزے لیے جاتے ہیں۔ بڑی بڑی کمپنیاں اپنی نئی مصنوعات اور خدمات سے متعلق عوام کے ردِعمل جمع کرتی ہیں۔ انتخابات، سیاسی مسائل، سماجی رویوں، خاندانی امور اور زندگی کے مشاغل وغیرہ کے بارے میں جرائد، اخبارات اور ٹیلی وژن کے ادارے لوگوں کی آرا کو پیش کرتے ہیں۔ سیاسی عہدوں کے امیدوار اپنی جیت کے امکانات کا جائزہ لینے اور یہ دیکھنے کے لیے کہ ان کو کن مسائل پر زیادہ زور دینا چاہیے اور کن پر کم، رائے عامہ کے جائزوں پر انحصار کرتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ رائے عامہ کا جائزہ لینے والے کسی ملک یا صوبے کے تمام شہریوں کی آرا اکٹھی نہیں کر سکتے۔ اس لیے وہ اور سماجی سائنس دان نمونے کے طور پر چند لوگوں کو منتخب کر لیتے ہیں۔ یوں ایسا گروپ بن جاتا ہے جو اس آبادی کا نمائندہ ہوتا ہے جس کی رائے جاننا مطلوب ہوتا ہے۔ اگرچہ جائزہ لینے والے نمائندہ یا نمونے کا گروپ منتخب کرنے کے لیے کئی طریقے استعمال کرتے ہیں۔ تاہم عموماً بہترین طریقہ کار یہ ہوتا ہے کہ جس آبادی کی رائے جاننا مقصود ہو، اس میں سے چند افراد کو چھان پھٹک کے بغیر منتخب کر لیا جائے۔

نمونے کا گروپ منتخب کرنے کا ایک آسان طریقہ ویسا ہی ہے جیسا کہ لاٹری نکالنے کا طریقہ ہے۔ اس میں ہوتا یہ ہے کہ موجود افراد میں سے ہر ایک کو ایک کارڈ (ریفل ٹکٹ) دے دیا جاتا ہے جس پر شناخت کے لیے کوئی نمبر یا نام درج ہوتا ہے۔ اس کے بعد تمام کارڈ اکٹھے کر کے ان کو اچھی طرح گڈمڈ کر دیا جاتا ہے۔ پھر ان میں سے بلا سوچے سمجھے کوئی ایک کارڈ نکال لیا جاتا ہے۔ جس کا وہ کارڈ ہوتا ہے وہی جیتنے والا قرار پاتا

ہے۔ اب اگر تمام کارڈ اچھی طرح ملا دیئے ہوں تو پھر ہر شخص کی جیت کا مساوی امکان موجود ہوتا ہے۔ شماریات کے ماہرین کا کہنا ہے کہ کروڑوں کی آبادی والے ملک میں بھی اگر انکل پچو انداز میں ایک ہزار یا اس کے لگ بھگ افراد منتخب کر لیے جائیں تو ان کے ذریعے ملک کی پوری آبادی کی رائے جاننے میں معقول حد تک کامیابی حاصل کی جا سکتی ہے۔

اس سلسلے میں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ لوگوں کی رائے ٹیلی فون پر معلوم کر لی جائے یا شخصی طور پر ان سے رائے حاصل کی جائے۔ فون کالز کا معاملہ یہ ہے کہ وہ سستی رہتی ہیں' لیکن ان کے سلسلے میں کئی مسائل ہیں جن پر قابو پانا ضروری ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر فون دن کے وقت کیے جائیں تو پھر آپ کی زیادہ تر رسائی ان لوگوں تک ہو گی جو گھر پر کام کرتے ہیں یا پھر رات کی شفٹ میں کام کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں اس صورت میں آپ گھریلو خواتین تک پہنچ جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں آپ کا نمونے کا منتخب گروپ آبادی کا صحیح نمائندہ گروپ نہ رہے گا۔ ایک اور مسئلہ یہ ہے کہ ٹیلی فون پر انحصار کرنے سے آپ صرف ان لوگوں تک پہنچ سکیں گے جن کے پاس ٹیلی فون ہوتے ہیں۔ دوسرے لوگ اور زیادہ تر غریب لوگ آپ کی پہنچ سے باہر رہیں گے۔ اب اگر آپ کسی ایسے مسئلے پر رائے عامہ کا جائزہ لینا چاہتے ہیں جس پر امیروں اور غریبوں کے نقطہ نظر میں بہت فرق ہے تو پھر ٹیلی فون پر رابطے کے ذریعے آپ درست نتائج اخذ نہ کر سکیں گے' کیونکہ غریبوں کی رائے آپ تک کم ہی پہنچے گی۔

ان مسائل کے باوجود رائے عامہ کے جائزوں کے لیے اکثر اوقات ٹیلی فون کو بروئے کار لایا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شخصی رابطوں کے مقابلے میں اس طریقہ کار پر اخراجات کم ہوتے ہیں۔ اس قسم کے جائزوں کے نتائج اس وقت تک خاصے ٹھوس ہوتے ہیں جب تک غریبوں سے متعلقہ مسائل جائزے کا موضوع نہ ہوں۔ مثال کے طور پر اگر کاریں بنانے والے کسی ادارے نے اپنے نئے ماڈل کے لیے چند نام منتخب کیے ہیں اور وہ یہ جاننا چاہتا ہے کہ عام لوگوں کے نزدیک ان میں سے بہترین نام کون سا ہے تو اس صورت میں ٹیلی فون کی سہولت سے محروم لوگوں کو نظر انداز کرنا مناسب ہی ہے کیونکہ ان سے یہ توقع بمشکل ہی کی جا سکتی ہے کہ وہ نئی ماڈل کی کاریں خریدیں گے۔ اس کے

برخلاف اگر سیاسی انتخابات سے متعلق لوگوں کی رائے دریافت کرنا مقصود ہو تو پھر ان غریب لوگوں کو نظر انداز کرنا نقصان دہ ہوگا۔

رائے عامہ کا جائزہ لینے والے لوگ اگر اعداد وشمار کو اچھی طرح استعمال کر سکیں تو پھر یہ جائزے معروضی اور ٹھوس ہو سکتے ہیں۔ شماریات کے ماہرین اس بارے میں رہنمائی کر سکتے ہیں کہ ٹھوس نتائج حاصل کرنے کے لیے کتنے لوگوں کا سروے کیا جانا چاہیے۔

ہم کو یہ بھی طے کرنا چاہیے کہ کسی جائزے کو ہم معقول حد تک درست کس صورت میں قرار دے سکتے ہیں۔ انتخابات کے معاملے میں صورتِ حال یہ ہے کہ جب ووٹ ڈالنے کا دن آتا ہے اور عوام ووٹ ڈالتے ہیں تو گنتی کے بعد ایک واضح حقیقت سامنے آ جاتی ہے۔ یعنی کسی عہدے کے دو یا زیادہ امیدواروں میں سے کوئی ایک جیت جاتا ہے۔ اس نتیجے کے حوالے سے ہم انتخابات سے پہلے کے رائے عامہ کے جائزوں کا بھی فیصلہ کر سکتے ہیں۔ اگر ان جائزوں کے نتائج بھی کم وبیش وہی تھے جو حقیقی انتخابات کے بعد سامنے آئے ہیں تو پھر ہم ان جائزوں کو معقول یا خاصی حد تک معقول قرار دے سکتے ہیں۔ اچھا تو یہ بات ہم کیسے جان سکتے ہیں کہ رائے عامہ کا جائزہ لینے والا گروپ غیر جانبداری سے کام کر رہا ہے اور وہ رائے عامہ کو مسخ نہیں کر رہا؟ شاید اس سوال کا ہم حتمی جواب کبھی حاصل نہیں کر سکتیں۔ لیکن خوش قسمتی سے جائزہ لینے والے ماہرین کے مفاد کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ وہ درست نتائج تک پہنچنے کی ہر ممکن کوشش کریں۔ اس قسم کی کامیاب کاوشوں سے ان کی ساکھ بنتی ہے۔ اگر ان کے نتائج غلط اور بے تکے ہوں تو پھر ان کی مہارت شبہ میں پڑ جاتی ہے۔

امریکہ میں اس قسم کا ایک واقعہ ۱۹۳۶ء میں پیش آیا تھا۔ تب وہاں صدارتی انتخابات ہونے والے تھے۔ فرینکلن روزولٹ اور ایلف لانڈن امیدوار تھے۔ ان انتخابات سے پہلے ''لٹریری ڈائجسٹ'' نامی ایک رسالے نے صدارتی انتخابات سے متعلق رائے عامہ کے ایک جائزے کا اہتمام کیا۔ اس رسالے نے ایک کروڑ خطوط بھیجے جن میں لوگوں سے رائے طلب کی گئی تھی۔ بیس لاکھ افراد نے ''لٹریری ڈائجسٹ'' کے سوال کا جواب دینے کی زحمت گوارا کی۔ ان کی بنیاد پر یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ دونوں صدارتی

امیدواروں میں لانڈن جیت جائیں گے۔ اس ڈائجسٹ نے پہلے بھی اس قسم کے جائزوں کا اہتمام کیا تھا اور ان کے نتائج ہمیشہ درست ثابت ہوئے تھے۔ تاہم اس بار یہ ہوا کہ جب انتخابات ہوئے تو لانڈن کے مقابلے میں روزویلٹ بہت بھاری اکثریت سے جیت گئے۔ ان کو دو کروڑ اسی لاکھ ووٹ ملے جبکہ ان کے حریف لانڈن کو صرف ایک کروڑ اسی لاکھ ووٹ حاصل ہو سکے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک بھر میں ''لٹریری ڈائجسٹ'' کا مذاق اڑایا جانے لگا۔ تھوڑے ہی عرصے بعد وہ بند ہو گیا۔

''لٹریری ڈائجسٹ'' کا یہ جائزہ اس قدر غلط کیوں ہو گیا تھا؟ اصل میں اس غلطی کی ذمہ داری کئی عوامل پر عائد ہوتی ہے۔ تاہم ایک موٹی سی بات یہ ہے کہ جب ٹیلی فون پر لوگوں کی رائے طلب کرنے کے بجائے ان سے کہا جائے کہ وہ خطوط کی صورت میں اپنی رائے بھیجیں تو ان کے جواب نسبتاً زیادہ ناقابلِ اعتماد ہوتے ہیں۔ آخر وہ کون سے لوگ ہیں جو ڈاک کے ذریعے رائے کا اظہار کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں؟ زیادہ تر وہ ایسے لوگ ہوتے ہیں جن کے پاس دوسروں کے مقابلے میں زیادہ فرصت ہوتی ہے۔ ''لٹریری ڈائجسٹ'' نے ایک کروڑ خطوط بھیجے تھے جن میں سے بیس لاکھ نے جواب دیا۔ (گول جواب دینے والوں کی شرح ۲۰ فی صد تھی) اس طرح جواب دینے والوں کی حیثیت نمائندہ نہ رہی اور جواب بھی ان لوگوں نے دیا جن کے پاس کافی وقت تھا اور وہ خط کا جواب دینے پر آمادہ تھے۔ اس طرح وہ عمومی رائے سامنے آئی' اس کو کسی طور بھی امریکی عوام کی رائے قرار نہ دیا جا سکتا تھا۔ بعد ازاں صدارتی انتخابات کے نتائج نے ''لٹریری ڈائجسٹ'' والوں کی غلطی کو ثابت کر بھی دیا۔

امریکہ میں اب جو ادارے رائے عامہ کے جائزوں کا کام کرتے ہیں' ان کو ''لٹریری ڈائجسٹ'' کا حشر معلوم ہے۔ اس لیے وہ معروضیت پر بے حد زور دیتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ کوئی بڑی غلطی ان کے کاروبار کے خاتمے کا سبب بن سکتی ہے۔

اچھی اور نمایاں پولنگ کمپنیاں اپنے جائزوں کو درست اور ٹھوس بنانے کی ہر ممکنکوشش کرتے ہیں۔ لیکن یہ مسئلہ پھر بھی باقی رہتا ہے کہ خاص حالات میں لوگ اپنی حقیقی آرا کے اظہار سے گریز کرتے ہیں۔ امریکہ میں چونکہ رائے عامہ کے جائزوں کا عام رواج ہے' اس لیے ہم وہیں سے دو مثالیں پیش کرتے ہیں۔ ان دونوں کا تعلق ۱۹۸۹ء

سے ہے جبکہ امریکہ میں انتخابات ہوئے تھے۔ ریاست ورجینیا میں جائزوں سے یہ بات سامنے آئی کہ ڈگلس والڈر بھاری اکثریت سے گورنر منتخب ہو جائیں گے۔ اسی طرح نیویارک میں جائزوں سے یہ نتیجہ سامنے آیا کہ ڈیوڈ ڈمگن گورنر کے عہدے کے لیے اپنے حریفوں سے بہت آگے ہیں۔ جب انتخابات ہوئے تو اگرچہ یہ دونوں امیدوار جیت گئے لیکن انہیں جائزوں کے مطابق بھاری اکثریت حاصل نہ ہوئی۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ جب جائزے لیے جارہے تھے تو بہت سے افراد نے اپنی حقیقی رائے بتانے سے گریز کیا تھا۔ والڈر اور ڈمگن دونوں سیاہ فام تھے۔ لہٰذا ممکن ہے کہ بعض سفید فام امریکیوں کو یہ بتاتے ہوئے شرم محسوس ہوئی ہو کہ وہ کالے امیدواروں کو نسلی اختلاف کے سبب ووٹ نہ دیں گے۔ اس لیے انہوں نے اگرچہ انتخابات میں ان دونوں امیدواروں کو ووٹ نہ دیئے' تاہم جائزہ لینے والوں کو یہی بتایا کہ وہ ان کو ووٹ دیں گے۔

۱۹۹۰ء میں نکاراگوا کے صدارتی انتخابات کے موقع پر ایک بڑے ادارے کے جائزے میں بھی اس قسم کی غلطی کو دہرایا گیا تھا۔ ان انتخابات میں اورتیگا کے مقابلے میں ایک خاتون چامدروا امیدوار تھیں اور جائزوں سے یہ بات سامنے آرہی تھی کہ ان کی جیت کا کوئی امکان نہیں۔ اس کے باوجود جب انتخابات کے نتائج سامنے آئے تو چامدروا اچھی خاصی اکثریت سے کامیاب ہوگئیں۔ اس غلطی کی ایک توجیہ یوں کی گئی کہ انتخابات کی نوعیت بے حد جذباتی تھی۔ یہ بھی کہا گیا کہ رائے عامہ کا جائزہ لینے والے افراد اجنبی تھے اور عام لوگوں کو شبہ تھا کہ شاید وہ در پردہ حکومت کے لیے کام کر رہے تھے۔ اس لیے بہت سے لوگوں نے اپنی حقیقی رائے کو ان سے چھپائے رکھا۔

جائزے میں سوالات کا کردار

انتخابات سے متعلق رائے عامہ کے جائزوں میں سوالات بہت سادہ ہوتے ہیں۔ عموماً یہ پوچھا جاتا ہے ک آپ کس امیدوار کو ووٹ دیں گے۔ البتہ عوامی مسائل سے متعلق جائزوں کا معاملہ بہت مختلف ہے۔ ان میں ایک حد تک نتائج کا دارومدار اس امر پر بھی ہوتا ہے کہ سوالات کس طرح مرتب کیے جاتے ہیں۔ کوئی اہم سوال' دیئے جانے والے جوابات پر اثر انداز ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر فرض کیجئے کہ جائزے میں ایک اہم

سوال یہ پیش کیا جاتا ہے کہ ''آیا آپ ڈاکٹر مبشر حسن کی انکم ٹیکس کم کرنے سے متعلق بجٹ تجاویز کی حمایت کرتے ہیں؟'' اس سوال کا جواب لوگ عموماً ''ہاں'' میں دیں گے' چاہے ان کو ڈاکٹر صاحب کی تجاویز کے بارے میں کچھ بھی علم نہ ہو۔ وجہ؟ وجہ یہ ہے کہ ہر کوئی انکم ٹیکس کی کم شرح کا حامی ہوتا ہے۔ اب جو لوگ ڈاکٹر مبشر حسن کے مخالف ہیں' وہ مختلف انداز میں سوال پیش کریں گے۔ وہ پوچھیں گے کہ ''آیا آپ ڈاکٹر مبشر حسن کی بجٹ تجاویز کے حامی ہیں جن میں سیلز ٹیکس بڑھانے کو کہا گیا ہے؟'' اب ظاہر ہے کہ اکثر لوگ اس سوال کا جواب ''نہیں'' میں دے گے کیونکہ وہ سیلز ٹیکس بڑھانا پسند نہیں کرتے۔ اس انداز سے پیش کیے جانے والے جائزوں میں ایک خاص طریقہ استعمال کیا جاتا ہے جس کو کارڈ سٹیکنگ کہتے ہیں۔ دسویں باب میں ہم اس طریقے پر بحث کریں گے۔ اس کے ذریعے صرف وہ حقائق لوگوں کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں جو جائزہ لینے والوں کے نقطۂ نظر کی تائید کرتے ہیں۔ دوسری قسم کے حقائق کو جان بوجھ کر دبا دیا جاتا ہے۔

جائزوں میں یہ بات بھی اہم ہوتی ہے کہ جائزہ لینے والے کون ہیں۔ مثلاً اگر سروے کرنے والوں کا تعلق کسی امیدوار سے ہو تو سروے کی ساکھ پر بڑا اثر پڑتا ہے۔ اسکے برخلاف اگر آپ کو یقین ہو کہ جو لوگ سروے کر رہے ہیں' وہ خود غیر جانبدار ہیں تو پھر ان کی ساکھ بڑھ جاتی ہے۔

جائزے' رائے عامہ کو کیسے متاثر کرتے ہیں

ابتدا میں اس قسم کے جائزوں کا مقصد رائے عامہ کے اندازے لگانا تھا۔ تاہم جب ان کا استعمال بڑھا تو رائے عامہ کی تشکیل میں ان کا عمل دخل بھی بڑھ گیا۔ خاص طور پر مختلف عہدوں کے امیدواروں اور متنازعہ عوامی مسائل کے معاملے میں ان کے اثر و رسوخ میں خاصا اضافہ ہو گیا۔ جائزوں کے ابتدائی دور میں ان کے کردار کی ایک دلچسپ مثال امریکہ کے ۱۹۴۸ء کے صدارتی انتخابات کے زمانے میں سامنے آئی۔ ان انتخابات میں ٹامس ڈیوی' ہیری ٹرومین کے مخالف امیدوار تھے۔ ابتدائی جائزوں سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ ڈیوی کا پلہ بھاری ہے۔ ممکن ہے کہ ان نتائج کے سبب ڈیوی صاحب اور ان کے ساتھی پر اعتماد ہو گئے ہوں۔ تاہم ان نتائج سے ٹرومین نے' جو پہلے سے صدر چلے آ رہے

تھے، حوصلہ نہ ہارا بلکہ وہ پہلے سے زیادہ سرگرم ہو گئے۔ انہوں نے ریل گاڑی کے ذریعے اپنی مہم شروع کی اور دور دراز قصبوں اور شہروں تک پہنچے۔ ٹیلی وژن سے پہلے کے ایام میں یہ مہم بازی کا بہت موثر طریقہ تھا۔ کیونکہ اس طرح امیدوار کو جگہ جگہ ٹھہرنے اور لوگوں سے خطاب کرنے کا موقع مل جاتا تھا۔ مقامی اخبارات ان واقعات کا بھرپور انداز میں چرچا کرتے تھے۔

خیر، صدارتی انتخابات سے ایک ہفتہ پہلے جو جائزے لیے گئے، ان سے ظاہر ہوتا تھا کہ ٹرومین صاحب کی مقبولیت بڑھ رہی ہے۔ لیکن ڈیوی اپنی جیت کے خیال میں کھوئے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ٹرومین صاحب نے آخرکار پانسہ پلٹ دیا اور وہ جیت گئے۔ اس کامیابی نے سیاست دانوں کو ایک سبق سکھا دیا...... اور وہ یہ تھا کہ جائزوں پر کڑی نظر رکھنی چاہیے۔ خاص طور پر ان کے ظاہر کردہ رجحانات کا احتیاط سے مطالعہ کرنا چاہیے۔

اصل بات یہ ہے کہ جائزوں سے نہ صرف رائے عامہ کے رجحانات کا پتہ چلتا ہے، بلکہ ان کے ذریعے رائے عامہ کو متاثر بھی کیا جا سکتا ہے۔ یوں جائزوں کو بروئے کار لا کر وہ امیدوار فائدہ حاصل کر لیتے ہیں جن کے پاس جائزوں کے لیے فنڈ رہوتے ہیں۔ (اس سلسلے میں دسواں باب دیکھیے جس میں بتایا گیا ہے کہ آرا کو کیونکر متاثر کیا جا سکتا ہے۔) انتخابی مہم کے آغاز میں جو جائزے لیے جاتے ہیں، ان سے اس امر کا علم حاصل ہوتا ہے کہ کون سے مسائل رائے دہندگان کو متوجہ کر سکیں گے اور کون سے مسائل ان کو برگشتہ کر دیں گے۔ علاوہ ازیں ان سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ امیدوارں کو تقاریر اور اشتہارات میں کون سا طریقہ کار استعمال کرنا چاہیے۔

جائزے جب کسی امیدوار کی برتری کو ظاہر کرتے ہیں تو اس کی مقبولیت بڑھ جاتی ہے، کیونکہ بہت سے رائے دہندگان جیتنے والے امیدوار کا ساتھ دینے کے خواہاں ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں جن رائے دہندگان نے اپنے طور پر کوئی فیصلہ نہ کیا ہو، وہ بھی اس امیدوار کے حامی ہو جاتے ہیں جس کا پلہ بھاری دکھائی دیتا ہے۔ اس مظہر کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ آج کل انتخابات ووٹ ڈالنے کے دن سے بہت پہلے ہی شروع ہو جاتے ہیں، کیونکہ تمام امیدوار جائزوں میں ایک دوسرے سے آگے دکھائی دینے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ یوں بھی ہوا ہے کہ روپے پیسے کی کمی کے باعث بعض بہترین امیدوار

جائزہ کاروں کی خدمات حاصل نہیں کر سکے اور آخر کار ناکام ہو گئے۔

۱۹۸۰ء کے امریکی صدارتی انتخابات رونالڈ ریگن اور صدر جمی کارٹر کے درمیان لڑے گئے۔ یہ انتخابات اس امر کی واضح مثال ثابت ہوئے کہ ٹیلی وژن اور ریڈیو کے ذریعے ابلاغ عامہ کی تیز رفتاری جائزوں کے اثر کو بہت بڑھا دیتی ہے۔ انتخابات کے روز پولنگ بوتھس سے واپس آنے والے لوگوں کی آرا اکٹھی کر کے جائزہ لینے والے بڑے اداروں نے ریگن کی کامیابی کا اعلان کر دیا تھا۔ حالانکہ اس وقت امریکہ کی مغربی ریاستوں میں پولنگ جاری تھی۔

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ اس اعلان سے مغربی ریاستوں کے لوگوں کی حوصلہ شکنی ہوئی اور انہوں نے اپنا ووٹ استعمال کرنے سے گریز کیا کیونکہ انتخابات کا ''فیصلہ'' ہو گیا تھا۔ بہرحال ریگن صاحب کو تو جیت ہی جانا تھا' البتہ یہ ممکن ہے کہ سینٹ اور ایوانِ نمائندگان کے انتخابات پر اس سے اثر پڑا ہو' کیونکہ کارٹر صاحب کے حامی بددل ہو گئے تھے اور ووٹ ڈالنے نہ آئے تھے۔

وقت سے پہلے کیے جانے والے اعلان پر بہت سے اعتراضات کیے گئے تھے۔ اس لیے بڑے ادارے اب پولنگ کا وقت ختم ہونے سے پہلے صدارتی انتخابات کے نتیجے کی واضح پیش گوئی کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ تاہم ٹیلی وژن امریکہ کی مختلف ریاستوں کے نتائج نشر کیے جاتے ہیں اور لوگ اپنے طور پر نتائج اخذ کر لیتے ہیں کہ صدارتی دوڑ میں کون پیچھے رہ گیا اور کون آگے جا رہا ہے۔

انتخابات کے زمانے میں مطابقت پذیری کا رجحان بہت شدید ہوتا ہے۔ عام لوگ جائزوں کے نتائج سے بہت متاثر ہوتے ہیں۔ جس امیدوار کا پلہ بھاری نظر آئے' لوگ جوق در جوق اس کی حمایت کرنے لگتے ہیں۔ اس لیے امیدوار جائزوں میں کامیابی کا تاثر دینے کے لیے ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔

ان جائزوں کا ایک منفی اثر یہ ہوا ہے کہ امیدواروں کی زیادہ توجہ جائزوں میں بہتر دکھائی دینے پر صرف ہو جاتی ہے۔ یوں بنیادی مسائل اکثر و بیشتر نظرانداز ہو جاتے ہیں۔ اس کے برخلاف ان مسائل کا چرچا رہتا ہے جو مقبول ہوتے ہیں۔ اکثر اوقات یہ مقبول مسائل اہم نہیں ہوا کرتے۔ یوں جمہوری انتخابات کے تربیتی کردار کو ضعف پہنچا ہے۔

ہمارے پیچیدہ معاشرے میں جائزوں کا غلط استعمال بجائے خود ایک بڑا مسئلہ بن گیا ہے۔ یہ غلط استعمال دانستہ اور نادانستہ دونوں قسم کا ہوتا ہے۔ شہریوں کو رائے عامہ کی تخلیق اور اس کو تبدیل کرنے میں جائزوں کے گہرے کردار سے باخبر ہونا چاہیے۔ جائزوں کی قوت کا واضح فہم حاصل کر کے شہری ان کے استحصال سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔

خوب تر یا بد تر؟

رائے عامہ کے بہت سے جائزے حریف امیدواروں میں سے انتخاب کرنے کو کہتے ہیں۔ وہ پوچھتے ہیں کہ کون سا امیدوار بہتر ہے۔ یہی طریقہ کار مصنوعات کے سلسلے میں بھی اختیار کیا جاتا ہے۔

عموماً ایسے معاملات میں ''یہ یا وہ'' کا رویہ موجود نہیں ہوتا۔ ایک شے آپ کے لیے اچھی ہو سکتی ہے لیکن کسی اور کے لیے ناپسندیدہ ہو سکتی ہے۔ مثلاً فرض کیجئے کہ جائزہ لینے والے یہ سوال کرتے ہیں کہ ''بہتر موٹر کون سے ہے' چھوٹی یا بڑی؟''

اب معاملہ یہ ہے کہ بعض لوگ چھوٹی کاریں خریدتے ہیں اور بعض بڑی موٹروں کو ترجیح دیتے ہیں۔ ایسے بھی ہوتے ہیں جو ایک چھوٹی اور ایک بڑی موٹر خرید لیتے ہیں۔ گویا ایک شے کسی ایک فرد کے نزدیک اچھی ہے اور کسی دوسرے کے لیے وہ بڑی ہو سکتی ہے۔ اس قسم کے معاملات میں کئی پیچیدہ باتیں زیرِ غور آسکتی ہیں اور وہ کسی رائے کی تشکیل پر اثر انداز ہو سکتی ہیں۔ مثال کے طور پر بڑی موٹر دراز قد لوگوں کے لیے بہتر ہو سکتی ہے۔ اسی طرح امیروں کے لیے' نمائش پسند لوگوں کے لیے' زیادہ افراد پر مشتمل خاندان کے لیے یا گاڑی پارک کرنے کے لیے کافی جگہ رکھنے والوں کے لیے بھی بڑی موٹر بہتر ہو سکتی ہے۔ اس کے برخلاف چھوٹے قد کے فرد کے لیے' چھوٹے خاندان کے لیے' کفایت شعاروں یا گاڑی پارک کرنے کے لیے تھوڑی جگہ رکھنے والوں کے لیے چھوٹی موٹر بہتر ہوگی۔

بڑی موٹر خریدنے کی استطاعت رکھنے والے لوگ بھی چھوٹی موٹر کو ترجیح دے سکتے ہیں' کیونکہ وہ پٹرول یا روپے پیسے کی بچت پر مائل ہو سکتے ہیں۔ وہ ماحول کو برباد

کرنے والی آلودگی اور تیزابی بارش سے بچنے کے خواہش مند ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا گاڑی خریدتے وقت بعض لوگ اس سوال پر بھی غور کر سکتے ہیں کہ ''بہتر کس کے کے لیے' فرد کے لیے یا سماج کے لیے؟''

خیر وشر اور اچھائی اور برائی سے متعلق ہمارے اخلاقی تصورات اور اقدار بھی رائے کی تشکیل میں کردار ادا کرتی ہیں۔ بسا اوقات ان اقدار کے تحت تشکیل پانے والی آراء ہم کو سخت اور بے لچک موقف اختیار کرنے پر مجبور کر دیتی ہیں' جس سے معاشرے میں کئی پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں۔ یاد رکھئے کہ کھلا ذہن اور دوسروں کی رائے کے لیے برداشت و رواداری جمہوری عمل کو رواں دواں رکھنے کے لیے ضروری ہیں۔ رواداری کے بغیر یہ عمل ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے۔

دوسروں کے نقطۂ نظر کو سمجھنا

مختلف نقطہ ہائے کا فہم حاصل کرنا بہت ضروری ہے۔ جب ہم یہ سمجھنے لگیں کہ صرف ہمارا نقطۂ نظر ہی درست ہے اور اس سے اختلاف رکھنے والے تمام نقطہ ہائے نگاہ غلط ہیں تو پھر مختلف آراء کے حامل افراد کے درمیان تبادلہ خیال اور مصالحت کے لیے گنجائش نہیں رہتی۔

موت کی سزا دینے کے بارے میں مختلف نقطہ ہائے نظر پر غور کیجئے۔ کیا یہ بات معاشرے کے لیے بہتر ہے کہ قاتلوں کو پھانسی کے تختے پر لٹکایا جائے؟ اس بارے میں پائے جانے والے اختلافات کئی گہری اخلاقی اقدار کو مدِ نظر رکھتے ہیں۔ بعض لوگوں کے نزدیک کسی جاندار کی جان لینا بہت بڑا گناہ ہے' چاہے وہ قاتل ہی کیوں نہ ہو۔ وہ کہتے ہیں کہ معاشرے کے لیے اچھی بات یہ ہے کہ وہ قاتلوں کو قید خانوں میں بند کر دے۔ لیکن دوسروں کو' یعنی قاتلوں کو ہلاک کر کے بری اخلاقی مثال قائم نہ کرے۔ جبکہ دوسرے لوگ یہ کہتے ہیں کہ قاتلوں کو موت کی سزا دے کر آپ نہ صرف انہیں مزید قتلوں سے روک سکتے ہیں بلکہ دوسرے لوگوں کو بھی اس سے سبق حاصل ہوگا اور وہ اس جرم سے دور رہیں گے۔

۱۹۸۶ء میں ایک مثال اس امر کی سامنے آئی تھی کہ کس طرح شدید اور متضاد آراء رکھنے والے لوگ کسی معقول مصالحت تک پہنچ سکتے ہیں۔ تحفظ کا پرچار کرنے والے

گروپ یہ چاہتے تھے کہ ایسے سخت قواعد تیار کیے جائیں جن کی مدد سے جراثیم کش اور دیگر خطرناک کیمیکلز تیار کرنے والوں کو اپنی مصنوعات کو استعمال کے لیے زیادہ محفوظ بنانے پر مجبور کیا جا سکے۔ کیمیکلز بنانے والوں کا کہنا تھا کہ اس قسم کے تقاضے پورے کرنے کے لیے کئی برس اور بہت سے مالی وسائل درکار ہوں گے۔

اس مسئلہ پر دونوں گروپوں کے درمیان بحث ومباحثہ جاری رہا۔ یہاں تک کہ وہ مصالحت تک پہنچ گئے۔ ماحول پرستوں نے اس بات پر اتفاق کیا کہ وہ کیمیکلز بنانے والوں کے مفادات کی حفاظت کے لیے قانون سازی میں تعاون کریں گے۔ دوسری طرف کیمیکلز بنانے والوں نے زیادہ سخت قواعد قبول کرنے پر آمادگی ظاہر کر دی۔ اگر جذباتی قسم کے مسائل پر اکثر لوگ اسی طرح کھلے دل کے ساتھ ایک دوسرے سے مکالمہ کریں، ایک دوسرے کے موقف کو سمجھیں اور ایک دوسرے کے جائز مفادات کا خیال رکھیں تو پھر مسائل کا حل زیادہ جلدی اور پسندیدہ انداز میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔

امریکہ میں وسیع وعریض رقبوں پر پھیلے ہوئے جنگلات وفاقی حکومت کی ملکیت ہیں۔ ان کے بارے میں لوگوں میں اختلاف رائے رہا ہے۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ ان جنگلوں کو کاٹ کر استعمال میں لایا جائے، یہ رقبے زرعی مقاصد کے لیے استعمال کیے جائیں اور قرب ونواح کے رہنے والوں کو ملازمتوں کے مواقع مہیا کیے جائیں۔ جبکہ بعض دوسرے لوگوں کی رائے یہ ہے کہ ان جنگلات کو محفوظ کر لیا جائے۔ وہ کہتے ہیں کہ جنگلات کی تباہی سے تازہ پانی کی فراہمی کو خطرہ لاحق ہوتا ہے، ماحول کی آلودگی بڑھتی ہے اور سیلاب کا خدشہ بڑھتا ہے اور اراضی کٹاؤ کا شکار ہوتی ہے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر جنگلات کو تباہ کر دیا گیا تو اس سے آئندہ نسلوں کو بھاری نقصان برداشت کرنا پڑے گا۔ یہ دونوں موقف ایسے ہیں کہ ان کے حق میں دلائل کی کمی نہیں۔ لہٰذا ضروری ہے کہ بامعنی تبادلہ خیال کے ذریعے دونوں گروہ کوئی ایسا مشترکہ حل تلاش کریں جس میں دونوں کے موقف یکجا ہو سکیں۔

لوگ جب بھی تبادلہ خیال کے لیے مل بیٹھتے ہیں، اختلاف رائے ضرور پیدا ہوتا ہے۔ لیکن اگر اکثر لوگ مختلف نقطۂ نظر رکھنے والوں کی باتیں ہمدردی سے سنیں، ان کا موقف سمجھنے کی کوشش کریں تو پھر جھگڑے پیدا نہیں ہوتے، بلکہ مسائل کے حل سامنے آتے ہیں۔

مگر یہ اس وقت ممکن ہے کہ جب دونوں طرف افہام و تفہیم کی خواہش موجود ہو۔ بحث میں ایک دوسرے سے مختلف اقدار شامل ہو جائیں تو پھر اتفاق رائے تک رسائی زیادہ دشوار ہو جاتی ہے' جذبات بھڑک اٹھتے ہیں' پرسکون تبادلہ خیال کا ماحول ختم ہو جاتا ہے۔

نیکی بدی' اچھائی برائی اور خیر و شر کے بارے میں آرا مذہبی عقیدوں اور زندگی کے عمومی ماحول سے جنم لیتی ہیں۔ چونکہ عقیدے بے شمار قسم کے ہیں اور ماحول بھی' اس لیے اس قسم کی آراء میں بہت زیادہ اختلاف پایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر چین کی آبادی اس وقت دنیا میں سب سے زیادہ ہے اور وہاں کی حکومت کو آبادی میں بے تحاشا اضافہ اور اس سے پیدا ہونے والے مسائل کا شعور بھی ہے' اس لیے وہاں کی حکومت نے ''ایک خاندان ایک بچہ'' کی مہم چلائی ہے۔ امریکیوں کے نزدیک اس قسم کی پابندی سے شخصی آزادی کو ضعف پہنچتا ہے۔ لیکن اگر امریکی اپنے آپ کو اہلِ چین کی جگہ رکھ کر سوچیں تو ان کو معلوم ہوگا کہ آبادی میں اضافہ کو نہ روکنے سے صرف تباہی پیدا ہوگی' جلدی لوگوں کو قحط کا سامنا کرنا پڑے گا اور بڑی تعداد میں لوگ بھوک سے مرنے لگیں گے۔

کھلا ذہن تغیر پذیر ہوتا ہے

کسی رائے کی حیثیت ایک ایسے عارضی فیصلے سے زیادہ نہیں ہونی چاہیے جو متعلقہ حقائق کی فراہمی سے پہلے کیا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ رائے کو اٹل نہیں ہونا چاہیے بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ اس میں ردوبدل جاری رہنا چاہیے۔ ہم اس شخص کو ضدی اور ہٹ دھرم کہتے ہیں جو نئے حقائق سامنے آنے پر بھی اپنی رائے سے چمٹا رہتا ہے اور اس میں کسی قسم کی تبدیلی پر آمادہ نہیں ہوتا۔ اس قسم کے شخص میں استدلال کی اہلیت بہت کم ہوتی ہے۔ اس کا ذہن بند ہوتا ہے۔ زندگی میں اس کا کردار' اس کا طرزِ عمل عموماً غیر معقول رہتا ہے۔

عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ جب لوگ اپنی رائے پر اصرار کریں اور کوئی لچک پیدا کرنے پر آمادہ نہ ہوں تو پھر بحث کے نتیجے میں وہ اپنی اپنی رائے میں اور بھی پختہ ہو جاتے ہیں۔ کم و بیش روز ہی ہم یہ بات سنتے ہیں کہ ''خیر' ہر شخص کو اپنی اپنی رائے کا حق ہے''۔ بلاشبہ یہ بات سچ ہے کہ ہم میں سے ہر ایک کو رائے رکھنے اور اس کا اظہار کرنے کا حق

ہے۔لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ صرف ہماری آراء ہی درست ہوتی ہیں اور جو لوگ ہم سے اختلاف کرتے ہیں وہ غلطی پر ہوتے ہیں۔

ناموزوں اور غیر مناسب آراء کا حامل ہونا کوئی اچھی بات نہیں۔ہمیں حقیقت کے حوالے سے اپنی آراء کی جانچ پڑتال کرتے رہنا چاہیۓ' دوسروں کے ساتھ تبادلہ خیال کرنا چاہیۓ' اپنی آراء کا تنقیدی جائزہ لینا چاہیے اور جہاں ضرورت ہو' اپنی رائے تبدیل کرنی چاہیے۔ایسا نہ کیا جائے تو ہماری آرا نہ صرف غیر معقول ثابت ہوسکتی ہیں بلکہ وہ کئی الجھنوں کا سبب بھی بن سکتی ہیں۔

پانچ صدی پہلے کا قصہ ہے کہ لوگوں کو معلوم ہونے لگا کہ کرۂ ارض کائنات کا مرکز نہیں ہے۔ اس زمانے میں یہ ایک تعجب انگیز دریافت تھی۔ اس نے کئی لوگوں کے ذہن کھول دیئے۔ وہ طبعی دنیا اور انسانوں کے اس سے تعلق کے بارے میں نئی نئی باتیں سوچنے لگے۔ یوں سائنسی انقلاب شروع ہوگیا۔ خیالات' عقائد' آراء اور اقدار تیزی سے تبدیل ہونے لگیں۔

سائنسی فکر اور صنعتی انقلاب کے زیرِ اثر گزشتہ پانچ سو برس کے دوران آراء میں زبردست تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ایک زمانے میں بادشاہوں کو ظل الٰہی سمجھا جاتا تھا اور ان کے خدائی حقوق کا ہر کوئی قائل تھا۔تب یہ خیال بہت ہی مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہوگا کہ معاشرے کے تمام بالغ افراد کو رہنما منتخب کرنے میں شریک ہونے کا حق حاصل ہونا چاہیے۔ بہت سے لوگ پوچھتے ہوں گے کہ یہ گنوار کسان بھلا کیا جانیں کہ ووٹ کس کو دینا چاہیے۔

اس کے برخلاف آج کی دنیا میں تعلیم یافتہ اور خواندہ افراد کی تعداد گزشتہ ادوار کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے اور اطلاعات کے عالمی وسائل دستیاب ہیں اور رہنماؤں کے انتخاب کا حق انسانی حقوق میں شمار کیا جاتا ہے۔

آراء یقیناً تبدیل ہوا کرتی ہیں۔۱۹۳۳ء میں دس مختلف قومی گروپوں کے ۸۴ اوصاف کے بارے میں امریکی کالجوں کے طلباء کی رائے کا ایک جائزہ لیا گیا تھا۔ ۱۹۶۷ء میں دوبارہ ایسا ہی ایک جائزہ لیا گیا۔۱۹۳۳ء میں چوبیس فی صد طلباء کی رائے یہ تھی کہ جرمن انتہائی قوم پرست ہوتے ہیں ۱۹۶۷ء میں یہ رائے رکھنے والوں کا تناسب

بڑھ کر ۴۳ فی صد ہو گیا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۵ء تک ہونے والی دوسری عالمی جنگ میں جرمنی نے پوری دنیا کو دہشت زدہ کر دیا تھا۔ اگر ایسا ہی جائزہ جنگ کے فوراً بعد' یعنی ۱۹۴۶ء میں لیا جاتا تو جرمنوں کو انتہائی قوم پرست خیال کرنے والے طلباء کا تناسب شاید اور بھی زیادہ ہوتا۔

۱۹۳۳ء میں جن طلباء کی رائے کا جائزہ لیا گیا تھا' ان میں سے ۳۲ فی صد نے اطالویوں کو خاص طور پر موسیقی سے لگاؤ رکھنے والے قرار دیا تھا۔ لیکن ۱۹۶۷ء کے دوسرے جائزے میں صرف ۹ فی صد طلباء نے یہی رائے دی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ دونوں جائزوں کے درمیانی برسوں میں اطالوی گلوکاروں اور موسیقاروں کی جگہ دوسرے گلوکاروں اور موسیقاروں نے لے لی تھی۔

ایک اور دلچسپ تبدیلی یہ دیکھنے میں آئی کہ پہلے جائزے میں ۸۴ فی صد طلبا نے سیاہ فام لوگوں کو توہم پرست قرار دیا تھا۔ لیکن ۱۹۶۷ء میں صرف ۱۳ فی صد طلباء نے یہ رائے دی۔ اس تبدیلی کا سبب کیا ہے؟ بہت سے عوامل ہیں جن کو ہم اس تبدیلی کا ذمہ دار قرار دے سکتے ہیں۔ تاہم ایک اہم وجہ شاید یہ ہے کہ ۱۹۳۳ء کے لگ بھگ مقبول عام فلموں میں سیاہ فام افراد کو جنوں بھوتوں سے ڈرتے کانپتے دکھایا جاتا تھا۔ ۱۹۶۷ء میں' شہری حقوق کی عوامی تحریکوں کے عروج کے زمانے میں اکثر سفید فام امریکی محسوس کرنے لگے تھے کہ سیاہ فام شہریوں کے بارے میں ان کی آراء غیر حقیقی اور بے بنیاد تھیں۔ سچی بات یہ ہے کہ جب نئے حقائق منظرِ عام پر آتے ہیں تو بتہ سے لوگ اپنی آراء تبدیل کر لیتے ہیں۔ لوگوں کے ذہن کھلے ہوں اور وہ نئی معلومات قبول کرنے پر آمادہ ہوں تو ان کی آراء آسانی سے تبدیل ہو جاتی ہیں۔ ذہن کو کھلا رکھنے کا رویہ نئے حالات سے خود کو ہم آہنگ کرنے اور مستقبل کو بہتر بنانے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔

آراء میں تبدیلیاں دوسروں کے ساتھ تعاون اور ان کے ساتھ ہمدردی پر مبنی اخلاقی اقدار کے ڈھانچے کی حدود میں رونما ہونی چاہئیں۔ ان بنیادی اقدار کے بغیر تغیر پذیر آراء بہت تباہ کن ثابت ہوسکتی ہیں اور وہ فساد کا باعث بن سکتی ہیں۔

اخلاقی اقدار' آراء اور رویے آپس میں گہرے طور پر مربوط ہوتے ہیں۔ لوگ جس انداز سے اپنی آراء کا اظہار کرتے ہیں' اس کو ان کا رویہ کہتے ہیں۔ آپ اس پر غور

فرمائیے۔ ۱۹۲۰ء کے عشرے تک مغرب میں ان مردوں کو گرفتار کر لیا جاتا تھا جو نا موزوں لباس پہن کر باہر نکلتے تھے۔ مثلاً جسم کا اوپر کا حصہ بھی ڈھانپ کر رکھنا پڑتا تھا۔ اس زمانے کی اقدار کے مطابق انسانی جسم کی غیر ضروری نمائش کو نامناسب خیال کیا جاتا تھا۔ اس لیے اگر کوئی شخص لباس کا اوپر والا حصہ استعمال نہ کرتا تھا تو لوگ اس کو اچھا نہیں سمجھتے تھے۔

آج کے زمانے میں انسانی جسم کی نمائش سے متعلق اقدار بہت زیادہ بدل چکی ہیں۔ چنانچہ عریانی پرستوں کے ایسے گروہ بھی وجود میں آ چکے ہیں جن کے نزدیک انسانی جسم کے تمام حصوں کی نمائش گناہ نہیں بلکہ خوبی ہے۔ اس قسم کے گروہ ایسے سمندری ساحلوں کی تلاش میں رہتے ہیں جہاں وہ اپنے عقیدوں پر عمل کر سکیں۔

آرا اور رویے عموماً انتہا پسندی کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ بعض ملکوں کے سمندر کے کناروں پر عورتوں اور مردوں دونوں کو بالکل عریاں ہو کر چہل قدمی کی اجازت ہے۔ دوسری طرف ایسے قدامت پسند معاشرے بھی ہیں جن میں مذہبی اور اخلاقی رہنما عورتوں کو چہرے کی بے پردگی کی اجازت دینے پر بھی آمادہ نہیں۔ وہ عورتوں کو چادر اور چار دیواری میں بند رکھنا چاہتے ہیں اور عورتوں کے معاشرتی کردار کو گناہ خیال کرتے ہیں۔

اختلاف رائے دور کرنا

ہماری آج کی پیچیدہ دنیا میں دوسروں کے موقف کو ہمدردی سے سمجھ کر اختلاف رائے کو دور کرنے کی اہلیت کی اہمیت گزشتہ تمام ادوار سے بڑھ چکی ہے۔ یہ محض انفرادی معاملہ نہیں بلکہ کسی مبالغے کے بغیر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ انسانی بقاء کا دارومدار قابلِ ذکر حد تک اس امر پر ہے کہ آیا ہم دوسروں کے نقطہ ہائے نظر کو سمجھ سکتے ہیں یا نہیں۔ اختلاف رائے کو دور کرنے کے بہت سے طریقے تشکیل دیئے گئے ہیں۔ ان کا مقصد افراد کے درمیان تضاد آراء کے نتیجے میں پیدا ہونے والے تصادم کو ختم کرنا ہے۔ ہم ان طریقوں سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ بعض معاشروں میں غیر جانبدار' رضا کاروں کی انجمنیں اختلافات کو دور کرنے کے لیے اپنی خدمات پیش کرتی ہیں۔ یہ انجمنیں اپنی طرف سے کوئی حل نہیں ٹھونستیں۔ بلکہ وہ ایسے سوالات پیش کرتی ہیں جن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ فریقین ایک

دوسرے کے نقطۂ نظر کو معروضی انداز میں دیکھ سکیں۔ یوں اکثر اوقات فریقین میں افہام و تفہیم پیدا ہو جاتی ہے اور وہ خوشگوار انداز میں اپنے اختلافات دور کر لیتے ہیں۔

افراد اور کاروباری ادارے اپنے جھگڑے ختم کرنے کے لیے اکثر اوقات ثالثی سے کام لیتے ہیں اور یوں مہنگی مقدمہ بازیوں سے بچ جاتے ہیں۔ ثالث بھی اپنی طرف سے کوئی فیصلہ نہیں دیتا۔ اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ فریقین کسی ایسے حل تک پہنچ جائیں جو فریقین کے لیے مفید ہو۔

ہمارے ہاں پنچایت کا تصور بھی موجود ہے۔ جھگڑنے والے یا اختلاف رائے رکھنے والے افراد یا گروہ کسی شخص یا جماعت کو پنچ مان لیتے ہیں اور اس کا فیصلہ حتمی مانا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ طریقہ کار طویل اور مہنگی قانونی لڑائیوں کے مقابلے میں زیادہ معقول ہے اور سستا بھی۔

بین الاقوامی امور میں ایک امید افزا طریقہ یہ ہے کہ باہمی مسائل حل کرنے کے لیے مملکتوں کے سربراہ آپس میں ملاقاتیں کرتے ہیں۔ ہوائی سفر سے پہلے کے زمانے میں اتنے بڑے پیمانے پر ایسی ملاقاتیں ممکن نہ تھیں۔ اب تو صرف سربراہانِ مملکت ہی نہیں ملتے' بلکہ مختلف سرکاری سطحوں پر حکومتوں کے درمیان رابطے قائم رہتے ہیں۔

اقوام متحدہ کا ادارہ بھی مختلف قوموں کے درمیان اختلافات دور کرنے کے لیے میل ملاپ اور بحث و مباحثہ کے مواقع مہیا کرتا ہے۔ اس نے بہت سے جھگڑے پر امن طریقے سے ختم کرنے میں قابلِ قدر مدد مہیا کی ہے۔ اس عالمی ادارے کی کارکردگی مزید موثر بنانے کی ضرورت بھی ہے تاکہ جنگ کے امکان کو کم سے کم کیا جا سکے اور قومیں باہمی اختلافات جنگ کے بجائے پر امن طریقوں سے حل کر سکیں۔

غیر سرکاری سطح پر مختلف ملکوں کے عوامی گروہ ایک دوسرے کے ساتھ مباحثے کرتے ہیں اور ایک دوسرے کا موقف سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ۱۹۹۵ء کے اوائل میں ایسی ہی ایک کوشش جنوبی ایشیا میں بھی ہوئی ہے' جہاں پاکستان اور بھارت کے درمیان عوامی سطح پر مذاکرات ہوئے ہیں۔

تبادلہ خیال کے لیے مختلف قوموں کے درمیان ادیبوں' تاجروں' سائنس دانوں' فنکاروں اور دوسرے وفدوں کا باقاعدگی سے تبادلہ ہوتا رہتا ہے۔ بین الاقوامی

آمدورفت کی سہولتوں نے عالمی افہام وتفہیم کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ اس طرح لوگ ایک دوسرے کو جاننے لگے ہیں، سمجھنے لگے ہیں۔ یوں بہت سی غلط فہمیاں دور ہوئی ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ اشتراک و ہمدردی کے احساسات پیدا ہوئے ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ہماری دنیا تیزی سے ''عالمی گاؤں'' بنتی جا رہی ہے۔ ہم سب کا مقدر ایک دوسرے سے مربوط ہوتا جا رہا ہے۔

یہ تمام مثبت تبدیلیاں ہمیں آس دلاتی ہیں کہ مہذب اقوام ماضی کی ہولناک غلطیاں نہیں دہرائیں گی۔ بلاشبہ مقامی اور علاقائی جھگڑے اب بھی موجود ہیں۔ خاص طور پر مشرق وسطیٰ، وسطی ایشیا اور جنوبی ایشیا میں بہت سی کشیدگی پائی جاتی ہے۔ لیکن دنیا نے مجموعی طور پر یہ بات تسلیم کر لی ہے کہ مل جل کر رہنا ہی بہتر ہے۔

تعصب اور امتیاز

ایک امریکی سیاح نے میکسیکو کے ایک کسان کو درخت کے نیچے خوابِ خرگوش کے مزے لوٹتے دیکھا تو بڑبڑایا:

''ذرا دیکھو تو' عین دوپہر کے وقت سویا ہوا ہے۔ یہ کام چور لوگ زندگی میں کیا کریں گے!''

پھر سیاح نے کیمرہ نکالا اور خوابیدہ کسان کی تصویر اتارنے لگا۔

ایک ہمسایہ دکاندار کھڑکی سے جھانک رہا تھا۔ اس نے امریکی سیاح کو دیکھا اور اپنی بیوی سے کہنے لگا:

''ان مالدار امریکیوں کے اللے تللے دیکھو۔ ذرا کام نہیں کرتے۔ بس تصویریں اتارتے ہیں اور پیسے لٹاتے ہیں''۔

دونوں' سیاح دکاندار' اپنی اپنی رائے بیان کر رہے تھے' لیکن کیا ان کی آراء مشاہدے پر مبنی تھیں؟ یونہی برائے نام مشاہدہ ہی کہیۓ۔ اصل میں وہ دونوں ایک دوسرے کے خلاف تعصب کا شکار تھے۔

ذرا اس حقارت کا اندازہ کیجیۓ جس کے ساتھ امریکی نے اپنی رائے دی تھی۔ ''عین دوپہر کے وقت سویا ہوا ہے۔ یہ کام چور لوگ زندگی میں کیا کریں گے''۔ اس حقارت میں یہ نکتہ شامل ہے کہ امریکی ان ''کام چور'' اہلِ میکسیکو سے برتر ہیں۔ اسی طرح میکسیکو کا دکاندار امریکی سیاحوں کا حقارت سے ذکر کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ مالدار لوگ ہیں' کام نہیں کرتے' بس تصویریں اتارتے پھرتے ہیں اور اپنی دولت لٹاتے رہتے ہیں۔

آیئے ہم آپ کو میکسیکو کے کسانوں کے بارے میں چند حقائق بتائیں جوان کو کاہلی کا طعنہ دینے والے امریکی سیاح کو معلوم نہ تھے۔ وہاں کا ایک عام کسان صبح سویرے پانچ بجے اٹھتا ہے اور بہت سی اشیاء کا بھاری بوجھ اپنی پیٹھ پر لاد کر پانچ چھ میل دور مارکیٹ تک پیدل جاتا ہے۔ دوپہر تک کڑی دھوپ میں اس کے کئی گھنٹے گزر جاتے ہیں۔ تجربے سے اس نے یہ سیکھا ہے کہ جب گرمی کی شدت ہو تو دوپہر کے وقت دھوپ سے بچنا چاہیے۔ اس سے بچنے کا ایک مناسب طریقہ یہ ہے کہ کچھ دیر کے لیے درخت کے کسی ٹھنڈے سائے میں ستا لیا جائے۔ جب دوپہر ڈھل جاتی ہے تو وہ اٹھتا ہے اور گھر کا رخ کرتا ہے۔ تھکا ہارا وہ گھر پہنچ کر روکھی سوکھی کھا کر چادر تان کر سو جاتا ہے۔

دوسری طرف میکسیکو کے دکاندار کے امریکی سیاح کے بارے میں جو رائے دی تھی تو اس کو خبر نہ تھی کہ وہ امریکی سیاح ایک چھوٹے سے ادارے میں ملازم ہے۔ اس کی آمدن قلیل ہے۔ کئی برسوں تک اس نے سخت محنت کر کے تھوڑے بہت پیسے بچائے تھے تاکہ اور کچھ نہیں تو میکسیکو کا ایک چکر ہی لگا لے۔

تعصّبات اور دقیانوسیت

امریکی سیاح اور میکسیکو کا دکاندار دونوں ہی ایسی آرا ظاہر کر رہے تھے جو تعصّب پر مبنی تھیں۔ دونوں لکیر کے فقیر تھے۔ تعصّب سے مراد یہاں یہ ہے کہ کسی شے یا شخص کے متعلق حقائق معلوم کیے بغیر کوئی رائے بنا لینا۔ آپ اس کو نتائج کی طرف چھلانگ لگانے سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔

متعصّبانہ آراء کو عموماً مخالفانہ سمجھا جاتا ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں۔ کیونکہ کوئی رائے موافق یا ہمدردانہ ہوتے ہوئے بھی تعصب آمیز ہو سکتی ہے۔ مثال کے طور پر فرض کیجئے کہ ایک نوجوان ملازمت کے لیے درخواست دیتا ہے۔ اتفاق سے اس کا تعلق اسی لسانی یا نسلی گروہ سے ہے جس سے مالک کا تعلق بھی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ مالک کئی دوسرے زیادہ اہلیت رکھنے والے امیدواروں کو مسترد کر کے اس نوجوان کو ملازمت دے دیتا ہے۔ یوں ہم کہیں گے کہ اس نوجوان کو ملازمت اپنی اہلیت کے بجائے مالک کے تعصّب کے سبب ملی۔ زندگی میں یہ ہوتا ہی رہتا ہے کہ کسی مذہب، فرقہ، رنگ، نسل یا علاقے

سے تعلق رکھنے والے لوگ اپنے گروہ کے لوگوں کی ناجائز طرفداری کرتے ہیں۔

دقیانوسیت یا لکیر کی فقیری سے یہاں مراد محدود معلومات پر مبنی ایسی رائے رکھنا ہے جو کسی گروہ کے تمام افراد کو ایک جیسا قرار دیتی ہے۔ پھر اس دقیانوسی رائے کا اطلاق گروہ کے تمام افراد پر کر دیا جاتا ہے' چاہے وہ رائے گروہ کے کسی ایک فرد یا پورے گروہ کے بارے میں درست نہ ہو۔ ہم نے ابھی جو قصہ بیان کیا تھا' اس میں امریکی سیاح میکسیکو کے تمام کسانوں کو کام چور سمجھ رہا تھا اور میکسیکو کا دکاندار تمام امریکی سیاحوں کو دولت مند' کاہل اور شاہ خرچ قرار دے رہا تھا۔

لکیر کا فقیر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جدت کو قبول نہ کیا جائے۔ یوں تمثیلاً ہم یہ کہہ سکتے ہین کہ جب ہم کسی فرد کو نہ جانتے ہوں اور ہمیں بس یہ عم ہو کہ اس کا تعلق فلاں گروہ سے ہے تو پھر ہم یہ فرض کر لیتے ہیں کہ وہ شخص ہو بہو اپنے گروہ جیسا ہو گا۔

جب کسی گروہ کے انفرادی ارکان کے بارے میں ہمیں معلومات حاصل ہو جائیں تو دقیانوسی رائے تبدیل ہو سکتی ہے۔ اس صورت میں ہم یہ کہیں گے کہ دقیانوسی رائے اصل میں غلط فہمی پر مبنی تھی۔ گویا مناسب معلومات دستیاب ہونے پر دقیانوسی ختم ہو سکتی ہے۔ شرط بس یہ ہے کہ ہمارے تعصّبات راہ میں حائل نہ ہوں اور نئی معلومات کی روشنی میں ہمیں اپنی رائے بدلنے دیں۔

کھلے ذہن کے لوگ بھی بسا اوقات اس قسم کی دقیانوسی رائے کا شکار ہو سکتے ہیں۔ لیکن جب ذاتی تجربے یا نئی معلومات حاصل ہونے پر ان کو اپنی رائے کے غلط ہونے کا احساس ہوتا ہے تو وہ فوراً اس کو بدل لیتے ہیں۔ ان کے برعکس بند ذہن رکھنے والے لوگ نئی معلومات حاصل ہونے کے باوجود لکیر کے فقیر بنے رہتے ہیں اور اپنی رائے پر نظر ثانی نہیں کرتے۔ اس قسم کے تعصّبات امتیازی سلوک کو جنم دیتے ہیں۔

ہم لکیر کے فقیر کیسے بنتے ہیں؟

ہمارے آباؤ اجداد کے مقابلے میں ہماری آج کی دنیا بہت زیادہ پیچیدہ ہے۔ وہ لوگ چھوٹے اور الگ تھلگ معاشروں میں رہتے تھے اور گردونواح کے لوگوں' چیزوں اور واقعات کے بارے میں بھی ان کا علم بہت کم ہوتا تھا۔ لیکن آج کے عالمی ماحول میں

جاننے، پڑھنے اور دیکھنے کے لیے بہت کچھ ہے۔ آج کی دنیا میں سینکڑوں اقدام ہیں۔ مختلف زبانوں، بولیوں اور ثقافتوں کے حامل بے شمار گروہ ہیں۔ بے شمار قسم کے مواد، مصنوعات اور عجیب و غریب نئی اشیاء ہیں جو ہماری توجہ اور فہم کا تقاضا کرتی ہیں۔

براہِ راست تجربے کے ذریعے ہم سب کچھ نہیں جان سکتے۔ اس لیے ہم کو خلاصوں اور مختصر راستوں کی ضرورت پیش آتی ہے۔ یہ ضرورت خاص طور پر اس وقت محسوس ہوتی ہے جب ہم مختلف گروہوں کے بارے میں اپنے والدین، اساتذہ، دوستوں اور ہمسایوں کی باتیں سنتے ہیں۔ اسی طرح ہم کتب، اخبارات و جرائد کے مطالعے سے یا ریڈیو سننے سے یا پھر ٹیلی وژن اور فلمیں دیکھ کر بہت سے امور کے بارے میں معلومات حاصل کرتے ہیں۔

امریکہ کے مشہور صحافی والٹر لپ مین نے اس صورت حال پر یوں تبصرہ کیا تھا:

> ''حقیقی ماحول اس قدر عظیم الشان، پیچیدہ اور تغیر پذیر ہے کہ ہم اس کو براہِ راست گرفت میں نہیں لے سکتے۔ ہم اس قدر باریکیوں، اس قدر تنوع اور اس قدر ردوبدل سے عہدہ برآ ہونے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ ہمیں اگرچہ اسی ماحول میں اپنا کردار ادا کرنا ہوتا ہے، تاہم سرگرم کار ہونے سے پہلے ہم اس کی سادہ تر صورت میں تشکیل نو کرتے ہیں''۔

لپ مین نے ''ہمارے ذہن میں پائی جانے والی تصاویر'' کا حوالہ دیا ہے۔ اصل میں یہ تصاویر اس امر کے ذہنی خاکے ہیں کہ حقیقی دنیا میں کس قسم کے لوگ اور چیزیں پائی جاتی ہیں۔ ان سب سے اکثر لوگ اور چیزیں ہمارے براہِ راست تجربے سے باہر ہوتی ہیں۔ چونکہ ہم ہر شے کا براہِ راست علم حاصل نہیں کر سکتے، اس لیے ہمیں لازماً دوسروں کی مہیا کردہ معلومات پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح کئی غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں۔ ہمیں درست معلومات حاصل نہیں ہوتیں یا پھر ناکافی معلومات دستیاب ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب ہم اس قسم کی ناموزوں یا ناکافی معلومات کی بنیاد پر فیصلے کرتے ہیں تو پھر غلطیوں کا امکان بہت بڑھ جاتا ہے۔

زندگی کی پیچیدگیوں کو قابلِ فہم بنانے کے لیے اہم اپنے ذہن میں افراد، وقعات

اور اشیاء کو چند گروپوں میں تقسیم کر لیتے ہیں۔ یہ تقسیم عمومی قسم کی ہوتی ہے۔ اس طرح بھی کئی مغالطے جنم لیتے ہیں۔ ان میں سے بعض مغالطے بے ضرر قسم کے ہوتے ہیں اور کسی قسم کا تعصب پیدا نہیں کرتے۔

خیر، تمام مغالطے بے ضرر نہیں ہوتے۔ کسی گروہ میں بعض دوسرے گروہوں کے بارے میں غلط فہمیاں، مغالطے اور ان پر مبنی تعصّبات صدیوں تک قائم رہتے ہیں۔ وہ ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ ہمارے ہاں ہندوؤں اور سکھوں کے بارے میں ایسے کئی تعصّبات موجود ہیں۔ یہودی تو ایسی قوم ہیں کہ جن کے بارے میں عجیب و غریب تعصّبات ساری دنیا میں پائے جاتے ہیں۔ شاید آپ کو یہ جان کر تعجب ہوگا، لیکن یہ حقیقت ہے کہ ۱۹۴۰ء کے عشرے سے پہلے مغربی دنیا میں یہ تصور عام پایا جاتا تھا کہ یہودیوں کے سر پر سینگ ہوتے ہیں۔ چنانچہ ان سے پہلی بار ملنے والے سینگوں کے بارے میں پوچھا کرتے تھے۔ اصل میں ان لوگوں نے مائیکل اینجلو، ڈوناٹیلو اور دوسرے مشہور فنکاروں کے بنائے ہوئے حضرت موسیٰؑ کے مجسمّے، تصاویر یا کتابوں میں ان کی نقول دیکھ رکھی تھیں۔ ان میں حضرت موسیٰؑ کے سر پر سینگ دکھائے گئے ہیں اور عام لوگ حضرت موسیٰؑ کو نمائندہ یہودی خیال کرتے ہیں۔ اس لیے وہ سمجھتے تھے کہ سب یہودیوں کے سر پر واقعی سینگ ہوں گے۔

یہ تعصب قرونِ وسطیٰ میں بائبل کا عبرانی زبان سے لاطینی میں ترجمہ کرتے ہوئے ایک غلطی سے پیدا ہوا تھا۔ بائبل کے حصے، کتاب خروج میں پہاڑ پر خدا سے مکالمہ کے بعد حضرت موسیٰؑ کی واپسی کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ ان کے سر سے روشنی کی شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔ اس ضمن میں عبرانی زبان کا لفظ KARAN استعمال ہوا ہے، جس کے معنی شعاعیں بھی ہیں اور سینگ بھی۔ لاطینی میں ترجمہ کرنے والوں نے شعاعوں کے بجائے سینگ درج کر دیا۔ بلاشبہ مترجمین نے جب ''شعاعوں'' کے بجائے ''سینگ'' کا لفظ استعمال کیا تو اس سے یہودیوں کے بارے میں ان کے تعصّبات کی نشاندہی بھی ہوتی ہے۔

اقلیتوں کے بارے میں ساری دنیا میں عجیب و غریب قصے مشہور ہوتے ہیں۔ عموماً ان کی بنیاد اسی قسم کے مغالطوں اور وہموں پر ہوتی ہے۔ نسل در نسل منتقل ہونے کے

سبب وہ زندگی اور ثقافت کا حصہ بن جاتے ہیں۔ اس لیے مغالطّوں اور وہموں کے خاتمے سے تعصّبات خود بخود ختم نہیں ہوتے۔ البتہ کمزور ضرور ہو جاتے ہیں۔

گزشتہ نصف صدی کے دوران موٹروں اور طیاروں کے ذریعے دور دراز کے سفر کرنے کی بے پناہ سہولتیں میسر آئیں' ریڈیو اور ٹیلی وژن کے ذریعے دور دراز کے لوگوں کو جاننے کا موقع ملا۔ یوں نامانوس اقلیتوں کے بارے میں لوگوں کو بڑے پیمانے پر معلومات حاصل ہوئیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کھلے ذہن کے افراد نے پرانے قصے کہانیوں اور تعصّبات سے نجات حاصل کر لی۔ مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ ہماری دنیا میں بند ذہن رکھنے والوں کی کمی نہیں۔ وہ اپنے رویے بدلنے پر آمادہ نہیں ہوتے اور آج بھی اپنے ذہن و دل میں پرانے تعصّبات کو لیے بیٹھے ہیں۔

بچے نسلی تعصّبات بہت چھوٹی عمر میں سیکھ لیتے ہیں۔ چنانچہ سب چھوٹے چھوٹے سفید فام بچوں کو سیاہ اور سفید گڑیاں دی جاتی ہیں اور پوچھا جاتا ہے کہ کون سی گڑیا اچھی لگتی ہے اور کون سی بری تو ان میں سے اکثر سفید گڑیا کو اچھی اور سیاہ گڑیا کو بری قرار دیتے ہیں۔

نسل در نسل چلنے والے اس تعصّب کا سبب شاید یہ ہے کہ سیاہ رنگ ایسے الفاظ سے منسلک ہے جو "بُرا" ہونے کا تاثر دیتے ہیں۔ رات کی تاریکی یا سیاہی جنوں' بھوتوں اور چڑیلوں کی یاد دلاتی ہے۔ کالا رنگ کالے کرتوتوں کی علامت بھی ہے۔ یہی نہیں کالا رنگ ماتم' سوگواری' بلیک آؤٹ' کالا جادو' بلیک میل' بلیک لسٹ اور بہت سی دوسری منفی چیزوں سے بھی منسلک ہے۔

اس کے برخلاف سفید رنگ پاکیزگی اور صفائی کی علامت ہے۔ سفید دن' سفید کپڑے اور دوسری سفید چیزیں مثبت اور عمدہ علامتیں سمجھی جاتی ہیں۔ بچے بالکل ابتدائی عمر میں یہ فرق سیکھ لیتے ہیں۔ یوں ان کے ذہن میں سیاہ رنگ اور بدی منضبط ہو جاتے ہیں۔ آخرکار وہ سیاہ فام انسانوں کو بدی' شر اور جرم کی علامت خیال کرنے لگتے ہیں۔

اس قسم کے کئی تعصّبات بچپن سے فروغ پاتے رہتے ہیں۔ یوں فرد جب بلوغت کو پہنچتا ہے تو اس کے ذہن میں تجربے میں آنے والی اور شخصی تجربے سے باہر کی بہت سی چیزوں سے متعلق اچھائی برائی' خیر و شر' موزوں و ناموزوں' نرم و سخت اور کئی دوسری

خصوصیات کے بارے میں بہت سے عکس بن چکے ہوتے ہیں۔

مثال کے طور پر لوگوں سے متعلق ابتدائی اندازوں کی تشکیل میں ''پرکشش'' اور ''غیر پرکشش'' کے تصورات پر توجہ فرمائیے۔ امریکہ میں ایک تجربہ کیا گیا تھا جس میں کالج کے لڑکوں کو دو مضامین کی قدر و قیمت کا تعین کرنے کو کہا گیا تھا۔ ان میں سے ایک مضمون بہت اچھا لکھا ہوا تھا جبکہ دوسرا بس واجبی سا تھا۔ ان دو مضمونوں کے ساتھ ایک نوجوان عورت کی تصویر منسلک تھی، جس کے بارے میں دوسرے طالبِ علم پرکشش یا غیر پرکشش ہونے کا فیصلہ دے چکے تھے۔ تصویر اور مضمون نگار میں کوئی تعلق نہ تھا۔ اس تجربے میں یہ دیکھا گیا کہ جب واجبی سے مضمون کے ساتھ ایک پرکشش خاتون کی تصویر ٹانک دی گئی تو لڑکوں نے اس مضمون کو کم نمبر دیئے گئے۔ اچھے مضمون کا معاملہ مختلف ثابت نہ ہوا۔ پرکشش اور معمولی عورتوں کی تصاویر کے ساتھ جب یہ مضمون نمبر لگانے کے لیے دیا گیا تو لڑکوں نے جو نمبر دیئے، ان میں بھی پرکشش عورتوں والی تصاویر سے منسلک مضمون کو زیادہ اور دوسروں کو کم نمبر دیئے گئے۔ گویا کالج کے طالب علموں نے اپنا فیصلہ نفس مضمون کی بنیاد پر نہیں دیا بلکہ شعوری یا لاشعوری طور پر تصاویر کو بنیاد بنا کر انہوں نے مضامین کا جائزہ لیا تھا۔

جب ہم کسی ایسے شخص کو دیکھتے ہیں جس کا تعلق اس گروپ سے ہوتا ہے، جس کے بارے میں ہمارے ذہن میں بہت سے تعصّبات ہوتے ہیں تو ہم میں سے اکثر لوگ یہ فرض کر لیتے ہیں کہ اس شخص میں اپنے گروپ کی خصوصیات موجود ہوں گی۔ اگر اس گروپ کے کئی افراد سے ہم کو میل جول کا موقع ملے اور ہم یہ محسوس کریں کہ ان کے بارے میں ہمارے تعصّبات درست نہ تھے تو پھر ہم میں سے اکثر اپنے خیالات بدل لیتے ہیں۔

عام طور پر تعصّبات استدلال کے مغالطّوں سے پیدا ہوتے ہیں اور یہ مغالطے غلط اور گمراہ کن حقائق اور ضروری غور و فکر کے بغیر نتائج تک چھلانگ لگانے سے پیدا ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں جب ہم ضروری تجزیے کے بغیر کلیئے وضع کر لیں تو بھی اس قسم کے مغالطّوں کا امکان بڑھ جاتا ہے۔ لہٰذا تعصّبات سے کام لیتے ہوئے ہمیں محتاط رہنا چاہے اور یہ توقع بھی رکھنا چاہیے کہ ہمارا نقطۂ نظر اور رویہ غلط ہوسکتا ہے۔

لوگوں کے بارے میں ہمارے تعصّبات کا آغاز ہی غلطی سے ہوتا ہے کیونکہ ہم ان کا اطلاع کسی گروپ کے تمام افراد پر کر دیتے ہیں۔ بلا شبہ ہم سب ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ لیکن یہ نہ بھولیے کہ آپ میں روزمرہ کے معاملات میں انسان ایک دوسرے سے اس قدر مختلف نہیں ہوتے جتنے کہ ایک دوسرے جیسے ہوتے ہیں۔ حالانکہ ثقافتی فرق موجود ہیں اور لوگ اپنے اپنے ورثے کے بوجھ سے نجات نہیں پا سکتے۔ یہ امر بعض تعصّبات کی بنیاد بن سکتا ہے۔ لیکن اکثر تعصّبات کی بنیاد بہت کمزور ہوتی ہے اور ان کی مدد سے ہم دوسرے گروپوں کے لوگوں سے متعلق فیصلے نہیں کر سکتے۔

عموماً ہم اپنے گروپ کو اچھا اور دوسرے کو برا سمجھتے ہیں۔ پھر یہ ہوتا ہے کہ اگر دوسرے گروپوں کے لوگ ہمارے جیسے ہوں تو ہم انہیں پسند کرنے لگتے ہیں اور اگر وہ مختلف ہوں تو پھر ہم ان کو پسند کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ شکل وصورت' لباس' اقدار' رہن سہن اور رویوں میں جس قدر زیادہ فرق ہو' اتنا ہی زیادہ ہم ان کو ''برا'' خیال کرنے لگتے ہیں۔

تعصّبات کے ساتھ شدید جذبات شامل ہو جائیں تو یہ ملاپ خوفناک ثابت ہوتا ہے۔ ہر معاشرے میں کوئی نہ کوئی چھوٹا سا گروہ موجود ہوتا ہے جو اپنے احساسات کا اظہار تشدد کی کارروائیوں کے ذریعے کرتا ہے۔ اس کا نشانہ خاص طور پر اس گروپ کے افراد بنتے ہیں جس کے بارے میں معاشرے میں گہرا تعصّب پایا جاتا ہے۔ یوں بھی ہوتا ہے کہ تشدد پسند افراد کوئی جماعت بنا لیتے ہیں تا کہ زیادہ منظّم طریقے سے تعصّبات کے شکار گروپ کے افراد کو نشانہ ستم بنا سکیں۔

جس گروپ کو نشانہ ستم بنایا جاتا ہے' اس میں فطری طور پر ردِعمل پیدا ہوتا ہے۔ اس کے متشدد افراد بھی تشدد پر اتر آتے ہیں۔ یوں معاشرے میں قتل وغارت بڑھتی ہے' خوف وہراس پیدا ہوتا ہے اور طرفین کے تعصّبات میں مزید شدت آ جاتی ہے۔ طرفین میں' یعنی دونوں گروپوں میں' رابطے ختم ہو جاتے ہیں۔ یوں جھگڑے کی بنیاد بننے والی متعبانہ آرا پر قابو پانا اور بھی دشوار ہو جاتا ہے۔

دشمنیوں اور جنگوں کے پیچھے عموماً بتہ سے تعصّبات کارفرما ہوتے ہیں۔ جن لوگوں کو ہم اچھا سمجھیں' ان کو قتل کرنا مشکل ہوتا ہے۔ اس لیے تو میں عام طور پر اس وقت ہتھیار

اٹھاتی ہے جب مخالف قوم کے بارے میں تعصبات میں پوری شدت پیدا ہو چکی ہو۔ اچھی طرح جنگ لڑنے اور جنگ جیتنے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ فریقین کے سپاہی ایک دوسرے سے نفرت کریں۔ اس لیے جنگ سے پہلے اور اس کے دوران فوجی تربیت کے ذریعے تعصّبات کو ابھارا جاتا ہے اور دشمن کے خلاف شدید جذبے پیدا کیے جاتے ہیں۔ دشمن کے شہریوں کے خلاف بھی نفرت کو ہوا دی جاتی ہے۔

مختلف قوموں کے درمیان تشدّد اور جنگوں کو روکنے کے لیے تعصّبات پر قابو پانا ضروری ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ کام کیسے کیا جاسکتا ہے؟

تعصّبات کیسے تبدیل کیے جائیں؟

تعصّبات کو تبدیل کرنے کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ ہم اپنے آپ کو ان لوگوں کی جگہ رکھ کر دیکھیں جن کے خلاف تعصّب ہوتا جاتا ہے۔ ثقافتی فرق اگر بہت زیادہ نہ ہو اور تعصب میں شدید قسم کے جذبے شامل نہ ہوں تو یہ طریقہ عموماً کامیاب رہتا ہے۔ جذبوں کے شامل ہونے کی صورت میں تعصّب سے نجات حاصل کرنے کے لیے اکثر اوقات ضروری ہوتا ہے کہ مختلف گروہوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو ایسی صورت حال میں اکٹھا کر دیا جائے جہاں انکو کسی اہم مشترکہ مقصد کے لیے مل جل کر کام کرنا پڑے۔ امریکہ میں بعض پرائیویٹ گروپ اس قسم کا کام کرتے ہیں۔ مثلاً آؤٹ ورڈ باؤنڈ ایسا ہی ایک گروپ ہے۔ وہ مختلف گروہوں کے افراد کے ساتھ مل کر جنگلوں میں مہم جوئی کے پروگرام بناتا ہے۔ اس قسم کے حالات میں مقصد کے حصول کی خاطر بہت سی مشترکہ کاوشیں درکار ہوتی ہیں۔ ایک دوسرے کی مدد کے کام میں تعصّبات کم ہو جاتے ہیں بلکہ اکثر اوقات ختم بھی ہو جاتے ہیں۔

چند عمومی تعصّبات

ہمارا معاشرہ تیزی کے ساتھ معاشی' سماجی اور اخلاقی تغیرات کے عمل سے گزر رہا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مختلف مفادات کے حوالے سے بہت سے گروہ وجود میں آ چکے ہیں اور وہ اپنے اپنے مقاصد و مفادات کی خاطر ایک دوسرے کے خلاف محاذ آرائی پر آمادہ رہتے ہیں۔ اس سے پاکستان کے مختلف حصوں میں نسلی اور لسانی تعصّبات خاصے

عام ہیں۔ ان تعصّبات کی بنیاد پر وجود میں آنے والے گروہوں میں محاذ آرائی کبھی کبھی شدت بھی اختیار کر لیتی ہے۔

مذہبی اور فرقہ وارانہ تعصّبات بھی ہمارے ملک میں بہت شدید ہیں۔ مذہبی اقلیتوں کے ساتھ برابری کے سلوک کی گنجائش ہمارے آئین میں بھی موجود نہیں۔ پاکستان میں بعض ایسے قوانین بھی موجود ہیں جن سے غیر مسلموں کے ساتھ ناانصافی کا امکان بڑھ جاتا ہے۔ بعض ایسے مذہبی گروہ بھی موجود ہیں جن کو ریاست نے غیر مسلم قرار دے رکھا ہے اور خود ریاستی ادارے ان پر نہ صرف کڑی نظر رکھتے ہیں بلکہ ان کو دبانے کی بھی ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے۔

مذہبی تعصّب صرف غیر مسلموں کے خلاف ہی موجود نہیں، بلکہ مسلمانوں کے مختلف فرقوں میں بھی ایک دوسرے کے خلاف شدید اور جذباتی قسم کے تعصّبات پائے جاتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے خلاف نفرتوں کی آگ میں سلگتے رہتے ہیں۔ بڑے بڑے فرقوں نے اب اپنی لڑاکا جماعتیں تیار کر رکھی ہیں جو ایک دوسرے کو جانی اور مالی نقصان پہنچانے میں مصروف رہتی ہیں۔

غیر ملکیوں کے بارے میں بہت سے تعصّبات پائے جاتے ہیں۔ مثلاً اہلِ مغرب کے بارے میں یہ رائے عام ہے کہ وہ بے حیا، بداخلاق اور بددیانت ہوتے ہیں اور بروقت دوسری قوموں کو لوٹنے میں مصروف رہتے ہیں۔ ہندوؤں اور یہودیوں کو شاید سب سے برا سمجھا جاتا ہے۔ وہ بدی کے پتلے ہیں اور وہ بھی اس حد تک کہ ان کی اصلاح ممکن نہیں۔

کیا اس قسم کے تعصّبات کی کوئی حقیقت ہے؟ سیدھی سی بات ہے کہ یہ تعصّبات اس گہری جہالت اور پسماندگی کا نتیجہ ہیں جن میں ہمارا معاشرہ گرفتار ہے۔ جس ملک میں خواندگی کی شرح بیس فی صد سے زیادہ نہ ہو، وہاں اس قسم کے تعصّبات کی موجودگی تعجب انگیز نہیں ہونی چاہیے۔

مختلف گروہوں کے بارے میں تعصّبات

کیا مختلف گروہوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے بارے میں آپ کے دل

میں تعصّبات موجود ہیں؟ یہاں ہم ایک فہرست درج کر رہے ہیں جس کے ذریعے آپ خود اس سوال کا جواب دے سکتے ہیں۔ اس فہرست کے ہر اندارج کو پڑھ کر ایک لمحہ کے لیے رکیئے اور اپنے فوری ردِعمل کو نوٹ کیجئے۔ یہ جائزہ لیجئے کہ آپ اس گروپ کے بارے میں مثبت یا منفی احساس رکھتے ہیں۔ آپ کے ذہن میں خوشگوار، ناخوشگوار یا غیر جانبدار تاثر پیدا ہوتا ہے۔ ممکنہ حد تک سچائی سے کام لیجئے۔ یہ دیکھیے کہ اس گروپ کے بارے میں کون سی بات آپ کو پسند یا ناپسند ہے۔ آپ کے تاثر کی واقعاتی بنیاد کیا ہے؟ کیا آپ اس گروپ سے تعلق رکھنے والے کسی فرد سے شناسا ہیں، کبھی آپ نے اس کے ساتھ کام کیا ہے یا لین دین کیا ہے؟ اس گروپ کے بارے میں آپ کی حقیقی معلومات کس قدر ہیں؟

فہرست درج ذیل ہے:

ہندو	سندھی
یہودی	بلوچی
احمدی	پٹھان
سنی	امریکی
شیعہ	یورپی
اردو بولنے والے	روسی

جس گروپ کے خلاف آپ کے دل میں تعصّب موجود ہے، اس کے کسی فرد سے آپ کی ملاقات ہوئی ہے اور آپ نے یہ محسوس کیا ہے کہ وہ فرد ویسا نہیں جیسا کہ آپ سمجھے ہوئے تھے؟

تعصّب کے نتائج

تعصّب محض ذہنی اور مجہوم نہیں ہوتا۔ اس کا اظہار بدکلامی یا نقصان دہ اعمال کے ذریعے ہوتا ہے۔ ڈبلیو آلپورٹ نے تعصّب سے پیدا ہونے والے اعمال میں شدت کی پانچ سطحوں کی نشاندہی کی ہے جو حسبِ ذیل ہیں:

(ا) چغل خوری: اس تعصّب کا اظہار دوسروں کے خلاف باتیں کرنے کی صورت میں ہوتا ہے۔ عموماً یہ کام دوستوں کی محفل میں کیا جاتا ہے۔ اگر معاملہ اس حد سے

آگے نہ بڑھے تو پھر آپ اس کو تعصّب کی سب سے کمزور صورت قرار دے سکتے ہیں۔ لیکن اکثر صورتوں میں معاملہ یہاں تک نہیں رہتا اور بات آگے بڑھ جاتی ہے۔

(۲) پہلو بچانا: اس تعصّب کا اظہار یوں ہوتا ہے کہ لوگ اس گروپ کے افراد سے میل جول سے کئی کتراتے ہیں جس کے خلاف ان کے دل میں تعصّب ہوتا ہے۔

(۳) امتیازی طرزِ عمل: اس تعصّب کے تحت روزگار کے مواقع، رہائش اور سماجی، سیاسی اور معاشی حقوق کے معالے میں امتیاز برتا جاتا ہے اور ناپسندیدہ گروپ کے لوگوں کو مساوی حقوق سے مختلف بہانوں کے ذریعے دور رکھا جاتا ہے۔

(۴) جسمانی حملہ: عام افراد یا جرائم پیشہ لوگ ناپسندیدہ گروپوں کے اکا دکا افراد پر حملہ بھی کر دیتے ہیں۔ ان کے گھروں، کاروبار، موٹروں اور دیگر قسم کی جائیداد کو نقصان پہنچانے کی کوششیں بھی کی جاتی ہیں۔

(۵) قلع قمع کرنا: یہ تعصّب کی شدید ترین صورت ہے جو مخالف گروپ کے افراد کو قتل و غارت پر اکساتی ہے۔ اس کے تحت نہ صرف اکا دکا افراد پر بلکہ گروپ پر بھی دھاوا بول دیا جاتا ہے۔

قانون ناپسندیدہ گروپوں یا ان کے ارکان کے خلاف متشدد کارروائیوں کی اجازت نہیں دیتا اور قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سزا دی جاتی ہے۔ لیکن عموماً ہوتا یہ ہے کہ اگر پولیس حکام اور دیگر تحقیقاتی اداروں کے حکام بھی تشدد کا نشانہ بننے والے گروپ کے خلاف تعصّب رکھتے ہوں تو پھر وہ اپنے فرائض کی ادائیگی میں جان بوجھ کر غفلت سے کام لیتے ہیں اور اس طرح اپنے پسندیدہ گروپ کے حملہ آوروں کو بچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہمارے لوگ میں اس قسم کے واقعات غیر معمولی نہیں ہیں اور افسوس کی بات یہ ہے کہ یہ حکام عام طور پر اپنے اس غیر قانونی اور غیر اخلاقی ارادے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

لاشعوری تعصّبات

عام طور پر لوگ اپنے نسلی تعصّبات سے آگاہ نہیں ہوتے۔ یہاں تک کہ تعصّبات کا عملی طور پر اظہار کرنے والے لوگ بھی اپنے تعصّبات سے بے خبر ہی رہتے ہیں۔ اس

سلسلے میں امریکہ میں ایک تجربہ کیا گیا تھا۔ تجربے کے تحت چند لوگوں کو وڈیو ٹیپ دکھائے گئے تھے، جن میں دو افراد کو بحث کرتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ بحث کا خاتمہ یوں ہوتا ہے کہ ایک آدمی دوسرے کو دھکے دینے لگتا ہے۔ ایک ٹیپ میں دو سفید فام افراد کو بحث کرتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ دوسری میں دو سیاہ فام افراد بحث کر رہے تھے اور تیسری میں بحث وہی تھی لیکن حصہ لینے والوں میں ایک کالا تھا اور دوسرا گورا۔ جن لوگوں کو یہ وڈیو ٹیپ دکھائے گئے تھے وہ سب کے سب سفید فام تھے۔

دیکھنے والوں سے کہا گیا کہ وہ اپنی رائے دیں۔ جب ایک کالے نے گورے کو دھکا دیا تو دیکھنے والوں (جو سب کے سب گورے تھے) میں سے ۷۵ فی صد نے اس کو تشدد قرار دیا۔ دوسری وڈیو پر جب ایک گورے نے کالے کو دھکا دیا تو صرف ۱۷ فی صد نے اسے تشدد ٹھہرایا۔ تیسری بار جب ایک گورے نے دوسرے کو دھکا دیا تو صرف ۱۳ فی صد کے نزدیک یہ متشدد عمل تھا۔ گویا عمل ایک ہی ہے۔ لیکن جب گورا وہ عمل کرتا ہے تو اس کے ہم نسل دیکھنے والے اس کو قابلِ اعتراض نہیں سمجھتے، لیکن جب وہی عمل ایک کالا کرتا ہے تو دیکھنے والوں کی اکثریت اس کو قابلِ اعتراض قرار دیتی ہے۔

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ اعداد و شمار ے ثابت کرتے ہیں کہ گوروں کے مقابلے میں کالے زیادہ جرائم کرتے ہیں۔ لہٰذا وہ زیادہ متشدد ہیں۔ اس استدلال میں وہی خامی پائی جاتی ہے جو تمام تعصّبات کی جڑ ہے، یعنی یہ کہ بعض کالوں کی کرتوتوں کی ذمہ داری تمام کالوں پر ڈال دی گئی ہے۔ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اس رویے سے گریز کریں۔ معصوم اور بے گناہ افراد کی مذمت دوسروں کی بداعمالی کے سبب نہیں کرنی چاہیے۔ جس طرح امن پسند گورے اپنی جرائم پیشہ اقلیت کو راہِ راست پر نہیں لا سکتے، اسی طرح امن پسند اور شائستہ کالے اپنی جرائم پیشہ اقلیت پر کنٹرول نہیں رکھتے۔ مزید برآں جس طرح سفید فام لوگوں کی اکثریت امن پسند ہے، اسی طرح سیاہ فام لوگوں کی اکثریت بھی جرائم کو برا سمجھتی ہے۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ جب کسی امن پسند کالے اور جرائم پیشہ گورے میں کوئی جھگڑا ہو جائے تو اکثر گورے معاملے کی چھان بین کیے بغیر گورے کو معصوم سمجھتے ہیں اور کالے پر انگلیاں اٹھانے لگتے ہیں۔

نسلی تعصّبات عموماً لاشعوری ہوتے ہیں۔ ہم ان سے آگاہ نہیں ہوتے لیکن وہ

ہمارے رویوں اور کردار کا تعین کرتے رہتے ہیں۔ تعصّب کے تحت ہم کسی ناپسندیدہ گروپ کے کسی ایک یا چند افراد کے برے کردار کو بنیاد بنا کر پورے گروپ کو ہی ملعون قرار دے دیتے ہیں۔ یوں جب تشدد پسند افراد مخالف گروپ کے کسی فرد پر حملہ کرتے ہیں تو اس کو فرد نہیں سمجھتے بلکہ مخالف گروپ کی تمام برائیوں کا نمائندہ خیال کرتے ہیں۔ یوں اکثر اوقات وہ معصوم افراد کی ان تمام برائیوں اور جرموں کی سزا دے ڈالتے ہیں جن کو وہ مخالف گروپ سے منسوب کرتے ہیں۔

ہمارے ملک میں مخالف گرویوں میں ہونے والے فسادات کا پیٹرن بھی بالکل یہی ہے۔ جب کوئی شیعہ بدمعاش کسی سنی شخص پر حملہ کر دیتا ہے تو برائی کا ایک چکر شروع ہو جاتا ہے۔ سنی بدمعاشوں کا خون کھولنے لگتا ہے اور سامنے آنے والے کسی بھی شیعہ سے بدلہ لینے کو جائز سمجھنے لگتے ہیں۔ دوسری طرف شیعہ بدمعاش بھی حرکت میں آ جاتے ہیں۔ دونوں گرویوں کے پرامن اور نیک دل ان کو سمجھانے بجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر انتقام کی آگ میں جلنے والے کس کی سنتے ہیں۔

اس قسم کی صورتِ حال سے نجات پانا آسان نہیں ہے۔ وجہ یہ ہے کہ صدیوں کے تعصّبات ہمارے لاشعور میں چھپے ہوئے ہیں۔ ان پر قابو پانے کے لیے بہت سی تعلیم و تربیت درکار ہے۔

اپنی تکمیل کرنے والی پیش گوئیاں

ٹامس کارلائل نے ایک بار کہا تھا کہ ''کسی شخص کو چور کہو تو وہ چوری کرنے لگے گا''۔ یہ بات علمِ نفسیات کے ایک اہم اصول کو بیان کرتی ہے۔ اس اصول کے مطابق لوگوں کے بارے میں جو کچھ کہا اور سوچا جاتا ہے' وہ اس کا ردِعمل دیتے ہیں۔ عموماً ان کا ردِعمل دوسروں کی رائے کے مطابق ہو جاتا ہے۔ مائیں جب بچوں کے بارے میں کہتی ہیں کہ وہ اپنی کتابوں کی پرواہ نہیں کرتے تو عموماً بچے اپنی کتابوں سے بے پرواہ ہو جاتے ہیں۔

اس سلسلے میں روزنتھال اور جیکب سن نے ایک مشہور تجربہ کیا تھا۔ انہوں نے تعلیمی سال کے آغاز پر اساتذہ کو بتایا کہ ان کی جماعت میں بعض ایسے بچے موجود ہیں جن

کے ٹیسٹ لیے گئے تو معلوم ہوا کہ آئندہ ان کی کارکردگی پہلے سے بہتر ہوگی۔ اس ضمن میں بچے کسی منصوبہ بندی کے بغیر منتخب کیے گئے تھے اور ان کو ایسا کرئی اشارہ نہ دیا گیا تھا۔ تعلیمی سال کے خاتمے پر جب ٹیسٹ لیے گئے تو معلوم ہوا کہ جن بچوں کو منتخب کیا گیا تھا' ان کے ذہانتی سکور واقعی بڑھ گئے تھے۔ ایسا کیوں ہوا؟ یہ اس لیے ہوا کہ اساتذہ نے ان بچوں پر خاص توجہ دینا شروع کر دی تھی۔ وہ ان بچوں کو زیادہ محنت پر اکساتے تھے اور ان کو یہ احساس دلاتے تھے کہ ان کی کارکردگی بہتر ہوسکتی ہے۔ جواب میں بچے بھی زیادہ محنت کر کے اپنے اساتذہ کی توقعات پر پورا اترنے کی کوشش کرتے رہے۔

یہ توقعاتی اثر منفی کردار کو بڑھانے میں بھی مددگار ثابت ہوتا ہے۔ فرض کیجئے کہ ایک بچے کی گھریلو مسائل کے سبب سکول میں کارکردگی اچھی نہیں۔ شاید اس کے والدین میں طلاق ہو چکی ہے یا ان میں سے کوئی ایک مر چکا ہے۔ چنانچہ وہ جماعت میں ہنگامہ آرائی کرتا ہے اور شریر بچے کے طور پر مشہور ہو جاتا ہے۔ یہ شہرت دوسرے اساتذہ تک بھی پہنچتی ہے اور وہ توقع کرنے لگتے ہیں کہ ان کی کلاس میں بھی وہ بچہ الجھنیں پیدا کرے گا۔ جب وہ بچہ نئی جماعت میں جاتا ہے تو استاد بدتمیزی کی توقع سے پہلے ہی اس کو جتلا دیتا ہے کہ اس جماعت میں اس کی کوئی بدتمیزی برداشت نہیں کی جائے گی اور یہ کہ اب اس کو محتاط رہنا ہوگا۔ بچہ جان جاتا ہے کہ استاد اس سے شرارتوں کی توقع کر رہا ہے۔ چنانچہ وہ شرارت بازی پر پہلے سے زیادہ مائل ہو جاتا ہے۔

یوں ہم دیکھتے ہیں کہ توقعاتی عامل پیش گوئیوں کی تکمیل کا سبب بنتا ہے۔ گویا وہ تعصّبات میں شدت کا باعث بھی بنتا ہے۔ اگر ہم کسی گروپ کے ارکان سے اپنے ساتھ ایک خاص طرزِعمل کی توقع رکھتے ہیں تو یہ بات ان کے ساتھ خود ہمارے طرزِعمل سے ظاہر ہو جاتی ہے۔ وہ فوراً اس طرزِعمل کا مشاہدہ کر لیتے ہیں اور پھر اسی انداز سے ہمارے ساتھ پیش آنے لگتے ہیں۔ ہاں یہ ہے کہ اس سے یہ ''ثابت'' ہو جاتا ہے کہ ہمارا تعصّب جائز ہے۔ ساتھ ہی اس کی شدت بڑھنے لگتی ہے۔

سکول میں بچوں کی ناکامی کا ایک بڑا سبب کمتری کا احساس ہے۔ اگر کوئی بچہ اپنے بارے میں گھٹیا رائے رکھتا ہے اور اپنے آپ کو مناسب اہمیت نہیں دیتا تو پھر اس کی کارکردگی کا معیار بہتر نہ ہو سکے گا۔ اقلیتی گروپوں سے تعلق رکھنے والے بچے خاص طور پر

اس قسم کے احساس کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ بعض اساتذہ ان کے بارے میں متعصّب ہوتے ہیں اور ان سے دوسرے طالبِ علموں جیسے اچھے نتائج کی توقع نہیں کرتے۔

مقابلہ

آیئے ہم دیکھیں کہ تعصّبات کا توڑ کیونکر کیا جا سکتا ہے۔ اس کی ایک اچھی مثال ۱۹۸۴ء میں ایک کامیاب تاجر یوجین لینگ نے پیش کی تھی۔ لینگ نے اس سکول کے بچوں کو ایک غیر معمولی پیشکش کی جس میں وہ بچپن میں پڑھتا رہا تھا۔ اس سکول میں زیادہ تر غریب سیاہ فام اور ہسپانک بچے پڑھتے تھے۔ ان بچوں کے ایک گروپ سے خطاب کرتے ہوئے لینگ صاحب نے کہا کہ اگر وہ ہائی اسکول کی تعلیم مکمل کر لیں اور کالج میں داخل ہو جائیں تو وہ ان کی کالج تعلیم کے تمام اخراجات خود برداشت کرے گا۔

یہ سکول غریبوں کے علاقے میں واقع تھا جہاں عموماً اقلیتی گروپوں کے بچے پڑھتے تھے۔ ان میں سے شاید ہی کسی کو کالج تک پہنچنے کی توقع تھی۔ اس لیے وہ محنت پر مائل نہ تھے۔ یوں وہ اپنے بارے میں اس پیش گوئی کی خود ہی تکمیل کر رہے تھے کہ سکول میں انکی کارکردگی اچھی نہیں ہو سکتی۔

لینگ صاحب کی پیشکش اور بچوں کے گروپ پر اس کی مسلسل توجہ نے البتہ کایا ہی پلٹ دی۔ جس گروپ کو لینگ نے پیشکش کی تھی، اس میں تقریباً ساٹھ طالبِ علم شامل تھے۔ ان میں سے اکثر نے ہائی سکول کی تعلیم مکمل کی اور کالج میں داخلہ بھی لیا۔ یہ بات اس لیے خاص طور پر تعجب انگیز تھی کہ قبل ازیں اس سکول کے شاید ہی کسی طالبِ علم نے کالج کا منہ دیکھا تھا۔

لینگ صاحب کے عمل نے ''اپنی تکمیل کرنے والی پیش گوئی'' کا چکر توڑ دیا اور بچوں کا مستقبل بدل ڈالا۔

امتیازی سلوک

انسانی حقوق عالمگیر مسئلہ بن گئے ہیں۔ ہر جگہ کے افتادگان خاک نہ صرف سیاسی جبر وتشدد بلکہ دوسرے گروپوں کے تعصّب پر مبنی امتیازی سلوک سے نجات حاصل

کرنے کے لیے بھی جدوجہد کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک بڑا انقلاب جنوبی افریقہ میں رونما ہوا ہے جہاں طویل جدوجہد کے بعد کالے باشندے گوری اقلیت اور اس کی امتیازی پالیسیوں سے آزاد ہو گئے ہیں۔ جنوبی افریقہ میں اب قانونی اور آئینی طور پر تمام شہریوں کو مساوی حقوق حاصل ہیں اور کوئی گروپ کسی دوسرے گروپ کے حقوق سلب نہیں کر سکتا۔

قانونی امتیازی پالیسی کا اب بھی بعض ملکوں میں رواج ہے۔ مثلاً خود ہمارے ملک میں قانونی طور پر اقلیتوں کو بعض حقوق سے محروم رکھا گیا ہے۔

قانونی امتیازی پالیسی کی ایک مثال دوسری جنگِ عظیم کے دوران امریکہ میں بھی دیکھنے میں آئی جب ویسٹ کوسٹ کے علاقے سے کئی جاپانی نژاد امریکی خاندانوں کو زبردستی خصوصی کیمپوں میں بند کر دیا گیا تھا۔ امریکی حکومت کو ڈر تھا کہ یہ لوگ جاپان کے لیے جاسوسی کریں گے۔ یہ لوگ امریکی شہری تھے اور امریکی آئین ان کے ساتھ اس قسم کے سلوک کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ اس زمانے میں امریکہ جاپان کے علاوہ اٹلی اور جرمنی کے ساتھ بھی برسرِپیکار تھا۔ تاہم ان دونوں یورپی ملکوں سے آ کر امریکہ میں آباد ہونے والے شہریوں کو اس طرح پابند نہ کیا گیا تھا۔ اس سے جاپانیوں کے خلاف امریکیوں کے گہرے تعصّب کی نشاندہی ہوتی ہے۔ اطالویوں اور جرمنوں کے ساتھ نرم سلوک کی وجہ غالباً یہ تھی کہ شکل و شباہت میں وہ عموماً امریکیوں جیسے ہی ہوتے ہیں۔ ان کے برعکس جاپانیوں سے امریکی دیکھنے میں بہت مختلف ہوتے ہیں۔ جنگ کے زمانے میں یوں تو جرمنوں اور اطالویوں کے ساتھ بھی امتیازی سلوک کیا جاتا تھا لیکن اس میں وہ شدت نہ تھی جو جاپانیوں کے معاملے میں روا رکھی گئی تھی۔ اصل میں بات یہ ہے کہ جو لوگ دیکھنے میں ہم جیسے دکھائی دیتے ہوں ان کے ساتھ ہم گہرا تعلق محسوس کرتے ہیں، جبکہ مختلف نظر آنے والوں کو ہم غیر اور اجنبی سمجھتے ہیں۔

امریکہ میں کالوں کے خلاف تعصّب کے خاتمے میں ایک بڑی دشواری یہ ہے کہ ہر نئی نسل رنگ و نسل کے اختلاف کو فوراً ہی محسوس کر لیتی ہے۔ سفید فام غیر ملکیوں کا معاملہ البتہ مختلف ہے۔ ان کی دوسری تیسری نسل کا رہن سہن اور بول چال دوسرے سفید فام امریکیوں کے انداز میں ڈھل جاتی ہے اور بظاہر کوئی فرق نہیں رہتا۔ ان کو ملازمتیں مل

جاتی ہیں اور جہاں چاہیں وہ رہ سکتے ہیں۔ کالوں کے ساتھ بھی یہ معاملہ نہیں ہے' اگرچہ وہ صدیوں سے امریکہ میں آباد ہیں لیکن ان کا رنگ ہی کئی ملازمتوں کے دروازے ان پر بند کر دیتا ہے۔ طویل غلامی کا ورثہ ہنوز باقی ہے اور ان کے خلاف تعصّبات بہت گہرے ہیں۔

دوسری جنگِ عظیم کے دوران ہٹلر کے جرمنی میں تعصّبات اور ان سے پیدا ہونے والا امتیازی سلوک اپنی ناگفتہ بہ انتہا کو پہنچ گیا تھا۔ ہٹلر نے تعصّب کی بدی کو عروج دیا۔ اس نے ''آریائی'' نسل کے افسانے کو ہوا دی' جس سے وہ اپنا رشتہ جوڑتا تھا۔ اس کے نزدیک یہودی اور جپسی اس قدر کمتر نسلیں تھیں کہ دنیا کو ان کے ''ناپاک'' وجود سے پاک کر دینا ہی بہتر تھا۔

جرمن یہودیوں کو دوسرے جرمنوں سے آسانی کے ساتھ شناخت نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا ہٹلر نے یہودیوں کو بازو پر زرد پٹیاں باندھنے کا حکم دے رکھا تھا۔ اس طرح وہ صاف پہنچانے جاتے تھے۔ ان کی توہین کرنا' ان پر حملہ کرنا آسان ہو گیا تھا۔ اس بات کا خیال نہ کیا جاتا تھا کہ کوئی شخص یہودی مذہب کے اصولوں پر عمل کرتا ہے یا نہیں۔ بس یہی کافی سمجھا جاتا تھا کہ اس کے والدین یہودی تھے اور وہ یہودی النسل ہے۔ یہاں تک کہ اگر کسی کے ماں باپ میں سے کوئی ایک یہودی ہوتا تو بھی اس کی تذلیل کرنے اور اس پر تشدد کرنے کا جواز مل جاتا تھا۔

اس نسلی تعصّب کی بنا پر نازی جرمنی میں یہودیوں کی جو قتل و غارت ہوئی' اس کی مثال نہیں ملتی۔ بڑی تعداد میں یہودی بچوں' عورتوں اور مردوں کے مرنے کے لیے بڑے بڑے گیس چیمبرز میں ڈال دیا جاتا تھا۔ بوچڑ خانوں کی طرح ان گیس چیمبرز میں بھی قتل کے لیے لائے جانے والے انسانوں کے بال کاٹ لیے جاتے تھے تاکہ انہیں صنعتوں میں استعمال کیا جا سکے۔ دانتوں سے سونا الگ کر لیا جاتا تھا۔ جوتے اور عینکیں دوبارہ استعمال کے لیے لے لی جاتی تھیں اور پھر جسموں کو نذرِ آتش کر دیا جاتا تھا تاکہ فضلے کو ٹھکانے لگانے کی مصیبت سے بچا جا سکے۔ یہ یہود سوزی اس گہرے تعصّب کے بغیر ممکن نہ تھی کہ تمام یہودی بد ہیں اور دنیا کو ان کے گندے وجود سے پاک کر دینا چاہیے۔

قتل عام کا نشانہ صرف یہودی ہی نہیں بنتے تھے' بلکہ بہت سے یورپ ملکوں میں

لاکھوں شہری بھی ہلاک ہوئے تھے۔ نازی آمریت کی مخالفت کرنے والوں کو خاص طور پر نشانہ بنایا جاتا تھا۔ یہودیوں کے معاملے میں البتہ یہ بات تھی کہ نازی ہر یہودی کے خلاف تھے چاہے وہ سیاسی مخالف ہو یا نہ ہو۔ یہ اصل میں نسل کشی کی مہم تھی۔ وہ اس لیے ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں قتل نہیں کیے جا رہے تھے کہ انہوں نے کوئی جرم کیا تھا' بلکہ صرف اس لیے کہ وہ یہودی تھے۔

تاریخ میں نسل کشی کی کئی مثالیں ملتی ہیں' لیکن جس منصوبہ بندی سے نازیوں نے یہودیوں کو نشانہ بنایا' وہ بالکل بے مثل ہے۔

اس قسم کی قتل و غارت کی پالیسیوں کی بنیاد صرف نسلی یا مذہبی تعصّبات پر نہیں ہوتی۔ معاشی اور سیاسی تعصّبات بھی اس کا سبب بن سکتے ہیں۔ سیاسی عقائد کی بنا پر لوگوں کی ایذا رسائی کا آغاز عام طور پر اس تعصّب سے ہوتا ہے کہ وہ ایسے ''دشمن'' ہیں جو کسی قسم کے انسانی حقوق کے قابل نہیں۔ ترقی پذیر ملکوں میں اقتدار پسند حکمران اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے اس قسم کے اقدامات کرتے رہتے ہیں۔ سیاسی مخالفوں کے اغوا اور قتل کے واقعات بھی ان ملکوں میں غیر معمولی نہیں ہیں۔ کئی ملکوں میں سیاسی مخالف پولیس یا فوج کے تشدد کے اڈوں میں ہلاک کر دیئے جاتے ہیں۔

خیر' اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ سیاسی اور معاشی تعصّبات کی بنیاد پر صرف ترقی پذیر ملکوں میں ہی غیر انسانی سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ باقی دنیا کا بھی کم و بیش یہی حال ہے۔ چنانچہ ہم امریکہ کی مثال دے سکتے ہیں۔ سولہویں صدی میں جب سفید فام لوگوں نے امریکہ میں مقامی باشندوں یعنی انڈ نیز کا قتل عام شروع کیا تھا تو اس زمانے میں تقریباً دس کروڑ انڈ نیز دونوں امریکی براعظموں (شمالی امریکہ اور جنوبی امریکہ) میں آباد تھے۔ اب ان کی بہت ہی مختصر تعداد باقی رہ گئی ہے۔ اس قدر بڑے پیمانے پر قتلِ عام اس ایمان کے بغیر ممکن نہ تھا کہ یہ مقامی باشندے وحشی ہیں اور کوئی انسانی قدر و قیمت نہیں رکھتے ہیں۔

یہی نہیں' امریکہ میں صدیوں تک غلامی کا رواج بھی رہا ہے۔ یہ بدترین قسم کی غلامی تھی جس میں سیاہ فام انسانوں کو ہر قسم کے حقوق سے محروم رکھا گیا تھا۔

ہمارے زمانے میں حالات بدلتے نظر آتے ہیں۔ انسانی حقوق کو دنیا بھر میں

تسلیم کیا جا چکا ہے۔ لیکن ابھی تک یہ اقرار زیادہ تر محض زبانی ہے۔ تاہم ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ الفاظ بے معنی نہیں ہوا کرتے۔ وہ حقیقی تبدیلی کی راہ ہموار کرتے ہیں۔ انسانی حقوق کے زبانی اقرار سے عملی اعتراف تک تبدیلی کا عمل جاری ہے۔ چنانچہ ہم ایسے مستقبل کی امید کر سکتے ہیں جس میں شدید قسم کے کاری تعصبات کی شدت کم ہو جائے گی بلکہ ممکن ہے وہ ختم ہو جائیں۔

جدید زندگی میں آرا کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔ چنانچہ جدید دنیا میں ایک نیا پیشہ ظہور پذیر ہوا ہے۔ یہ رائے عامہ کی تشکیل کا شعبہ ہے۔ اس کے ماہرین بڑے بڑے معاوضے وصول کر کے معاوضہ دینے والوں کے مفاد یا تقاضوں کے مطابق رائے عامہ پر اثر انداز ہوتے ہیں اور اس کو تبدیل کرتے ہیں۔ اگلے باب میں ہم ان طریقوں پر غور کریں گے جو رائے عامہ پر اثر انداز ہونے کے لیے بروئے کار لائے جاتے ہیں۔ عام طور پر یہ طریقے عوام کو گمراہ کرنے یا ان کی توجہ بنیادی مسائل سے ہٹانے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔

رائے پر کیسے اثر انداز ہوا جاتا ہے؟

یہ ۱۹۴۸ء کا قصہ ہے۔ فلوریڈا سے تعلق رکھنے والے امریکن سینٹ کے رکن، سینیٹر کلاڈ پیر دوبارہ منتخب ہونے کے لیے انتخابی مہم چلا رہے تھے۔ انتخابات سر پر آ گئے تو پوری ریاست میں پیر کے خلاف ایک اشتہار بانٹا گیا۔ اس پر کسی کے دستخط نہ تھے۔ اشتہار کی عبارت مندرجہ ذیل تھی:

کیا آپ جانتے ہیں کہ کلاڈ پیر پورے واشنگٹن میں بے شرم بیروں بین کے طور پر مشہور ہے؟ صرف یہی نہیں بلکہ باوثوق ذرائع کے مطابق یہ شخص اپنی سالی کے ساتھ اقربا پروری کرتا رہا ہے۔ اس کی ایک بہن بھی ہے جو بدکار شہر نیویارک میں فن کا مظاہرہ کرتی ہے۔ بدترین بات یہ طے شدہ امر ہے کہ شادی سے پہلے پیر صاحب عادی کنوارے ہوا کرتے تھے۔

لفظی طور پر یہ سارے بیانات غلط نہ تھے۔ تاہم ''پیروں بین'' (یعنی ایسا شخص جو دنیاوی معاملات میں بھرپور حصہ لیتا ہے) ''اقربا پروری'' ''فن کار'' اور ''کنوارے'' کے الفاظ ایک ایسے سیاق و سباق میں استعمال کئے گئے تھے کہ غیر تعلیم یافتہ لوگوں کے نزدیک وہ قابلِ اعتراض ہو سکتے تھے۔

ظاہر ہے کہ پیر صاحب کی انتخابی مہم کو نقصان پہنچانے کی غرض سے کسی چالاک شخص نے جان بوجھ کر اس انداز میں یہ الفاظ استعمال کئے تھے۔ وہ لوگوں کو یہ تاثر دینا چاہتا تھا کہ سینیٹر پیر بہت برا ادمی ہے۔ وہ چالاک شخص اس مقصد میں کامیاب بھی ہو گیا۔ چنانچہ جب انتخابی نتائج سامنے آئے تو معلوم ہوا کہ پیر صاحب اپنے حریف جارج سماتھرز

سے ہار گئے ہیں۔ سماتھرز نے مذکورہ اشتہار سے اپنے کسی قسم کے تعلق کی تردید کی اور اسے مکروہ چالبازی قرار دیا۔ لیکن ظاہر ہے کہ پیر صاحب کو پہنچنے والے نقصان کا مداوا نہ ہو سکتا تھا۔

یہ رائے عامہ پر اثر انداز کی چال کی محض ایک مثال ہے۔ سادہ لوح لوگوں کے ساتھ اس قسم کی چالبازیاں ماضی میں ہوتی رہی ہیں اور اب بھی ہو رہی ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ہمارے عہد میں ذرائع ابلاغ...... خصوصاً ٹیلی وژن اور اس کے ساتھ ساتھ ریڈیو' اخبارات اور جرائد بھی...... بہت طاقتور ہیں۔ ان کے سب اطلاعات کی وسیع تر اشاعت ممکن ہوگئی اور ساتھ ہی غلط اور گمراہ کن اطلاعات کے خطرات بھی بڑھ گئے ہیں۔

عوامی عہدوں کے چند امیدواروں نے اس حقیقت کا ڈرامائی انداز میں حال ہی میں ذکر کیا ہے۔ سٹڈی فار دی امریکن الیکٹوریٹ کی کمیٹی کے ڈائریکٹر کرٹس گینز کا کہنا ہے کہ:

منفی' واہیات اور بازاری قسم کی اشتہار بازی کوئی نئی چیز نہیں۔ پہلے بھی اس قسم کی باتیں ہوتی رہی ہیں۔ لہذا فرق یہ نہیں کہ پہلے ایسی باتیں نہ ہوتی تھیں اور اب شروع ہوگئی ہیں۔ بلکہ فرق یہ ہے کہ پہلے ایسی اشتہار بازی محدود تھی۔ کسی کسی انتخابی مہم میں اس سے کام لیا جاتا تھا۔ لیکن اب تو کوئی انتخابی مہم اس کے بغیر چلائی ہی نہیں جاتی۔

امریکہ میں صورت حال یہ ہے کہ سالانہ انتخابی مہم کے عروج پر ٹیلی وژن پر سیاسی اشتہارات کا سیلاب آ جاتا ہے اور روزانہ لگ بھگ دو ہزار اشتہار دکھائے جاتے ہیں۔ ہر اشتہار کا دورانیہ پندرہ سے تیس سیکنڈ تک کا ہوتا ہے۔ اس اشتہار بازی کا عموماً مقصد یہ نہیں ہوتا کہ الیکشن کے اہم مسائل کے بارے میں لوگوں کو معلومات مہیا کی جائیں۔ بلکہ مقصد یہ رہ گیا ہے کہ مخالف امیدواروں میں خامیاں تلاش کی جائیں اور جہاں خامیاں نہیں ملتیں وہاں وہ خود گھڑی جاتی ہیں۔ اس قسم کے مقابلوں میں اکثر اوقات وہ امیدوار کامیاب رہتا ہے جس کے پاس عوامی رابطے کے لیے گھٹیا ترین اور شرارتی ٹیم موجود ہو اور جو اشتہار بازی کے لیے اپنے حریفوں سے زیادہ پیسے خرچ کر سکتا ہو۔

یہ صورت حال صرف امریکہ تک محدود نہیں۔ اکثر ملکوں میں یہی کیفیت ہے۔ خود پاکستان کے حالات بھی زیادہ مختلف نہیں۔ یہاں ٹیلی وژن پر سرکاری قبضہ ہے۔ اس

لیے مخالف امیدواروں کے اشتہار نہیں دکھائے جاتے اور خود برسراقتدار گروہ کے امیدواروں کے لیے مختلف حیلوں بہانوں سے رائے دہندگان کی توجہ حاصل کی جاتی ہے۔

منظّم ''تعلقات عامہ''

ہماری پیچیدہ دنیا کے بارے میں معلومات کا کوئی وسیلہ بھی مکمل طور پر معروضی نہیں ...... یعنی کوئی ایسا وسیلہ نہیں جو شخصی احساسات' اقدار' رویوں' رجحانات یا تعصّبات سے یکسر پاک ہو۔ جب کوئی مصنف' مقرر یا رپورٹر اس شے کو بیان کرتا ہے جو اس کے نزدیک اہم ہوتی ہے' تو اس کو اطلاعات منتخب کرنا پڑتی ہیں۔ اب معاملہ یہ ہے کہ جو بات کسی ایک کے لیے اہم یا درست ہوسکتی ہے' وہ کسی دوسرے کے نزدیک غیر اہم یا غلط ہوسکتی ہے۔ اس کا دارومدار لکھنے یا بولنے والے کی اقدار اور علم پر ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں بہت سے لوگ جان بوجھ کر واقعات کو اس طریقے سے پیش کرتے ہیں جس کا مقصد سننے یا پڑھنے والے کو متاثر کرنا ہوتا ہے۔

ہمارے زمانے میں جان بوجھ کر آراء کو تبدیل کرنا بہت بڑا کاروبار بن گیا ہے۔ تعلقات عامہ کے ماہرین ہر جگہ دستیاب ہیں جن کا کام ہی اشتہار بازی کی مہم چلانا' لوگوں کی رائے پر اثر انداز ہونا اور ان کے رویے بدلنا ہے۔ ان میں سے اکثر ماہرین معاوضے پر اپنی خدمات فروخت کرنے پر ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ کوئی شخص یا ادارہ بھی معاوضہ ادا کر کے ان کی خدمات کرسکتا ہے اور ان کی مہارت کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کرسکتا ہے۔

بعض لوگ شہرت کے طلب گار ہوتے ہیں۔ وہ ٹیلی وژن تک رسائی حاصل کرنے نیز اخبارات و جرائد میں اپنے حق میں مضامین چھپوانے کے لیے تعلقات عامہ کی کمپنیوں کی خدمات حاصل کرتے ہیں۔ اس طرح شہرت حاصل کر کے بعض لوگوں کی انا کی تسکین ہوتی ہے۔ تاہم زیادہ ٹیلنٹ رکھنے والے منکسر المزاج لوگ اس قسم کے طریقے پسند نہیں کرتے۔

سیاسی عہدوں کے امیدوار اشتہار بازی کی مہم چلانے کے لیے عموماً ماہرین کی خدمات حاصل کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کے لیے ''پریس کانفرنسوں'' کا اہتمام کیا جاتا ہے

جن کے ذریعے ٹیلی وژن اور اخبارات کے رپورٹروں کو ''خبریں'' مہیا کی جاتی ہیں۔ اس قسم کی بعض خبریں واقعی مستند ہوتی ہیں۔ لیکن بعض مبالغہ آمیز اور جعلی بھی ہوتی ہیں، جن کا مقصد متعلقہ امیدوار کے حق میں رائے عامہ کو ہموار کرنا ہوتا ہے۔

تعلقات عامہ اور اشتہار بازی کے ادارے مفید اطلاعات کے علاوہ پراپیگنڈہ کا وسیلہ بھی ثابت ہوتے ہیں۔ پراپیگنڈہ کا مطلب خصوصی مفادات حاصل کے لئے اطلاعات اور خیالات کی منظم اشاعت ہے۔ اگر ہم اپنی فکری آزادی کو قائم رکھنا چاہتے ہیں تو پھر ہمیں ان طریقوں سے باخبر رہنا چاہیے جن کے ذریعے تعلقات عامہ اور اشتہار بازی کے ادارے آراء پر اثر انداز ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔

حقائق کی جادوگری

حقائق کی جادوگری کیا ہے؟ اس سے مراد یہ ہے کہ گفتگو، تحریر و تقریر اور بحث و مباحثہ میں صرف وہی حقائق پیش کئے جائیں جو آپ کے نقطہ نظر کی تائید و حمایت کرتے ہیں اور وہ حقائق چھپا دیئے جائیں یا کچل دیئے جائیں جو مخالف نقطہ نظر کی تائید کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر آپ جمبو کاریں فروخت کرنے والے ادارے کے پاس جاتے ہیں۔ سیلز مین آپ کو خوش آمدید کہتا ہے اور جمبو کار کی تعریفیں شروع کر دیتا ہے۔ وہ اچھے رنگ و روغن کی باتیں کرتا ہے۔ آپ کو بتاتا ہے کہ یہ کار کم پیٹرول خرچ کرتی ہے۔ لیکن وہ آپ کو ہرگز یہ حقیقت نہیں بتاتا کہ اس کار کے انجن میں دوسری کاروں کے مقابلے میں زیادہ نقص پائے گئے ہیں۔ اگر آپ کسی دوسری کار کا نام لیتے ہیں تو سیلز مین فوراً ہی اس کی خامیاں بیان کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اس طرح وہ اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے (یعنی آپ کو اپنی کار فروخت کرنے کے لیے) حقائق کی جادوگری سے کام لیتا ہے۔ وہ صرف ایسے حقائق بیان کرتا ہے جن سے آپ کو جمبو کار خریدنے پر مائل کیا جا سکے۔

اس قسم کی جادوگری کی ایک مثال ۱۹۸۶ء میں منظرِ عام پر آئی تھی۔ جب امریکہ کے فیڈرل ٹریڈ کمیشن نے آر۔ جے۔ رینولڈز ٹوبیکو کمپنی پر الزام لگایا تھا کہ یہ کمپنی ''ناجائز یا فریب کار'' اشتہار بازی کی مہم چلا رہی ہے۔ اس کمپنی کے اشتہاروں میں بارہ ہزار مردوں کی صحت سے متعلق ایک مطالعاتی رپورٹ میں پیش کئے جانے والے حقائق کو

مسخ کر کے پیش کیا جا رہا تھا۔ ان اشتہاروں میں یہ دعویٰ کیا جا رہا تھا کہ اس مطالعاتی رپورٹ میں سگریٹ نوشی اور امراض قلب میں کسی تعلق کی نشاندہی نہیں کی گئی اور یہ کہ یہ تعلق سائنٹی حقیقت نہیں بلکہ محض لوگوں کی رائے ہے۔

اس ٹوبیکو کمپنی نے اصل میں حقائق کی جادوگری سے کام لیا تھا۔ وہ مطالعاتی رپورٹ کے محض پہلے حصے کا حوالہ دیتی تھی۔ (جو اس کے نتائج کے تائید نہیں کرتا تھا)۔ کمپنی نے دوسرے حصے کو نظرانداز کر دیا تھا جس میں یہ کہا گیا تھا کہ جب لوگ سگریٹ نوشی ترک کر دیں تو ہارٹ اٹیک کا خطرہ آدھا رہ جاتا ہے۔

سیاسی اور معاشی امور پر بحث ومباحثہ کے دوران بھی عموماً حقائق کی جادوگری کے کرتب دکھائے جاتے ہیں۔ ایک رائے ساز' موجودہ انتظامیہ کی ساکھ تباہ کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ جب کاروبار کو نقصان پہنچتا ہے تو حقائق کا چرچا کیا جاتا ہے۔ دوسری طرف جب کاروبار کی حالت بہتر ہوتی ہے تو وہ چپ رہتا ہے۔ ایک اور رائے ساز بھی ہے اور وہ موجود انتظامیہ کا حامی ہے۔ اس کا طرزعمل پہلے رائے ساز کے برعکس ہے۔ وہ صرف ان حقائق کی نشاندہی کرتا ہے جو کاروبار کی بہتر حالت کو ظاہر کرتے ہیں۔ خراب حالت کی نشاندہی کرنے والے حقائق پر وہ خاموش رہتا ہے۔

ہم یہ کہیں گے کہ ان دونوں رائے سازوں کا طرزِعمل غلط ہے۔ گراف صاف طور پر یہ ظاہر کرتا ہے کہ ایک سال سے زیادہ عرصے تک کاروبار کی کیفیت کم وبیش یکساں رہی تھی۔ صرف چند اتار چڑھاؤ آئے تھے۔ دونوں آرا ساز چند درست حقائق کو رپورٹ کر رہے تھے۔ لیکن مخالف حقائق کو نظرانداز کر کے وہ دونوں حقیقی صورتِ حال کو مسخ کر رہے تھے۔

لاشعوری جادوگری

اگرچہ حقائق کی جادوگری عام طور پر شعوری سطح پر ہوتی ہے اور اس عمل میں مصروف فرد' جان بوجھ کر بعض حقائق کو چھپاتا ہے۔ تاہم یہ عمل لاشعوری بھی ہوسکتا ہے۔ معاملہ یوں ہے کہ ہم میں سے ہر شخص کے بعض بنیادی عقائد ہوتے ہیں اور اقدار بھی' جو جائز و ناجائز اور اچھے برے کے بارے میں اس کے انفرادی فیصلوں کی رہنمائی کرتی

ہیں۔ جب ہم ان امور کو زیرِ بحث لاتے ہیں جن سے ہماری اقدار منسلک ہوں تو اس میں جذباتی عنصر شامل ہو جاتا ہے۔ ہم عموماً ایسے حقائق کو قبول کرنے سے گریز کرتے ہیں جو ہمارے بنیادی عقیدوں کو شک و شبے میں ڈالنے والے ہوں۔ اس کے برخلاف ان عقیدوں کی تائید کرنے والے حقائق کو ہم بہت اچھا بولتے ہیں۔

یہی معاملہ ٹیلی وژن اور اخباروں کے رپورٹروں کا بھی ہے اسلیے وہ لاشعوری جادوگری سے بچ نہیں سکتے۔ مانا کہ بہت سے رپورٹر اس اثر سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں اور وہ تربیت یافتہ بھی ہوتے ہیں۔ لیکن جب وہ کچھ لکھنے کا یا کسی شخصیت کا انٹرویو لینے کا فیصلہ کرتے ہیں تو اس لاشعوری عامل کو اپنا کردار ادا کرنے کا کچھ نہ کچھ موقع مل ہی جاتا ہے۔

آیئے ہم اس کا تجربہ کریں۔ مختلف پسِ منظر رکھنے والے چند افراد کو اپنے ہاں مدعو کیجئے۔ ان کو ٹیلی وژن پر کسی متنازعہ موضوع پر ہونے والا مباحثہ دکھایئے اور بعد میں ان سے کہیئے کہ وہ اس موضوع پر بحث کریں یا اس بارے میں ایک رپورٹ لکھیں۔ آپ دیکھیں گے کہ ان کی باتوں یا رپورٹوں میں بہت سے اختلافات پائے جائیں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عام طور پر لوگ ان حقائق پر زیادہ توجہ دیتے ہیں جو ان کے نقطہ نظر یا رویوں کی تائید کرتے ہوں۔

اس سارے معاملے میں ''اپنی تکمیل کرنے والی پیش گوئی'' جیسا عامل بھی موجود ہے۔ کیونکہ لوگ وہی کچھ پڑھنا یا دیکھنا پسند کرتے ہیں جو ان کے نقطہ نظر کی تائید کرتا ہو۔ مزید برآں وہ اطلاعات کے صرف ان وسائل پر بھروسہ کرتے ہیں جن سے وہ متفق ہوں۔ مخالف اطلاعات کو وہ ''پراپیگنڈہ'' سمجھتے ہیں۔ ان صورتوں میں ان کی آرا مزید سخت ہو جاتی ہیں اور ان کو بدلنا زیادہ دشوار ہو جاتا ہے' کیونکہ ان کا خیال یہ بن جاتا ہے کہ ان کے نقطہ نظر کی تائید کرنے والے حقائق بے شمار ہیں۔ والٹر لپ مین نے اپنی کتاب ''رائے عامہ'' میں اس سلسلے میں لکھا ہے کہ:

''چونکہ میرے اخلاقی نظام کی اساس حقائق کی اس تعبیر پر ہے جس کو میں نے قبول کر رکھا ہے' اس لیے جو کوئی میرے اخلاقی فیصلوں یا حقائق کی میری تعبیر سے اختلاف کرتا ہے میں اس کو بے راہرو' اجنبی یا خطرناک سمجھنے لگتا ہوں...... ہم یہ جانتے ہی نہیں کہ

اس کے پیشِ نظر حقائق کا دوسرا مختلف مجموعہ ہے......لیکن جب ہم یہ اقرار کر لیتے ہیں کہ ہماری رائے مکمل حقیقت کو پیش نہیں کرتی ہے، بلکہ اس جزوی تجربے پر مبنی ہے جو ہمارا تعصّب سے پیدا ہوتا ہے، تو پھر ہم خلوصِ دل سے اپنے مخالفوں کی رائے کو برداشت کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں''۔

جادوگری کے اثر کو کیسے کم سے کم کیا جا سکتا ہے؟

حقائق کی جادوگری کے منفی اثرات کو کم سے کم کرنے کا ایک موثر طریقہ بحث و مباحثہ اور تبادلہ خیال ہے۔ کیونکہ اس سے مختلف نقطہ ہائے نظر سامنے آتے ہیں اور ہر فریق ایسے حقائق پیش کرتا ہے جن کو دوسرا فریق دبانا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مباحثے سیاسی عہدوں کے لیے ہونے والے انتخابات کا باقاعدہ حصہ بن چکے ہیں۔

عدالتوں میں بھی یہی کچھ ہوتا ہے۔ مقدمے کے فریقین کے اپنے اپنے وکیل ہوتے ہیں اور ہر وکیل ایسے حقائق پیش کرتا ہے جو دوسرے کی مخالفت پر مبنی ہوتے ہیں۔ یوں ہر قسم کے حقائق سامنے آنے کا امکان پیدا ہو جاتا ہے۔ مزید برآں ہر وکیل کو فریق مخالف کے گواہوں پر جرح کرنے کا موقع دیا جاتا ہے۔ اس طرح دوسرے چھپے ہوئے حقائق بھی سامنے لانے میں مدد ملتی ہے۔

تحریری یا چھپی ہوئی اطلاعات میں بھی حقائق کی جادوگری کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ اس لیے حقائق تک رسائی حاصل کرنے کے لیے مختلف نقطہ ہائے نظر کے حامل اخبارات کا مطالعہ کرنا ضروری ہوتا ہے۔ بدقسمتی سے یہ بات بھی ممکن ہے کہ بعض اہم مسائل پر اطلاعات کے اہم وسائل ایک جیسی شعبدہ بازی کا مظاہرہ کریں۔ اس قسم کی صورتِ حال میں لوگوں کے لیے پیچیدہ مسائل کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنا بہت دشوار ہو جاتا ہے۔

مشترکہ شعبدہ بازی کی ایک مثال ۱۹۶۵ء سے پہلے ماحولیاتی مسائل کے ساتھ ہونے والے برتاؤ میں تلاش کی جا سکتی ہے۔ اگرچہ انسانی سرگرمیوں کے باعث ماحول کو ایک طویل عرصے سے نقصان پہنچ رہا تھا لیکن اس نقصان کی نشاندہی کرنے والے حقائق پر بہت کم توجہ دی گئی تھی۔ پھر چند سائنس دانوں اور ماحولیاتی گروپوں نے اس صورتِ حال کو بدلنے کا عزم کیا اور لوگوں کو اس سنگین مسئلے سے آگاہ کرنے کی کوششیں شروع کیں۔ تاہم

۱۹۶۵ء سے پہلے اخباروں، ریڈیو اور ٹیلی وژن کے پالیسی سازوں نے اس مسئلے کو عموماً نظرانداز کیے رکھا۔ اصل میں ان کا خیال یہ تھا کہ ماحولیاتی مسائل عام لوگوں کے لیے اہم نہیں ہیں۔ پھر جب لاس اینجلز اور نیویارک جیسے شہروں میں بڑی تعداد میں لوگ آلودہ ہوا سے متاثر ہونے لگے تو پھر ان وسائل کی اہمیت کو تسلیم کیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ان مسائل پر بحث و مباحثہ میں شدت پیدا ہوئی اور ایسے حقائق بھی منظرِ عام پر آنے لگے جو پہلے پوشیدہ تھے۔ نتیجہ یہ تھا کہ اب دنیا بھر میں ہر جگہ پڑھے لکھے لوگ اس امر سے باخبر ہیں کہ سنگین عالمی ماحولیاتی مسائل پیدا ہو چکے ہیں۔

خبروں کے ذرائع روزمرہ کے مسائل پیش کرنے کے بارے میں ایک دوسرے سے بہت مختلف پالیسیوں پر عمل کرتے ہیں۔ ان میں سے بعض معروضی اور غیر جانبدار رپورٹنگ پر خاص توجہ دیتے ہیں۔ وہ اپنے رپورٹروں کی غیر جانب داری کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ اور مخالف نقطہ ہائے نظر کو خطوط اور کالموں کی صورت میں شائع بھی کرتے ہیں۔ تاہم بعض مالکوں اور پبلشروں کے اپنے مضبوط عقائد ہوتے ہیں اور وہ صرف ان خبروں اور آراء کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں جن سے ان کے اپنے نقطہ نظر کی تائید ہوتی ہو۔ یہاں تک کہ وہ مخالفانہ خبروں کو مکمل طور پر خارج کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔

حقائق کی شعبدہ بازی کی ایک اور صورت بھی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ کوئی اخبار یا رسالہ اپنی فروخت بڑھانے کے لیے ''قارئین کو وہ کچھ دیتا ہے جو کچھ وہ چاہتے ہیں''۔ عوامی معاملات پر اس قسم کی پالیسی سے ایک بڑی خامی پیدا ہوتی ہے۔ کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس اخبار یا رسالے میں صرف وہی حقائق اور واقعات پیش کیے جاتے ہیں جن میں قارئین کو دلچسپی ہو سکتی ہے۔ دوسرے حقائق و واقعات، چاہے وہ عام لوگوں کے لیے بہت اہم ہوں، نظرانداز کر دیئے جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی مدیر یا ناشر کو حقائق و واقعات پر کنٹرول حاصل ہو جاتا ہے اور بالآخر وہ من مانی کرنے لگتا ہے۔

آج کے زمانے میں اخبارات و رسائل شائع کرنے کے لیے بہت زیادہ رقم درکار ہوتی ہے۔ فنی طور پر موثر ریڈیو یا ٹیلی وژن اسٹیشن قائم کرنے کے لیے بھی بہت کر سکتے ہیں۔ گویا ذرائع اطلاعات پر مالداروں کا قبضہ ہو رہا ہے۔ اس طرح بھی حقائق کی جادوگری کے لیے گنجائش نکل آتی ہے۔ کیونکہ مالدار مالک ایسی خبروں اور حقیقتوں بلکہ بعض

اہم عوامی مسائل کو بھی دبانے کی کوشش کرتے ہیں جن کی اشاعت سے ان کے مفادات کو زک پہنچنے کا خدشہ ہو۔

ان خامیوں کے باوجود آزاد پریس' جمہوریت کی بقاء کے لیے لازمی حیثیت رکھتا ہے۔ مزید برآں کئی رکاوٹوں کے باوجود بہت سے ایسے مدیر' ناشر اور صحافی معاشرے میں ہوتے ہیں جو ممکنہ حد تک غیر جانب داری سے اور معروضی انداز میں' خبروں کو پیش کرنا اپنی ذمہ داری سمجھتے ہیں۔ اسی لیے کسی نہ کسی حد تک معروضی اطلاعات قابل حصول رہتی ہیں۔

قارئین اور ناظرین کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ اس قسم کی معروضی اطلاعات تک رسائی کیسے حاصل کریں۔ جب ہم کوئی کالم پڑھتے ہیں یا ٹیلی وژن کا خبرنامہ دیکھتے ہیں' تو کسی طرح جان سکتے ہیں کہ اس میں فراہم کردہ اطلاعات معروضی ہیں؟ اس سلسلے میں کئی رہنما اصولوں سے مدد لی جاسکتی ہے۔ مثلاً ہم یہ دیکھیں کہ آیا اس اخبار میں مختلف نقطہ نظر رکھنے والے کالم نگاروں کی تحریریں شائع ہوتی ہیں؟ کیا اس اخبار میں قارئین کی آراء کی باقاعدہ اشاعت کا اہتمام کیا گیا ہے اور قارئین کو اپنا اپنا نقطہ نظر پیش کرنے کی سہولت حاصل ہے؟ کیا اس میں اخبار کی ادارتی پالیسی پر نکتہ چینی کرنے والے خطوط شائع کئے جاتے ہیں؟ اس قسم کی گوناگوں اطلاعات کی موجودگی اس امر کی خوش گوار اشارہ ہے کہ مدیر اور ناشر غیر جانب دار ہونے کی اپنی ذمے داری کو سنجیدگی سے نبھار ہے ہیں۔

یہ بھی ہے کہ...... دور دراز مقامات پر رہنے والے بہت سے لوگ ایسے اخبارات یا رسائل ڈاک کے ذریعے منگواتے ہیں جو غیر جانب داری کی شہرت رکھتے ہیں یا جو ایسی اطلاعات مہیا کرتے ہیں جو مقامی وسائل سے حاصل نہیں ہوتیں۔ لاکھوں کروڑوں افراد کو آپ مختلف اسٹیشنوں کے حوالے سے کیبل ٹیلی وژن کی سہولت حاصل ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جو اطلاعات کے اضافی ذرائع کے متلاشی رہتے ہیں۔ کئی ریڈیو اسٹیشن اب سامعین کی آراء پر مبنی پروگرام پیش کرتے ہیں۔ اس قسم کے پروگرام' بشرطیکہ وہ غیر جانب داری سے پیش کیے جائیں' غیر معقول نقطہ ہائے نظر کی اشاعت کا ذریعے بنتے ہیں۔

سرخیوں کی شعبدہ بازی

اخباروں میں ''سرخیاں لکھنے والے'' بھی ہوتے ہیں۔ ان کا کام خبروں کی دلچسپ اور پرکشش سرخیاں تیار کرنا ہوتا ہے۔ اس کام کے لیے بہت سی مہارت درکار ہوتی ہے' کیونکہ سرخی اگرچہ مختصر ہوتی ہے لیکن اسے خاصی حد تک خبر کے متن کا پتہ دینا چاہیے۔ علاوہ ازیں سرخی کو دلچسپ بھی ہونا چاہیے تاکہ وہ قاری کی توجہ جذب کر سکے اور اسے پوری خبر پڑھنے پر مائل کر سکے۔ اس سلسلے میں ایک اور بات بھی اہم ہے جس سے اکثر قارئین بے خبر ہوتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ سرخی کا کالم میں دی گئی مخصوص جگہ میں پورا آنا چاہیے۔ اس شرط کو پارا کرنا لازمی ہے۔ لہٰذا سرخیوں میں کم جگہ گھیرنے والے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں۔ آپ سرخیاں لکھنے میں پیش آنے والی ان ساری مشکلات کا اندازہ کرنا چاہیں تو کسی سے کہئے کہ وہ آپ کو کسی خبر کا' سرخی کے بغیر' متن کاٹ کر دے۔ پھر آپ اس کے لیے سرخی بنانے کی کوشش کیجئے۔

ہمیں نہیں بھولنا چاہیے کہ اکثر لوگ اخبارات پر محض سرسری نگاہ ڈالتے ہیں۔ وہ سرخی پڑھتے ہیں اور فوراً ہی فیصلہ کر لیتے ہیں کہ آیا انہیں متن پڑھنا چاہیے یا نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ اکثر لوگ اپنی خبریں صرف سرخیوں سے حاصل کرتے ہیں۔ اس لیے کسی اخبار میں سرخیوں کا درست اور معروضی ہونا بہت ضروری ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے اخبارات میں اور خاص طور پر پاکستان کے اردو اخبارات میں اس بات کو پیشِ نظر نہیں رکھا جاتا۔ ان اخباروں میں ساری توجہ ''چیختی چلاتی'' سرخیاں بنانے پر دی جاتی ہے۔ بسا اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ سرخی اور متن کے درمیان کوئی منطقی تعلق باقی نہیں رہتا۔ اس صورت میں سرخی فریب کاری بن جاتی ہے۔

اخبار کا مطالعہ کرتے ہوئے یا ٹیلی وژن دیکھتے ہوئے اس امر کا دھیان رکھا کیجئے کہ آیا وہ متصادم نقطہ ہائے نظر کو پیش کرتے ہیں یا نہیں۔ میڈیا عموماً اس امر کا خیال رکھتا ہے' لیکن ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا۔ بعض اخبار و رسائل یک رخی تصویر پیش کرتے ہیں۔ ان کے تبصروں اور تجزیوں میں بھی صرف ایک نقطہ نظر کو سامنے رکھا جاتا ہے۔ درست اور غیر متعصّبانہ اطلاعات حاصل کرنے کی خاطر زیادہ ذرائع سے اطلاعات حاصل کرنے کی

کوشش کیجئے۔

متن کو نظر انداز کرنا

فلمی اشتہاروں میں عام طور پر اس قسم کا حوالے دے دیا جاتا ہے کہ ''ایک بڑے فلمی رسالے نے اس شاندار فلم کی بے پناہ تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ فلمی تاریخ میں اس فلم کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ اس کی موسیقی انوکھی ہے' کہانی نہایت دلچسپ اور ہدایت کار نے زبردست کمال دکھائے ہیں۔ اداکاروں کا تو جواب ہی نہیں''۔

یہ اشتہار کی بات ہے۔ ممکن ہے کہ مذکورہ رسالے نے اس کے بارے میں دراصل یہ لکھا ہو کہ ''یہ ایک اچھی کوشش ہے۔ اس کی موسیقی میں جدت ہے۔ کہانی بھی دلچسپ ہے اور اداکاروں نے اچھا کام کیا ہے۔ تاہم فلم کا مجموعی تاثر خوش گوار نہیں اور اس میں کئی تیکنیکی خامیاں بھی موجود ہیں''۔ ظاہر ہے کہ اشتہار بنانے والے نے اس تبصرے میں سے منفی باتوں کو نکال دیا ہے اور یوں تبصرہ نگار کے توازن کو بگاڑ دیا ہے۔ تاہم اس کو ان باتوں کی پرواہ نہیں۔ وہ تو بس اشتہار بنانا چاہتا ہے جو لوگوں کو متوجہ کر سکے۔

اس قسم کی شعبدہ بازی دوسرے شعبوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر ایک سرکلر ملاحظہ کیجئے جو ''خزانچی کے عہدے کے لیے مارک بارکر کی انتخابی مہم چلانے والی کمیٹی''۔ نے جاری کیا تھا۔

خزانچی کے لیے مارک بارکر کو ووٹ دیجئے

روزنامہ ''بگل'' نے لکھا ہے کہ ''ہم اہم خدمت کے لیے خلوص دل سے معترف ہیں جو جناب مارک بارکر اور ان کی رضا کار ٹیم نے ہمارے علاقے کو صاف ستھرا رکھنے اور اس کو خوبصورت بنانے کے لیے سرانجام دی ہے۔ ہماری خواہش ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس قسم کے اور لوگوں سے نوازے''۔

انتخاب کے دن خزانچی کے عہدے کے لیے

مارک بارکر کو ووٹ دینا نہ بھولئے

یہ ہے وہ سرکلر جو بارکر صاحب کے حامیوں نے جاری کیا تھا۔ اس میں روزنامہ ''بگل'' کے تبصرے کا حوالہ دیا گیا ہے۔ آیئے ہم دیکھیں کہ اس اخبار نے اصل میں لکھا کیا تھا۔ اخبار کا پورا تبصرہ حسبِ ذیل ہے:

''ہم اس اہم خدمت کے لیے خلوصِ دل سے معترف ہیں جو جناب مارک بارکر اور ان کی رضا کار ٹیم نے ہمارے علاقے کو صاف ستھرا رکھنے اور اس کو خوبصورت بنانے کے لیے سرانجام دی ہے۔ ہماری خواہش ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس قسم کے اور لوگوں سے نوازے۔

''تاہم امر واقعہ یہ ہے کہ ہمارے شہر کے خزانچی کے عہدے کے لیے خصوصی علم اور مہارتوں کی ضرورت ہے جن سے مارک بارکر صاحب محروم ہیں۔ لہٰذا ہم اپنے قارئین سے ایڈمن صاحب کو ووٹ دینے کی درخواست کرتے ہیں۔ وہ ایک ماہر اکاؤنٹنٹ ہیں اور اس عہدے کے لیے ہر لحاظ سے موزوں ہیں''۔

اس مثال میں یہ سبق پوشیدہ ہے کہ حوالہ جات کے معاملے میں ہم کو محتاط رہنا چاہیے۔ خاص طور پر انتخابی مہموں اور اور دوسرے جذباتی امور میں زیادہ ہی احتیاط درکار ہوتی ہے کیونکہ اس قسم کی صورت حال میں حقائق کی جادوگری کا رجحان بڑھ جاتا ہے۔

بیوی کو مارنے پیٹنے کا سوال

ایک تقریب میں حمید صاحب نے خوش اخلاق اور نرم خو قیصر صاحب سے پوچھا:

''ارے بھئی' آپ نے اپنی بیگم کو مارنا کب بند کیا؟ قیصر صاحب کو اپنی شریک حیات سے گہری محبت ہوسکتی ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ بیوی پر ہاتھ اٹھانے کے خیال سے ہی ان کو گھن آتی ہو۔ لیکن اب وہ اس سوال کا کیا جواب دیں تاکہ یہ تاثر نہ پیدا ہو کہ وہ باقاعدگی سے بیوی کو پیٹنے والے واہیات شخص ہیں۔ اس سوال نیس دراصل قیصر کو ایک بہت ہی بودی قسم کی صورتِ حال میں ڈال دیا۔ ظاہر ہے کہ لوگ یہی سوچ رہے ہوں گے کہ حمید نے یہ سوال کسی شہادت' کسی ثبوت کی بنا پر ہی پوچھا ہوگا۔ گویا محض سوال کے

اٹھائے جانے سے یہ تاثر پیدا ہو گیا کہ قیصر اپنی بیوی کو پیٹتے رہے ہیں۔ اگر وہ انکار کریں تو بعض لوگوں کے نزدیک اس کا مطلب یہ ہو گا کہ انہوں نے ابھی بیوی کو مارنا بند نہیں کیا۔ اگر وہ واضح تردید کرتے ہوئے کہیں کہ ''میں نے کبھی بیوی پر ہاتھ نہیں اٹھایا'' تو شے کی گنجائش رہے گی کہ قیصر صاحب جھوٹ سے کام لے رہے ہیں۔ لوگ کہیں گے کہ ''میاں اگر بیوی کو پیٹ سکتے ہیں تو پھر جھوٹ بھی بول سکتے ہیں۔ آخر کوئی بات تو ہے جو حمید نے سرعام یہ سوال کر ڈالا ہے''۔

خیر' یہ صرف بیوی کی پٹائی کا سوال نہیں۔ اس قسم کے بہت سے سوالات ہیں جو غلط فہمیاں پیدا کر دیتے ہیں۔ سیاسی انتخابات میں اس قسم کے سوالات سے حریف امیدوار فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ٹیلی وژن کے اشتہاروں نے ایسے سوالات کے تاثر میں بے پناہ اضافہ کر دیا ہے۔

منفی انتخابی مہمیں

منفی قسم کی انتخابی مہموں کا رواج اب کا اثر ملکوں میں ہو چکا ہے۔ پاکستان اور اس جیسے پسماندہ ملک اس بارے میں خاصے بدنام ہیں۔ تاہم ترقی یافتہ ملکوں میں بھی اس قسم کا رجحان پایا جاتا ہے۔

منفی انتخابی مہموں کے بنیادی عناصر حسبِ ذیل ہیں:

(۱) امیدوار اپنے مخالفین پر ''بیوی کو مارنے پیٹنے'' جیسے الزامات لگاتے ہیں۔ یعنی معاملہ یہ نہیں کہ وہ حریفوں کو اپنی بیویوں کو پیٹنے کا طعنہ دیتے ہیں' بلکہ کہنے کی بات یہ ہے کہ وہ ان پر ایسے الزامات لگاتے ہیں جن سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے کہ وہ قابلِ مذمت حرکات کرتے رہے ہیں۔ یہ نہیں تو پھر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ ان کے زیرِ اثر شعبوں میں قابلِ مذمت حرکات ہوتی رہی ہیں۔

(۲) مقابل امیدواروں کی چھوٹی موٹی خامیوں یا کوتاہیوں کو بڑھ چڑھا کر بیان کیا جاتا ہے اور ان کی کردارکشی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا جاتا۔

(۳) اگر مخالف امیدوار اس قسم کی الزام تراشی کا جواب دینے میں نرمی یا تاخیر سے کام لے تو پھر الزام کے درست ہونے کا تاثر پیدا ہوتا ہے۔ دوسری طرف عام

طور پر الزام آرائی کا نشانہ بننے والے امیدوار کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ اس کا منہ توڑ جواب دے اور اپنے مخالف کا منہ بند کر دے۔

(۴) اس طرح دونوں طرف سے الزام تراشیوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور اس کی شدت بڑھتی چلی جاتی ہے۔ ساری انتخابی مہم مخالفوں پر الزام لگان اور ان کے لگائے ہوئے الزامات کا جواب دینے کی مہم بن کر رہ جاتی ہے۔ عام لوگ سیاسی اور بے دلی کے عالم میں یہ مضحکہ خیز کھیل دیکھتے رہتے ہیں۔

کسی مشہور و مقبول امیدوار کے خلاف منفی مہم چلانے سے الٹا نقصان بھی ہو سکتا ہے۔ ایسے امیدوار کے خلاف بدعنوانیوں کا الزام ایسا ہونا چاہیے کہ لوگ اس کو سنگین خیال کریں۔ اس الزم کے ساتھ ٹھوس شہادت یا زبردست جذباتی اپیل شامل ہونی چاہیے۔ اس کے برعکس جب کوئی ایک یا دونوں امیدوار جانے پہچانے نہ ہوں اور لوگ ان کے بارے میں زیادہ نہ جانتے ہوں تو پھر کھوکھلے الزامات سے بھی کام چل جاتا ہے۔ اس سلسلے میں زیادہ دارومدار الزامات کا نشانہ بننے والے پر ہوتا ہے۔ اگر وہ چالاکی اور ہوشیاری سے جواب دیتا ہے' اپنے حریف کو پیچھے دھکیل دیتا ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اگر اس کے پاس اشتہار بازی کے لیے بہت سی دولت ہوتی ہے تو پھر اس کے خلاف الزام آرائی کی مہم بے اثر ثابت ہو سکتی ہے۔

ان باتوں نے آج کے زمانے کی انتخابی مہموں کے لیے درکار طویل وقت اور دولت کی ریل پیل کے ساتھ مل کر انتخابات کو بے بس کر دینے والی قوت برداشت کا امتحان بنا دیا ہے۔ بلاشبہ یہ بدقسمتی کی بات ہے۔ کیونکہ اس طرح بہت اچھے لوگ انتخابات میں حصہ لینے سے گریز کرنے لگے ہیں۔ وہ اسے گندا کھیل سمجھتے ہیں اور اپنا دامن اس سے آلودہ نہیں کرنا چاہتے۔

۱۹۸۸ء کے امریکی صدارتی انتخابات میں ری پبلکن پارٹی کی طرف سے جارج بش اور ڈیموکریٹک پارٹی کی طرف سے مائیکل ڈیوکاکس امیدوار تھے۔ ان کے مقابلے کو ہم یہاں مثال کے طور پر استعمال کر سکتے ہیں۔ جس وقت ان دونوں صاحبان کی جماعتوں نے انہیں امیدوار نامزد کیا' تب عام لوگ ان کے بارے میں زیادہ نہیں جانتے تھے۔ دونوں پر مخالفانہ لیبل لگائے جاتے رہے تھے اس لیے سب سے پہلے انہیں ان

لیبلوں سے نجات پائی تھی۔ بش صاحب سابق صدر ریگن کے زمانے میں امریکہ کے نائب صدر رہے تھے۔ اس حیثیت میں وہ عام طور پر سرگرم نہ تھے اور نہ ہی مسائل پر سخت موقف اختیار کرتے تھے۔ اس لیے بعض اخباری تبصرہ نگاروں نے ناجائز طور پر ان کو کمزور شخصیت قرار دے رکھا تھا۔ دوسری طرف بعض قدامت پسند نقاد ڈیوکاکس کو حقارت سے ''لبرل'' پکارتے تھے۔

جب بش نے اپنی مہم شروع کی تو رائے عامہ کے جائزوں کے مطابق ڈیوکاکس کی مقبولیت زیادہ تھی۔ بش نے اپنی ٹیلی وژن مہم بہت جلد شروع کر دی۔ وہ بے حد موثر اور جذباتی ثابت ہوئی۔ خاصل طور پر ایک اشتہار لوگوں کو ان کی طرف متوجہ کرنے میں بہت کامیاب ثابت ہوا۔ یہ اشتہار جیل کے ایک گھومنے والے دروازے سے شروع ہوتا تھا۔ سزا یافتہ مجرموں کو اس دروازے کے ذریعے جیل کے اندر داخل ہوتے اور پھر فوراً ہی باہر نکلتے دکھایا گیا تھا۔ پھر اشتہار میں بتایا جاتا تھا کہ میساچیوسٹس ریاست میں ایک سیاہ فام 'ولی ہورٹن' کو قتل کرنے پر سزا ملی تھی۔ لیکن جلد ہی پیرول بورڈ نے اسے ویک اینڈ کے لیے جیل سے نکلنے کی اجازت دے دی تھی۔ جیل سے باہر آ کر ولی ہورٹن نے ایک عورت کی عزت لوٹ لی اور اس کے شوہر کو زخمی کر دیا۔ یہ واقعہ اس وقت پیش آیا کہ جب ڈیوکاکس صاحب میساچیوسٹس ریاست کے گورنر تھے۔ یوں اشتہار کا اشارہ یہ تھا کہ وہ جرم کے بارے میں نرم مزاج ہیں' کیونکہ انہوں نے اپنی ریاست میں مجرموں کی جلد رہائی کے پروگرام کی حمایت کی تھی۔

یہ اشتہار اس لیے زیادہ موثر ثابت ہوا کہ رائے عامہ کے جائزوں کے مطابق رائے دہندگان جرائم کی بیخ کنی پر بہت توجہ دے رہے تھے لوگ یہ چاہتے تھے کہ مجرموں کے ساتھ بے جا نرمی سے کام نہ لیا جائے۔ خیر' ایک اور بات بھی اشتہار کی تاثیر بڑھانے میں کارگر ثابت ہوئی اور وہ یہ تھی کہ اس اشتہار میں مجرم ایک سیاہ فام شخص تھا' جس کے ساتھ نرمی کی گئی جو الٹا نقصان دہ ثابت ہوئی۔ اس سے سیاہ فام شہریوں سے نفرت کرنے والے امریکی گورے کچھ زیادہ ہی متاثر ہوئے۔

اس اشتہار کے مضمون کو ہم حقائق کی شعبدہ گری خیال کر سکتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اس میں ڈیوکاکس صاحب کا مجرم کی رہائی سے تعلق قائم کیا گیا تھا۔ وہ گورنر ضرور تھے'

لیکن ولی ہورٹن کی رہائی کا فیصلہ انہوں نے نہیں کیا تھا۔ نہ ہی مجرم کی رہائی کی ذمہ داری براہِ راست ان پر عائد ہوتی تھی۔ بات محض یہ تھی کہ کئی ری پبلکن اور ڈیموکریٹک گونروں کی طرح انہوں نے بھی جیلوں میں مجرموں کی بھرمار کے پیشِ نظر قیدیوں کی جلد رہائی کے پروگرام کی حمایت کی تھی۔

شاید ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ کم و بیش سبھی سیاسی اشتہاروں میں حقائق کی شعبدہ بازی دکھائی جاتی ہے اور صرف وہی حقائق پیش کیے جاتے ہیں جو اشتہار دینے والوں کے مفاد کے مطابق ہوتے ہیں۔ ولی ہورٹن والا اشتہار بھی اسی قسم کا تھا اور اس میں بے جا طور پر ڈیوکارکس کو جلد رہا ہونے والے قیدیوں کے جرائم کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا تھا۔ حالانکہ اس قسم کے جرائم کئی امریکی ریاستوں میں وقوع پذیر ہوئے تھے۔

ٹیلی وژن پر اس اشتہار کی نمائش کے بعد ڈیوکاکس صاحب کے لیے لازم تھا کہ جواب میں کوئی موثر قدم اٹھاتے۔ لیکن ان سے مہلک غلطی سرزد ہو گئی۔ کئی ہفتوں تک انہوں نے اس اشتہار کا کوئی موثر جواب ہی نہ دیا۔ اس دوران یہ اشتہار ٹیلی وژن سے برابر نشر ہوتا رہا اور اس نے بہت سے لوگوں کو ڈیوکاکس کے خلاف کر دیا۔ رائے عامہ کے جائزے بش صاحب کے حق میں جانے لگے۔ آخر کار جب ڈیوکاکس نے جواب دینے کی ٹھانی تو بش صاحب اپنے بارے میں کمزور شخصیت ہونے کا عوامی تاثر ختم کر چکے تھے۔ دوسری طرف ڈیوکاکس کے بارے میں یہ تاثر بن چکا تھا کہ وہ نہ صرف جرائم سے متعلق نرم رویہ رکھتے ہیں بلکہ کمزور شخصیت بھی ہیں۔ وہ بروقت فیصلہ کرنے اور سخت فیصلوں پر عمل کروانے کی اہلیت سے محروم ہیں' حالانکہ کسی صدر کے لیے یہ اہلیت ناگزیر حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے بعد بش کی برتری مسلسل بڑھتی چلی گئی۔ آخر کار وہ انتخابات جیت گئے۔

ایسا ہی ایک اور واقعہ ۱۹۹۰ء میں رونما ہوا۔ تب بل نیلسن ریاست فلوریڈا کے گورنر کے عہدے کے لیے ڈیموکریٹک پارٹی کے ٹکٹ کے امیدوار تھے۔ انہوں نے مجرموں کی جلد رہائی کے موضوع کو ریاست کے ری پبلکن گونرتر باب ماٹینز کے خلاف استعمال کرنا چاہا' کیونکہ ایک اور سیاہ فام اور وقت سے پہلے رہائی پانے والے مجرم نے ڈاکے کی ایک واردات کے دوران دو پولیس والوں کو ہلاک کر دیا تھا۔ تاہم الزام تراشی کی یہ مہم جلد ہی دم توڑ گئی کیونکہ یہ معلوم ہو گیا تھا کہ اس مجرم کو قبل از وقت رہائی ایک سابق

گورنر کے زمانے میں ملی تھی جو خود بھی بل نیلسن کی طرح ڈیموکریٹ تھا۔

ان دونوں واقعات میں بے جا تعمیم کا استعمال بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ دونوں صورتوں میں الزام کی بنیاد اس تصور پر رکھی گئی تھی کہ کسی ریاست کا گورنر ان مجرموں کے مزید جرائم کا ذمے دار ہے جن کو قبل از وقت جیل سے رہائی دی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بات حقیقت سے بہت دور ہے۔ کسی لیڈر کے لیے یہ جاننا ممکن نہیں کہ ریاست کے مختلف دفتروں میں کیا کچھ ہو رہا ہے۔ اس لیے کسی لیڈر' موجود مثالوں میں گورنر' کو نچلی سطح کے حکام کے کئے ہوئے ہر فیصلہ کا ذمہ دار قرار نہیں دیا جا سکتا۔ آج کا جدید معاشرہ اس قدر پیچیدہ ہے کہ عام طور پر اوپر کی سطح کے لیڈروں کو واقعات پر اس قدر کنٹرول حاصل نہیں ہوتا جتنا کہ اکثر لوگ سمجھتے ہیں۔

اب ہم رائے تبدیل کرنے کے بعض دوسرے طریقے بیان کریں گے۔

کیچڑ اچھالنا

ایک انتخابی مہم میں ماس صاحب حصہ لے رہے تھے۔ مخالفین نے ان کو ''باس'' کہہ دیا۔ وہ صاحب آگ بگولہ ہو گئے چنانچہ اپنی ایک تقریر میں انہوں نے مخالفین کو خوب برا بھلا کہا۔ پھر کہنے لگے کہ ''ہم جمہوری عمل پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس لیے ہم فیصلہ اپنے شہر کے رائے دہنگان پر چھوڑتے ہیں جو ہمارے مخالفین کی سازشوں اور مکاریوں کے دام میں نہ آئیں گے۔ نہ ہی ان کا شرفا پر کیچڑ اچھالنے والی کرتوتوں سے گمراہ ہوں گے۔ ہمارے پیارے شہر کے لوگ اپنے ووٹوں سے فیصلہ کریں گے کیونکہ یہ لوگ ہی اصل میں باس ہیں''۔

یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ ماس صاحب کو جب ''باس'' کہا گیا تو وہ فوراً ہی مدافعت پر اتر آئے۔ جواب میں انہوں نے حریفوں کو اقتدار کے بھوکے' عوام کے جذبات بھڑکانے والے اور خدا جانے کیا کیا کچھ کہہ ڈالا۔ ظاہر ہے کہ ماس صاحب مبالغے سے کام لے رہے تھے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ ان کے تمام مخالف اقتدار پرست اور عوام کے جذبات بھڑکانے والے تھے۔ امکان یہی ہے کہ ماس صاحب اور ان کے مخالف دونوں گروپوں میں اچھے لوگ ہوں گے اور بعض واقعی شرارتی اور برے بھی ہوں گے۔

ماس صاحب نے نہ صرف اپنے مخالفین کو برا بھلا کہا بلکہ ایسے جذباتی الفاظ بھی کہے جو غیر محتاط سننے والوں کو ماس صاحب کے مخالفوں کے خلاف تعصّب کر سکتے تھے۔

سیاسی لڑائیوں میں اگر حقیقی مسائل اٹھائے جائیں یا اگر سیاسی لڑائیاں بحث و مباحثہ کی راہ ہموار کریں اور سیاسی لیڈروں کو اپنے اعمال کی توجیہ پر مجبور کریں تو وہ معاشرے کے لیے مفید ثابت ہوسکتی ہیں۔ لیکن جب بحث جذباتی نعرہ بازی اور گالی گلوچ بن جائے تو پھر حقیقی مسائل غائب ہو جاتے ہیں۔ اس قسم کا رویہ وہ لوگ اختیار کرتے ہیں جو زیرِ بحث موضوعات کے بارے میں علم سے محروم ہوتے ہیں یا جو ان موضوعات پر سوچ بچار کے عادی نہیں ہوتے۔

بڈاوا

بف کا قصہ ہے کہ اس نے اجازت کے بغیر ماں کے پرس سے کچھ پیسے نکال لیے۔ ماں کو پتہ چلا تو بہت ناراض ہوئی۔

''تمہیں سزا ضرور ملے گی۔ ایک ماہ کے لیے ٹیلی وژن بند''۔ ماں نے غصے سے کہا۔

''مجھ پر ہی کیوں برس رہی ہیں'' بف نے کہا ''جونی کو تو آپ نے کچھ نہیں کہا تھا جب اس نے سارا کمرہ برباد کر دیا تھا''۔

اس دلیل میں بف چالاکی سے کام لے رہا تھا۔ اس کی کوشش یہ تھی کہ ماں کی توجہ اپنی غلط کاری سے ہٹا کر کسی دوسرے فرد (بف کے معاملے میں اس کی بہن) کے معاملے کی طرف ہو جائے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایک بڈاوا تلاش کر رہا تھا۔ بڈاوا کو آپ نے دیکھا ہوگا۔ کسان کھیتوں سے فصل کو خراب کرنے والے پرندے دور بھگانے کے لیے چھڑی پر پھٹے پرانے کپڑے ٹانگ کر انسانی ڈھانچہ سا بنا دیتے ہیں۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ جب بحث و مباحثہ کے دوران کوئی شخص ایسا سوال پوچھتا ہے یا کوئی نیا مسئلہ اٹھا دیتا ہے جس کا مقصد جان بوجھ کر بحث کا رخ غیر متعلقہ امور کی طرف موڑنا اور لوگوں کو فریق مخالف کے دلائل کو سننے اور پرکھنے سے روکنا ہوتا ہے تو وہ ''بڈاوے'' کی تکنیک استعمال کر رہا ہوتا ہے۔

انتخابی مہموں میں کمزور امیدوار اہم مسائل سے لوگوں کی توجہ ہٹانے کے لیے

بہت سے ''بڑاوے'' کھڑے کر دیتے ہیں۔ ان میں سے جو امیدوار مالدار ہوں' وہ ایک طرف عوام کی توجہ سنجیدہ مسائل سے ہٹاتے ہیں اور دوسری طرف دولت کے بل بوتے پر اپنے حق میں سطحی قسم کی اشتہاری مہم شروع کر دیتے ہیں۔

سادہ لوگ

وزیراعلیٰ صاحب کو ہم دیکھتے ہیں۔ وہ شان وشوکت سے تشریف لاتے ہیں۔ اچکن کے بٹن بند کرتے ہیں۔ بیلچے سے زمین پر نشان لگا کر ایک نئی عمارت کا سنگِ بنیاد رکھ دیتے ہیں۔ یہ وہی عمارت تھی جس کی تعمیر کا منصوبہ ان وزیرِ اعلیٰ صاحب کے پیشرو کے زمانے میں بنا تھا اور انہی دنوں بجٹ میں اس عمارت کے لیے رقم بھی مخصوص کی گئی تھی۔ اخباری نمائندے' فوٹو گرافر' ٹی وی کے کیمرے اس واقعہ کو ریکارڈ کر لیتے ہیں۔

''خبرنامے'' میں دھوم دھام سے اس واقعہ کا چرچا ہوتا ہے اور دوسرے روز کے اخبارات میں رنگین تصویروں اور شاہ سرخیوں کے ساتھ لوگوں کو اس مبارک واقعہ کی اطلاع دی جاتی ہے۔

منظر بدلتا ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ ایک فلمی اداکارہ انٹرویو میں بچوں کے سکول کے منصوبے پر گفتگو کر رہی ہے۔ ایک بڑی کارپوریشن کا صدر اپنے کارکنوں کے ساتھ ایک میز پر لنچ کر رہا ہے۔ وہ جمہوریت اور مساوات کی مثال بنا ہوا ہے۔ ٹیلی وژن کے کیمرے اس نادر مثال کو عوام کے سامنے پیش کرنے کے لیے محفوظ کر رہے ہیں۔

اس قسم کی پی آر سرگرمیاں سادہ لوح عوام کو یہ پیغام دینے کے لیے کی جاتی ہیں کہ ''ہم بھی تمہارے جیسے ہی ہیں''۔ تاہم ضروری نہیں کہ کسی بڑے آدمی کا ''امیج'' وہی ہو جو اس کی اصل شخصیت ہے۔ دوسرے گروہوں کی طرح لیڈروں اور مشہور لوگوں میں بھی کئی قسم کی شخصیات موجود ہوتی ہیں۔ بعض خوش دل ہوتے ہیں بعض ناگوار۔ بعض ملنسار ہوتے ہیں' بعض رعب جمانے والے صاحب قسم کے ہوتے ہیں۔ اسی طرح بعض ہمدرد ہوتے ہیں اور بعض سخت گیر۔

منتقلی کی تدبیر

عام لوگ اپنے قومی جھنڈے' ملک' ماں' عبادت گاہ' اپنے شہر' یتیم بچوں' مضبوط

کردار کے لوگوں اور خوبصورت عورتوں کے معاملے میں جذباتی ہوتے ہیں۔ اسی طرح وہ مشہور و مقبول افراد جیسے ذوالفقار علی بھٹو' عمران خان یا بابرہ شریف کے معاملے میں بھی حساس ہوتے ہیں۔ تعلقات عامہ کے ماہرین ایک قسم کی ''منتقلی کی تدبیر'' استعمال کرتے ہیں جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ جس نظریہ' فرد یا مصنوعات کے لیے اشتہاری مہم چلانا چاہتے ہیں' اس کے ساتھ جذباتی علامتوں کو منتقل کر دیا جائے۔ اس طرح وہ علامت سے وابستگی کے جذبے کو اس نظریئے' فرد یا شے کی طرف منتقل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اکثر اشتہاروں میں یہ تدبیر استعمال کی جاتی ہے۔ مثلاً آپ نے ایک سگریٹ کا اشتہار دیکھا ہوگا جس میں ایک پرکشش اور مضبوط شخص کو گھوڑے پر سوار ہو کر سگریٹ پیتے دکھایا گیا ہے' جب کہ گھوڑا ایک وسیع کھیت میں سے گزر رہا ہے جس کے پسِ منظر میں خوبصورت پہاڑیاں نظر آتی ہیں۔ یا پھر ایک اشتہار میں دیکھتے ہیں کہ ایک خوبصورت عورت سمندر کے کنارے بیٹھی ہے۔ پسِ منظر میں صاف' نیلگوں پانی دکھائی دیتا ہے۔ عورت کے ہاتھ میں ایک سگریٹ ہے۔ ایسے مناظر اس لیے بنائے جاتے ہیں تاکہ حسین قدرتی مناظر' پرکشش مردوں اور خوبصورت عورتوں کو دیکھنے سے جو جذبے پیدا ہوتے ہیں ان کا رخ اس شے کی طرف موڑ دیا جائے جس کی اشتہار بازی مقصود ہے۔

ٹیلی وژن کے سبب یہ تکنیک بہت موثر ہوگئی ہے۔ اس لیے اکثر تجارتی اور سیاسی اشتہاروں میں اس کو استعمال کیا جاتا ہے۔ بہت سی حالیہ منفی انتخابی مہموں میں بھی اس سے کام لیا گیا ہے۔ ہوتا یوں ہے کہ کوئی امیدوار اپنے ٹیلی وژن اشتہاروں میں کسی ناگوار علامت کو مرکز بناتا ہے اور اس کا تعلق اپنے مخالف امیدوار سے جوڑ دیتا ہے۔ بسا اوقات یہ تعلق بہت ہی دور از کار قسم کا ہوتا ہے۔ اب اگر یہ ٹیلی وژن اشتہار موثر ثابت ہو تو پھر رائے دہندگان کو مخالف امیدوار سے برگشتہ کرنے کی خاطر اسے بار بار دکھایا جاتا ہے۔

خیر' اس قسم کی ساری اشتہار بازی نقصان دہ ہی ہے' کیونکہ اس کی وجہ سے حقیقی مسائل پر سنجیدہ بحث و مباحثہ کی گنجائش کم بلکہ اکثر صورتوں میں ختم ہو جاتی ہے۔ یوں آخر کار جمہوریت کو ضعف پہنچتا ہے۔

''منتقلی کی تدبیر'' کا معاملہ مختلف ہے۔ وہ ہمیشہ نقصان دہ ثابت نہیں ہوتی۔ بعض اوقات اچھے مقاصد کے لیے بھی اس تکنیک سے کام لیا جاتا ہے۔ نکتہ اصل میں یہ ہے

کہ جب مصنوعی طریقے سے کوئی تاثر قائم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو لوگوں کے لیے سچ کو جھوٹ سے الگ کرنا دشوار ہوتا ہے۔ لہٰذا ان کو اس امر سے باخبر ہونا چاہیے کہ یہ سارا عمل کس طرح کام کرتا ہے۔ اس طرح اشتہار باز ان کو آسانی سے اپنے مقاصد کے لیے استعمال نہ کر سکیں گے۔

ذیل میں ہم نے ایک بیان درج کیا ہے جس میں لوگوں کو ایک خاص امیدوار کے حق میں ووٹ دینے کو کہا گیا ہے۔ حقیقی زندگی میں یہ امیدوار ہم سب سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔

''چوہدری خادم حسین ایک شاندار لیڈر رہے۔ وہ آپ سب کی طرف سے حق و انصاف اور آزادی کا بول بالا کرنے اور ہمارے خوبصورت شہر کی شان و شوکت بڑھانے کے لیے انتھک جد و جہد کرتا ہے''۔

کیا آپ نے اس بیان سے کوئی پیغام اخذ کیا؟ شاید کچھ بھی نہیں۔ اس میں چوہدری خادم حسین کی شخصیت اور اس کے کارناموں کے بارے میں کوئی حقیقی تفصیلات موجود نہیں۔ بس عام سی باتیں ہیں اور لفظوں کے ذریعے چوہدری صاحب کی عظمت کا قائل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اشتہار باز اور سیاسی مہموں کے منتظمین اس تکنیک کو استعمال کیا کرتے ہیں۔ وہ موٹے موٹے اور جذباتی قسم کے الفاظ (جیسے آزادی، مساوات، بھائی چارہ وغیرہ) استعمال کر کے رعب ڈالنا چاہتے ہیں۔ آپ ان الفاظ کو الگ کر دیں تو دیکھیں گے کہ ان کے پس پردہ کچھ بھی نہیں۔

بینڈ ویگن اثر

شہر کی شاہراہ پر پریڈ ہو رہی ہے۔ لوگ اسے دیکھ کر اس قدر جذباتی ہو جاتے ہیں کہ اچھل کر بینڈ ویگن پر سوار ہو جاتے ہیں۔ یوں وہ بھی پریڈ میں شامل ہو جاتے ہیں۔ کسی جذباتی نوعیت کے واقعہ میں شمولیت کی خواہش انسانوں میں خاصی شدید ہوتی ہے۔ اشتہار باز ہماری رائے پر اثر انداز ہونے کے لیے اس خواہش کو بھی استعمال کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

جب کسی شے، نظریہ یا کسی سیاسی امیدوار کے لیے مہم شروع ہوتی ہے تو بہت

سے لوگ کوئی فیصلہ نہیں کر پاتے۔ گومگو کے عالم میں وہ گردوپیش نگاہ ڈالتے ہیں تاکہ یہ جان سکیں کہ دوسرے لوگوں کا ردِعمل کیا ہے۔ اب اگر مہم باز یہ تاثر دینے میں کامیاب ہو جائیں، کہ عوام کی اکثریت ان کی شئے' نظریہ یا امیدوار کی حامی ہے تو اس قسم کے گومگو کی کیفیت کا شکار لوگ بڑی تعداد میں ان کے ساتھ شامل ہو جاتے ہیں۔

سیاسی انتخابات میں اب امیدوار اس تکنیک کو خوب استعمال کرتے ہیں۔ اشتہاروں' جلسوں جلوسوں اور کئی دوسرے طریقوں سے وہ یہ تاثر دیتے ہیں کہ عوام کی بھاری اکثریت ان کے ساتھ ہے۔ پہلے روز سے ہی وہ یہ دعویٰ دہرانے لگتے ہیں کہ الیکشن سے پہلے ہی وہ الیکشن جیت گئے ہیں کیونکہ' ان کے بقول' عوام کی بھاری اکثریت ان کے ساتھ شامل ہو چکی ہے۔ ان دعوؤں سے اور اکثریت کی حمایت کا تاثر موثر انداز میں دیئے جانے سے بہت سے لوگ متاثر ہوتے ہیں اور وہ واقعی اس امیدوار کی حمایت کرنے لگتے ہیں۔

بینڈ ویگن اثر کی تکنیک کو استعمال کر کے لوگوں کو ایسے کاموں کی ترغیب بھی دی جا سکتی ہے جن کو وہ خراب سمجھتے ہیں...... مثلاً شراب نوشی' سگریٹ نوشی یا منشیات کا استعمال...... اکثر لوگوں کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنے گردوپیش کے گروہوں جیسے ہو جائیں۔ وہ دوسروں سے مختلف نہیں رہنا چاہتے۔ یہ بات ان کو تکلیف دہ محسوس ہوتی ہے۔ اس لیے جونہی ان کو ''کوئی کامیاب گروہ'' دکھائی دیتی ہے' وہ چھلانگ مار کر اس کے ساتھ ہو جاتے ہیں۔

آٹھویں باب میں ہم نے یہ کہا تھا کہ عام لوگ مطابقت پذیری پر مائل رہتے ہیں۔ بینڈ ویگن اثر اصل میں اس کی ایک اور مثال ہے۔ یاد کیجئے کہ ہم نے یہ مثال درج کی تھی کہ خطوط کی لمبائی کے بارے میں اکثر لوگ مختلف نظر نہ آنے کی آرزو میں غلط رائے کو قبول کرنے لگتے ہیں۔ گویا وہ بھی کامیاب بینڈ ویگن پر سوار ہونے کے خواہش مند ہیں۔

توثیق نامہ

توثیق نامہ سے مراد کسی ممتاز شخصیت کا تائیدی بیان ہے جس کا مقصد رائے پر اثر انداز ہونا ہے۔ اکثر اوقات لوگ کسی انجمن' کسی مقصد' فرد یا شے کی قدر و قیمت کا

اندازہ ان افراد کے حوالے سے لگاتے ہیں جو اس کی تائید کرتے ہیں۔توثیق نامے وسیع پیمانے پر استعمال ہوتے ہیں۔اس سے ہم ان کے موثر ہونے کے اندازہ کر سکتے ہیں۔

بعض توثیقی بیان مفید ہوتے ہیں۔فرض کیجئے کہ کسی نامعلوم ادارے کی جانب سے آپ کو ایک خط موصول ہوتا ہے۔اس میں ادارے کے لیے چندہ طلب کیا گیا ہے۔ خط کی عبارت سے آپ متاثر ہوتے ہیں۔لیکن کیا اس ادارے کو چندہ دیا جائے؟ کیا اس کے پیچھے وہ لوگ نہیں جو کسی کاز کی آڑ میں پیسے بٹورتے ہیں؟ اس قسم کے خطوط کے ساتھ عموماً سرپرستوں اور حامیوں کی فہرست اور مشہور صاحبان کے توثیق نامے بھی ارسال کئے جاتے ہیں۔ اگر ہم ان ناموں کو پہنچانتے ہوں اور ان کے بیانات سے متفق ہوں تو پھر ادارے کی مدد کرنے اور چندہ دینے پر آسانی سے مائل ہوسکتے ہیں۔

بلاشبہ توثیق ناموں کو غلط طور پر بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ بسااوقات ممتاز شخصیات کے نام ان کی اجازت کے بغیر ہی سرپرستوں کی فہرست میں شامل کر لیے جاتے ہیں۔اسی طرح بعض اوقات انجمنیں اور ادارے ایسے کام بھی شروع کر دیتے ہیں جن سے سرپرست متفق نہیں ہوتے۔ تاہم یہ بات زیادہ عام نہیں۔عموماً اس قسم کے توثیقی بیانات غلط طور پر استعمال نہیں کئے جاتے' کیونکہ اس طرح متعلقہ اداروں اور انجمنوں کو خود نقصان پہنچنے کا خدشہ ہوتا ہے۔کیونکہ اگر کوئی سرپرست کھلے طور پر کسی انجمن سے تعلق کی نفی کر دے تو اس کی ساکھ بالکل تباہ ہو جاتی ہے۔

جرم بذریعہ شرکت

اعجاز نے جمیل کو اپنی اس کار میں سیر کی دعوت دی جو اس کے بقول اس نے نئی خریدی تھی۔لیکن اصل میں یہ کار چوری کی گئی تھی۔ ایک پولیس مین نے مسروقہ کار کو شناخت کر لیا اور دونوں نوجوانوں' اعجاز اور جمیل' کو کار کی چوری کرنے کے الزام میں گرفتار کر لیا۔ یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ جمیل شرکت کے حوالے سے جرم کی صورتِ حال میں الجھا ہے۔ وہ اس لیے مجرم خیال کیا جارہا ہے کیونکہ اس کا تعلق اعجاز سے ہے جس نے کار چرائی اور جو کار چلا رہا تھا۔

انتخابی مہموں میں اس قسم کے جرائم کو رائے عامہ پر اثر انداز ہونے کے لیے

عموماً استعمال کیا جاتا ہے۔ ایسے ہی ایک معاملے میں الیکشن سے چند روز پہلے اخبار میں ایک امیدوار کی تصویر شائع ہوئی جس میں اس کو ایک بدمعاش کے ساتھ مسکرا کر ہاتھ ملاتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بیچارا امیدوار الیکشن ہار گیا۔

اچھا آپ جانتے ہی ہیں کہ سیاست دانوں کو ایسے کئی لوگوں سے ہاتھ ملانا پڑتا ہے جن کو وہ نہیں جانتے۔ یونہی کسی تقریب، کسی جلسہ جلوس میں کسی قابلِ اعتراض فرد سے ان کا آمنا سامنا ہوسکتا ہے۔ اب اگر کوئی مکار مخالف اس موقع کی تصویر اتار لے اور الیکشن کے موقع پر اخبارات میں چھپوا دی جائے تو عام لوگ ٹھنڈے دل سے اس معاملے کو سمجھنے کی کوشش نہیں کریں گے۔ بس ہنگامہ برپا ہو جائے گا۔ سیکنڈل بن جائے گا جو اس غریب امیدوار کو بالآخر لے ڈوبے گا۔

رائے عامہ پر اثر انداز ہونے کے لیے جو طریقے استعمال کئے جاتے ہیں۔ ان میں ''جرم بذریعہ شرکت'' کا طریقہ سب سے زیادہ خطرناک ہے۔ اس کی ایک ڈرامائی مثال ہم نے نویں باب میں بیان کی تھی جس میں بتایا گیا تھا کہ دوسری جنگ عظیم کے ایام میں جاپانی نژاد امریکیوں کو کیمپوں میں بند کر دیا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ ان سب لوگوں کا جرم محض یہ تھا کہ ان کے آباد و اجداد جاپانی تھے۔ تاہم امریکہ میں، سینیٹر جوزف میکارتھی نے ۱۹۵۰ء کے عشرے میں ''جرم بذریعہ شرکت'' کو انتہا تک پہنچا دیا۔ امریکی سینٹ کی ایک کمیٹی کے چیئرمین کے طور پر اس نے کمیونسٹوں کے خلاف مہم شروع کی اور کئی لوگوں کو مجبور کیا کہ وہ اپنی سیاسی آراء انجمنوں کی رکنیت، دوستوں اور واقف کاروں کے بارے میں سوالات کا جواب دیں۔ ان لوگوں میں ممتاز اداکار، فنکار، ادیب، استاد اور سرکاری ملازم بھی شامل تھے۔ ان میں سے جن لوگوں نے اپنی وابستگیوں یا سیاسی خیالات سے متعلق سوالات کا جواب دینے سے انکار کیا، ان کو جیلوں میں بند کرایا گیا یا ملازمتوں سے نکال دیا گیا۔ حد یہ ہے کہ ایک خاتون کو محض اس لئے سرکاری ملازمت سے ہاتھ دھونے پڑے کہ اس کی ایک ہم نام عورت کا نام میکارتھی کی اس فہرست میں شامل تھا جو اس نے کمیونسٹوں کی تیار کر رکھی تھی۔

ان ہزاروں اداکاروں اور سکرین پرنٹرز کو بلیک لسٹ کرنے کے لیے پرائیویٹ گروپ بنائے گئے تھے جن پر کمیونسٹ ہونے یا کمیونسٹوں کا ہمدرد ہونے کا شبہ تھا۔ یہ خفیہ

فہرستیں ڈراموں اورفلموں کے پروڈیوسروں کو دی جاتی تھیں اورانہیں مجبور کیا جاتا تھا کہ وہ ان فہرستوں میں شامل کسی فرد کو کام نہ دیں۔ یہ سارا نظام اس قدر موثر انداز میں چلایا گیا کہ اس کے اثرات ختم ہونے میں دس سال سے بھی زیادہ وقت صرف ہوا۔ تاہم ان برسوں کے دوران بے شمار لوگوں کے کیریئر تباہ ہو گئے تھے۔

جمہوری معاشرے کا ایک بنیادی اصول یہ ہے کہ کسی شخص کو محض اس کی قومیت' خاندان' رائے یا دوسروں کے ساتھ تعلق کی بنا پر موردِ الزام نہ ٹھہرایا جائے گا اور نہ ہی سزا دی جائے گی۔ ہر شخصصر اپ؛ نے اعمال کا ذمہ دار ہے۔ اسکے بارے میں دوسرے کی رائے کی بنا پر کوئی فیصلہ نہیں کیا جانا چاہیے۔ یہی وہ بنیادی اصول ہے جس کی خلاف ورزی کر کے آمرانہ حکومتیں اختلاف رائے اور اپوزیشن کو تباہ کر دیتی ہیں۔ اس قسم کی حکومتیں منحرفین کے دوستوں اور رشتہ داروں کو ظلم وتشدد کا نشانہ بناتی ہیں کیونکہ ان کے نزدیک' چاہے اس امر کی کوئی شہادت موجود نہ ہو تو بھی' عزیز واقارب منحرفین کی سوچ سے متاثر ہوتے ہیں۔ ان کے خلاف آواز اٹھانا مشکل ہو جاتا ہے۔ یوں آمروں کو اقتدار پر زیادہ عرصے تک قبضہ رکھنے کا موقع مل جاتا ہے۔

قربانی کے بکرے

پرانے مذاہب میں یہ تصور پایا جاتا ہے کہ گناہ گار کسی خاص جانور مثلاً بکرے کو قربان کر کے اپنے بوجھ سے نجات پا سکتے ہیں۔ یہ انداز فکر صرف بکروں اور دنبوں تک محدود نہیں رہتا' بلکہ ایک ذہنی رویہ بن جاتا ہے۔ ہم کئی قسم کے ''قربانی کے بکرے'' تلاش کرنا شروع کر دیتے ہیں جن کو ٹھکانے لگا کر ہم اپنی غلطیوں کے نتائج سے محفوظ رہ سکیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ کئی معاشروں میں اکثریتی گروہ کوئی نہ کوئی اقلیتی گروہ تلاش کر لیتا ہے اور پھر معاشرے کی تمام خامیوں اور کوتاہیوں کی ذمہ داری اس پر ڈالی جانے لگتی ہے۔

بعض جانوروں میں بھی اس قسم کا رویہ پایا جاتا ہے۔ مثلاً بعض علاقوں کی مرغیوں میں ''ٹھونگے مارنے کا نظام مراتب'' موجود ہوتا ہے۔ اس میں ایک مرغی ایسی ہوتی ہے جو باقیوں کو ٹھونگے مارتی ہے' لیکن اس کو کوئی مرغی ٹھونگا مارنے کی جرات نہیں

کرتی۔ پھر دوسرے نمبر کی مرغی آتی ہے۔ وہ پہلی کے سوا باقی مرغیوں کو ٹھونگے مارتی ہے جب کہ وہ بدلے میں اس کو ٹھونگے نہیں مارتیں۔ اس نظام میں پست ترین سطح پر آنے والی مرغی واقعی بے چاری ہوتی ہے۔ سب اس کو تنگ کرتی ہیں اور اگر وہ کسی ایک سے بھی بدلا لینا چاہے تو اس کو ''برادری'' سے خارج کر دیا جاتا ہے۔ کبھی کبھی تو وہ سب کے ٹھونگے کھا کھا کر مر ہی جاتی ہے۔

انسانی معاشروں میں اقلیتی گروہوں کو قربانی کا بکرا بنانے کا رویہ عام ہے۔ ان اقلیتی گروہوں کو معاشرے کی تمام خامیوں' کوتاہیوں اور مصیبتوں کا ذمہ دار قرار دیا جاتا ہے۔ تعصّب اور رواج پرستی کی طرح یہ طرزِ عمل بھی رنگ' نسل' مذہب' قومیت' جنس یا کسی اور گروہی خصوصیت کا غیر معقول ردِ عمل ہے۔

اس باب میں ہم نے ان طریقوں کا جائزہ لیا ہے جن کے ذریعے زیادہ تر سیاسی آراء تبدیل کی جاتی ہیں۔ تجارتی مقاصد کے لیے اشتہار بازی کا مقصد بھی دوسروں کی رائے تبدیل کرنا ہوتا ہے۔ گیارہویں باب میں ہم اشتہار بازی میں استدلال کی خامیوں پر توجہ دیں گے تاکہ ہم ان مصنوعات پر اپنے پیسے ضائع کرنے سے محفوظ رہ سکیں جو عموماً مہنگی ہوتی ہیں یا کسی اور حوالے سے فضول ہوتی ہیں۔

اشتہار بازی میں استدلال کی غلطیاں

سیبر گ خاندان کے افراد کمرے میں بیٹھ کر ٹیلی وژن کا مقبول پروگرام دیکھ رہے تھے۔ ہیرو کو جونہی کامیابی حاصل ہونے والی تھی، سکرین پر منظر بدلا اور پروگرام کی جگہ اشتہار شروع ہو گیا:

''سردیوں کے لیے ابھی سے تیاری کیجئے۔ المونیم اسٹورم ونڈوز صرف بیس ڈالر میں دستیاب ہیں۔ آج ہی خریدیئے وگرنہ باری نہ آئے گی۔ فون نمبر ۶۰۲۰۔۲۳۴ پر ابھی فون کیجئے۔''

سیبر گ صاحب اس قدر کم قیمت پر بہت حیران ہوئے۔ انہوں نے فوراً فون نمبر نوٹ کرایا۔ چند روز بعد، سیبر گ صاحب کی کال کے جواب میں، کمپنی کا ایک نوجوان نمائندہ اسٹورم ونڈو کا ایک چھوٹا سا ماڈل لے کر آیا اور سیبر گ کو دکھانے لگا۔ سیبر گ صاحب شک وشبے سے دیکھتے رہے پھر کہنے لگے ''واہیات سی ونڈو ہے۔ ابھی سے کھڑ کھڑ کر رہی ہے۔''

''لیکن جناب!'' سیلز مین نے جواب دیا: ''بیس ڈالر کے حساب سے تو یہ بہت اچھی ہے۔ بس آپ کو یہ خیال رکھنا ہوگا کہ سمندر سے آپ کتنا دور ہیں؟''

''تقریباً چار میل'' سیبر گ نے جواب دیا: ''لیکن آپ یہ پوچھ کیوں رہے ہیں؟''

''خوب، پھر آپ کو وقتاً فوقتاً فریم میں تیل ڈالنا پڑے گا۔ ورنہ سمندری ہوا کا نمک المونیم کے فریم کو خراب کر دے گا۔''

''المونیم کو تیل دینا پڑے گا؟ کتنے وقفے کے بعد؟'' سیبرگ نے پوچھا۔

سیلز مین نے جواب دیا: ''یونہی سال میں چار مرتبہ۔''

''گویا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ سال میں چار بار مجھے اپنی پندرہ کھڑکیوں سے باہر لٹک کر ان کے فریموں کو تیل دینا پڑے گا۔''

''اب میں سمجھا۔ آپ کو بہتر معیار کی کھڑکیاں درکار ہیں۔ آپ کے ذوق کے شے بھی میں لایا ہوں۔ وہ میری کار میں ہے۔ ابھی لاتا ہوں۔'' سیلز مین اپنی مہارت کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

چند منٹوں میں سیلز مین اپنی کار سے چمکدار المونیم کی کھڑکی لے کر آ گیا۔ سیبرگ صاحب کو قائل کرنے میں اسے تقریباً ایک گھنٹہ لگ گیا۔ لیکن وہ کامیاب ہو ہی گیا۔ سیبرگ نے پندرہ زیادہ قیمتی کھڑکیاں خرید لیں۔ اگلے ہفتے وہ نصب کر دی گئیں۔

یہ کہانی بالکل سچی ہے' البتہ ہم نے نام بدل دیے ہیں' اس قسم کا طریقہ کار استعمال کرنے والے اشتہار بازوں نے بڑی احتیاط سے اس کی تفصیلات طے کر رکھی ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ لوگوں کو سودے بازی میں دلچسپی ہوتی ہے اور جب تھوڑے پیسوں میں زیادہ کچھ دینے کی پیشکش کی جائے تو وہ متوجہ ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا اس اشتہار کا جواب زیادہ لوگ دیتے ہیں جس میں سودے بازی کی گنجائش موجود ہو۔ اشتہار باز یہ بھی جانتے ہیں کہ جب کوئی اچھا سیلز مین گاہک کے روبرو موجود ہو تو وہ محض اشتہار سے زیادہ کامیاب ثابت ہوتا ہے۔

ٹیلی وژن اشتہار خاصے مہنگے ہوتے ہیں' لیکن اشتہار باز ان کے اخراجات خوشی سے برداشت کر لیتے ہیں' کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ان اشتہاروں کے ذریعے سیلز مین اور گاہکوں کو روبرو لایا جا سکتا ہے۔

ہم نے اوپر جو مثال درج کی ہے' اس میں سیلز مین سستی کھڑکیاں بیچنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ وہ تو محض ایک بہانہ تھا۔ سیلز مین سستی کھڑکی کو گھٹیا ثابت کر کے گاہک کی توجہ زیادہ قیمتی کھڑکی کی طرف دلانا چاہتا تھا۔ اس سلسلے میں اس نے گاہک کے ''اعلیٰ ذوق'' کی تعریفیں بھی کیں۔

آیئے ہم اس طریقہ کار کو ''ترغیب اور تبدیل'' طریقے کا نام دیں' کیونکہ اس

میں گاہک کو پہلے متوجہ ہونے کی ترغیب دیجاتی ہے اور بعد میں اس کی دلچسپی کا رخ بدلا جاتا ہے۔ اس میں ایک طرح سے گاہکوں کو فریب بھی دیا جاتا ہے۔ کیونکہ اگر اشتہار میں یہ بھی بتا دیا جاتا کہ اس کھڑکھڑاتی سستی کھڑکی کے فریم کو وقتاً فوقتاً تیل دینے کی ضرورت بھی پیش آئے گی تو پھر کوئی صحیح الدماغ شخص سیلز مین کو اپنے گھر آنے کی زحمت نہ دیتا۔

ٹیلی وژن' اخبارات اور جرائد میں دیے جانے والے اکثر اشتہار مفید ہوتے ہیں۔ نئی مصنوعات اور خصوصی خدمات کے بارے میں گاہکوں کو معلومات ان اشتہاروں کے ذریعے ہی حاصل ہوتی ہیں' تاہم اشتہار بازی فریب کاری کا وسیلہ بھی بن سکتی ہے۔ چنانچہ یہ بات ہم سب کے لیے اہم ہے کہ ہم ان طریقوں سے آگاہ رہیں جن کے مطابق اشتہار گمراہ کن ہو سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں ان طریقوں کے تجزیے سے استدلال کے بعض پہلو نمایاں ہو سکتے ہیں۔

تکرار کا کردار

اشتہار بازی کا بنیادی اصول یہ ہے کہ اپنے پیغام کو دہرایئے اور دہراتے جایئے۔ تکرار بالآخر لاشعور پر اثر انداز ہوتی ہے۔ لوگوں کو پتہ بھی نہیں چلتا کہ کوئی بات ان کی ترجیحات اور آراء پر اثر انداز ہو رہی ہے۔ تکرار کے اثرات سے مکمل طور پر کوئی بھی محفوظ نہیں رہ سکتا۔ یہاں تک کہ اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ وہ اشتہاری علم سے بالکل متاثر نہیں ہوتا تو جب اسے دو برانڈز میں سے کوئی ایک چننا ہو تو وہ مانوس نام کا برانڈ عام طور پر چنتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جن اشیاء کو ہم جانتے ہوں' ان کو ہم ترجیح دیتے ہیں۔ غیر مانوس اشیاء سے ہم دور بھاگتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ اس امر کا فیصلہ کیونکر کیا جائے کہ کون سا برانڈ بہتر ہے؟ صارفین کی بہت سی انجمنیں اس سوال کا جواب تلاش کرنے کے لیے سائنسی ٹیسٹ لیتی ہیں۔ اکثر اوقات وہ اس نتیجے پر پہنچتی ہیں کہ کم مشہور اور کم قیمت مصنوعات ان مصنوعات سے بہتر ہیں جن کی بہت اشتہار بازی کی جاتی ہے اور جو مقبول بھی ہو جاتی ہیں۔

مصنوعات کی اشتہار بازی کے بہت سے طریقے ہیں۔ ان میں ٹیلی وژن' ریڈیو' اخبارات' رسائل' اشتہار بازی کی مہمیں اور تقاریب وغیرہ شامل ہیں۔ یہ سب

طریقے چند بنیادی اصولوں کے مطابق استعمال کیئے جاتے ہیں جن کا مقصد لوگوں کو متعلقہ مصنوعات خریدنے پر مائل کرنا ہوتا ہے۔

اشتہاروں کا تجزیہ کرنا

بعض اشتہار نقصان دہ بھی ہوسکتا ہے۔ یہاں ہم ایسی ہی ایک مثال پیش کرتے ہیں:

میک اپ کا بالکل انوکھا قصور

ہمارے ماہرین نے شب و روز کی محنت سے سکن ۔او۔کریم تیار کی ہے تاکہ آپ کے حسن و جمال کو نکھارا جا سکے۔ یہ کریم ایسے معاملات میں بھی آپ کی مدد کرتی ہے جہاں دوسری کریمیں ناکام ہو جاتی ہیں۔

ہم نے اس جادو اثر کریم کا نام ریڈی مائن کمپلکس رکھا ہے۔ یہ صرف ۲۱ روز میں آپ کے حسن کی تمام خامیاں دور کر دیتی ہے۔ اس کے روزانہ استعمال سے آپ کی پریشانیاں ہمیشہ کے لیے دور ہو جائیں گی۔

آیئے ہم اس اشتہار کا تجزیہ کریں۔ یہ بات ممکن ہے کہ اس کریم سے بعض یا شاید اکثر لوگوں کو فائدہ پہنچ سکے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جلد کے ماہرین نے اس کریم کو تیار کیا ہو۔ تاہم اشتہار میں شامل مبالغہ آمیز دعوؤں کے سبب ہم کو محتاط ہو جانا چاہیے۔ مثلاً اس میں کہا گیا ہے کہ ۲۱ دن کے اندر یہ کریم حسن کی تمام خامیاں دور کر دیتی ہے اور اس کے روزانہ استعمال سے پریشانیاں ہمیشہ کے لیے دور ہو جاتی ہیں۔ ہم کو یاد رکھنا چاہیے کہ ''ہمیشہ سے مراد عرصہ دراز ہے۔ یہ بھی دیکھئے کہ اس کریم کو روزانہ استعمال کرنا ہوگا تبھی اس سے ''ہمیشہ'' کے لیے فائدہ پہنچے گا۔ اس طرح گویا کریم بنانے والے ہم کو ہمیشہ کے لیے اپنا محتاج بنانے پر تلے ہوئے ہیں جن سے ان کو مستقل فائدہ بھی پہنچتا رہے گا۔

اگر جلد کے کسی ماہر یا ماہرین نے یہ کریم تیار کی ہے تو بھی ضروری نہیں کہ وہ اس اشتہار کے دعوؤں سے متفق ہوں۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ اشتہار میں دعوے تو شامل ہیں لیکن کریم تیار کرنے والے ماہرین کا نام بالکل نہیں دیا گیا۔ کیا ہم اس سے یہ نتیجہ اخذ

کریں کہ وہ ماہرین اپنی اس تخلیق پر شرمندہ ہیں؟ کیا ماہرین کا نام درج کرنے سے اشتہار زیادہ قابلِ اعتماد اور زیادہ متاثر کن نہیں ہوسکتا تھا؟

آیئے ہم فرض کرتے ہیں کہ یہ کریم جلد کے کسی ماہر نے تخلیق کی تھی، لیکن اشتہار کے مندرجات تحریر کرنے میں اس کا کوئی ہاتھ نہ تھا۔ اشتہار لکھنے والے پیشہ ور ماہرین ہوتے ہیں اور انکو اچھا معاوضہ بھی ملتا ہے۔ تاہم وہ عموماً ان مصنوعات کے بارے میں بے خبر ہوتے ہیں جن کے بارے میں وہ اشتہار لکھتے ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ اشتہار لکھنے والے مصنوعات کے بارے میں حقائق سے کم ہی دلچسپی لیتے ہیں۔ ان کی دلچسپی کا مرکز حقائق کی جادوگری ہوتا ہے تاکہ لوگوں کو کسی نہ کسی طور مصنوعات خریدنے پر مائل کیا جاسکے۔ خیر، ہم مذکورہ اشتہار کی طرف واپس آتے ہیں اور اس سلسلے میں یہ کہیں گے کہ اس میں شامل مبالغہ آرائیوں کے سبب ہم کو معلقہ کریم کے معاملے میں محتاط ہو جانا چاہیے۔ یہ کوئی عام سی کریم ہوسکتی ہے جس کے اجزائے ترکیبی میں ایک دو اشیاء کا اضافہ کرایا گیا ہو، تاہم مبالغہ آمیز دعوؤں کے سبب زیادہ قیمت پر اسکو فروخت کیا جارہا ہو۔

بعض لوگوں کو یہ بات سمجھنے میں مشکل پیش آتی ہے کہ کوئی شخص چھپے ہوئے الفاظ کے ذریعے جان بوجھ کر دوسروں کو گمراہ کرنے کی کوشش کرسکتا ہے۔ وہ عام طور پر سوال کرتے ہیں کہ ''حکومت اس قسم کی باتوں کو روک نہیں سکتی؟'' اکثر ملکوں میں حکومتوں نے اس قسم کی گمراہی کو روکنے کے لیے محکمے بنائے ہوتے ہیں، وہ شکایات موصول ہونے پر چھان بین کرتے ہیں لیکن عموماً اس قسم کے سرکاری محکمے سستی و کاہلی کا شکار ہوتے ہیں۔ ان کی طرف سے کوئی قدم اٹھانے سے پہلے ہی مصنوعات بنانے والے بہت سا فائدہ حاصل کر لیتے ہیں۔

لیبل پڑھنا

یہ بڑی مہارت کی بات ہے کہ صارفین مصنوعات کے لیبل کو اچھی طرح سے پڑھ سکیں۔ سرکاری قواعد وضوابط خوراک اور دواؤں کے تیار کنندگان کو لیبل پر اجزائے ترکیبی درج کرنے کی ہدایت کرتے ہیں۔ قواعد وضوابط کا تقاضا یہ بھی ہے کہ لیبل پر اجزائے ترکیبی کو وزن کے حوالے سے درج کیا جائے۔ بعض ملکوں میں اجزائے ترکیبی کی

حقیقی مقدار یا فی صد مقدار درج کرنا ضروری نہیں ہے۔ مثال کے طور پر سوپ کے اجزائے ترکیبی میں پانی، مشروب، سویابین آئل، آٹا، کریم اور نمک وغیرہ درج ہیں۔ ان میں پانی کی مقدار سب سے زیادہ ہوتی ہے لیکن لیبل پر یہ درج کرنا ضروری نہیں کہ آیا اس سوپ میں پانی کی مقدار پچیس فی صد ہے، پچاس فی صد ہے یا پچھتر فی صد ہے۔

فہرست میں نمک بھی شامل ہے، لیکن یہ ایک ایسی شے ہے جس سے ہائی بلڈ پریشر اور دل کے مریضوں کو دور رہنا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ ان کو فہرست سے یہ نہیں معلوم ہو سکتا کہ سوپ میں نمک کا تناسب کتنا ہے یا اس کی کتنی مقدار شامل کی گئی ہے۔

دنیا کے اکثر ملکوں میں صارفین کی انجمنیں حکومتوں سے مطالبہ کر رہی ہیں کہ دواؤں اور خوراک کے ڈبوں میں ان کے اجزائے ترکیبی کی مکمل فہرست درج کی جائے جن میں استعمال شدہ اشیاء کی مقدار بھی شامل ہو۔ علاوہ ازیں محتاط صارفین اب لیبل توجہ سے پڑھتے ہیں۔ مصنوعات تیار کرنے والے بہت سے اداروں نے بھی اپنے طور پر لیبل پر مکمل تفصیلات درج کرنا شروع کر دی ہیں۔ ان کو توجہ سے پڑھنا چاہیے۔ یہ ایک مہارت ہے اور اس کو فروغ دینا چاہیے۔

جعلی سائنسی اشتہار

ہم سب تسلیم کرتے ہیں کہ جدید سائنس سچی ہے اور قابلِ اعتماد بھی۔ اس لیے اگر سائنس کی بنیاد پر کچھ کہا جائے، تو لوگ آسانی سے اس پر یقین کرنے لگتے ہیں۔ کوئی سائنس دان اپنے شعبے سے متعلقہ کسی معاملے پر بات کرتا ہے تو اس کو ماہر تسلیم کرتے ہوئے ہم اس کی بات ماننے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ سائنس کی اس اچھی شہرت سے بعض اشتہار باز اپنے مقاصد کے لیے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔

> طبی طور پر قابل تعریف الیکٹرومایو کے ذریعے ہونے والے سائنسی تجربات سے یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ اپلانگو (دوا جس کا یہ اشتہار ہے) تکلیف دہ تھکے ہوئے پٹھوں کو فطرت کے مقابلے میں نصف وقت میں مکمل سکون مہیا کرتی ہے۔

اس اشتہار میں ''الیکٹرومائیوگراف'' کا لفظ بڑا متاثر کن ہے اور تجربے میں

اس کا استعمال تجربے کے سائنسی ہونے کا تاثر دیتا ہے۔ لیکن اصل میں یہ وہ آلہ ہے جو درد کے بجائے پٹھوں میں صرف برقی مقدار ناپنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کو طبی طور پر قابلِ تعریف قرار دینا بھی محض مبالغہ آرائی ہے۔ یہ بات ویسے ہی ہے جیسے آپ تھرمامیٹر کو طبی طور پر قابلِ تعریف قرار دینے لگیں۔

اچھا تو مذکورہ اشتہار کا اصل پیغام کیا ہے؟ دراصل اس میں کوئی قابلِ ذکر بات ہی نہیں۔ اس میں یہ کہا گیا ہے کہ اگر آپ تھکاوٹ کے بعد پٹھوں کو اپنے طور پر سکون ہونے دیں تو اس میں زیادہ وقت صرف ہوگا' جب کہ اپلائکو نامی دوا آدھے وقت میں یہ کام کردے گی۔ تاہم اشتہار میں یہ نہیں بتایا گیا کہ فطرت سکون عطا کرنے میں کتنا وقت لیتی ہے اور یہ دوا کس قدر وقت لے گی۔

فرض کیجیے کہ اپلائکو دوا کے استعمال کے بغیر فطرت دس منٹوں میں سکون دے دیتی ہے تو پھر اس دوا کو استعمال کر کے پانچ منٹوں میں سکون حاصل کرنے میں کوئی خاص فائدہ نہ ہوگا۔ اس صورت میں ہم اس دوا کے بغیر ہی گزارہ کر سکتے ہیں۔

ہاں اگر فطرت کو دو دن درکار ہوں تو پھر یہ دوا استعمال کرنے میں بہت فائدہ ہے' تاہم جس ''تجربے'' کے اشتہار میں حوالہ درج کیا گیا ہے وہ اس قدر مبہم ہے کہ بالکل بے فائدہ دکھائی دیتا ہے۔ سیدھی سی بات ہے کہ اشتہار دینے والے حقائق کی جادوگری سے کام لے رہے ہیں۔ یہ شبہ بھی جائز طور پر کیا جا سکتا ہے کہ ایسا کوئی تجربہ کبھی کیا نہیں گیا۔ محض فریب سے کام لیا جارہا ہے۔

غور فرمایئے کہ اشتہار میں ''ثابت'' کے لفظ کو کس طرح غلط انداز میں استعمال کیا گیا ہے۔ سائنس میں کسی حقیقت کا ثبوت حاصل کرنا بہت مشکل ہوتا ہے اور عموماً اس کے لیے بہت سی تحقیق کرنی پڑتی ہے۔ عام طور پر اس سے مراد یہ نہیں ہوتی کہ کوئی نکتہ ثابت کرنے کے لیے کسی آلے کے ذریعے ساری پیمائش پیش کر دی جائے' مذکورہ اشتہار میں یہ امکان کم ہی ہے کہ تجربے نے اس امر کو ثابت کر دیا ہو جس کا دعویٰ کیا گیا ہے۔ زیادہ امکان یہی ہے کہ تجربے سے ایسی کوئی بات سامنے نہ آئی ہوگی۔

اس بات پر بھی غور کیجیے کہ اشتہار میں ''طبی طور پر تصدیق شدہ تجربے کا حوالہ نہیں دیا گیا بلکہ محض یہ کہا گیا کہ تجربہ طبی طور پر قابلِ تعریف الیکٹرومائیوگراف کے ذریعے

کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحبان یہ بات تسلیم کر سکتے ہیں کہ یہ آلہ مفید اور اہم ہے۔ تاہم اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اس ''تجربے'' کو بھی مفید قرار دیں گے۔ ممکن ہے کہ اس آلے کو ناموزوں طور پر استعمال کیا گیا ہو یا اس صورتِ حال میں اس آلے کے استعمال کا جواز ہی نہ ہو۔

بسا اوقات فضول قسم کی چیزیں فروخت کرنے کے لیے اہم تجربوں کا حوالہ دے دیا جاتا ہے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ چند سال پہلے طویل عرصے تک تجربے کرنے کے بعد امریکن ڈینٹل ایسوسی ایشن نے اعلان کیا تھا کہ اگر ٹوتھ پیسٹ میں فلورائڈ شامل ہو تو وہ دانتوں کو خراب ہونے سے روکتا ہے۔ ٹوتھ پیسٹ بنانے والی ایک کمپنی پہلے ہی اس کمپاؤنڈ کو استعمال کر رہی تھی۔ چنانچہ اس نے ایسوسی ایشن کی دریافت کی بنیاد پر اشتہار بازی کی مہم شروع کر دی۔ اس کے اشتہاروں میں سائنسی دریافتوں کو زیادہ سے زیادہ استعمال کیا جانے لگا۔ یوں اس ٹوتھ پیسٹ کی فروخت میں بے پناہ اضافہ ہو گیا۔ یہ اشتہاری مہم اجتماعی حوالے سے مفید تھی' کیونکہ اس نے دانتوں کو خراب ہونے سے بچانے میں واقعی مدد مہیا کی' تاہم اشتہاروں میں اکثر اوقات جن مبہم سائنسی تجربوں کا حوالہ دیا جاتا ہے وہ یا تو بے معنی ہوتے ہیں یا انکا زیرِ بحث معاملے سے کوئی تعلق ہی نہیں ہوتا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ان تجربوں کا کوئی وجود ہی نہ ہو اور ان کو صرف اشتہار لکھنے والے کے تخیل نے تخلیق کیا ہو۔

تصدیق نامے

یہاں ہم ایک اشتہار پیش کرتے ہیں جس میں ایک مشہور فلمی ستارے نے نٹ پی نٹ بٹر (مونگ پھلی کا مکھن) کی تصدیق کی ہے:

> آپ کو پتہ ہے پال ویرانٹ کو ہم نے نٹ پی نٹ بٹر کے اشتہار میں کیسے پیش کیا تھا؟ جواب بہت آسان ہے۔ ہم نے اس کو معاوضہ ادا کیا تھا۔ ہم نے ویرانٹ صاحب کو بھاری معاوضے کی پیش کش کی تھی۔
>
> ''ارے کیا؟'' وہ چیخا تھا۔ ''تم لوگ مجھے بچوں کے مونگ پھلی کے

مکھن کی تصدیق کے لیے کہہ رہے ہو؟''
اس پر ہم نے معاوضہ بڑھا دیا۔ آخر کار رویرانٹ صاحب کو اشتہار میں کام کرنے پر راضی کر بھی لیا۔ اس نے بھرپور مسکراہٹ دی۔
''یہ مونگ پھلی کے مکھن کا ذائقہ تو نہیں ہوتا۔ بس مونگ پھلی کا مزہ ہی دیتا ہے۔ یہ تو زبردست مکھن ہے۔'' جیسا کہ ہم نے کہا نٹی ہی وہ مونگ پھلی کا واحد مکھن ہے جو بالغوں کے لیے تیار کیا گیا ہے۔ اسی لیے آپ اور آپ کے بچے سب لوگ اس کے دیوانے ہیں۔

یہ ایک چالاک قسم کا اشتہار ہے۔ اس میں یہ فرض کیا گیا ہے کہ جب کوئی مشہور اداکار مونگ پھلی کے مکھن کی اشتہار میں تصدیق کرتا ہے تو لوگوں کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مطلب نہیں کہ وہ مکھن واقعی اعلیٰ درجے کا ہے۔ مشہور لوگ عموماً معاوضہ حاصل کر کے اپنا نام استعمال کرنے کی اجازت دے دیتے ہیں۔ ان میں سے بعض وہ مصنوعات استعمال بھی نہیں کرتے جن کے اچھا ہونے کی وہ اشتہاروں میں تصدیق کرتے ہیں۔ لہٰذا ہم کو بھی اس بارے میں محتاط رہنا چاہیے۔

نٹی کا اشتہار لکھنے والوں نے ہماری اس احتیاط سے فائدہ اٹھایا ہے اور رویرانٹ صاحب کی تصدیق کو مزاحیہ انداز میں پیش کیا ہے۔ اصل میں انہوں نے اس امر کو تسلیم کیا ہے جس کو ہر کوئی جانتا ہے۔ اشتہار کا قاری اس کو پڑھ کر حیران ہو سکتا ہے اور یوں نٹی مکھن میں اس کی دلچسپی پیدا ہو سکتی ہے۔ اس طرح اشتہار کا مقصد حاصل ہو جاتا ہے...... البتہ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں نٹی مکھن کسی دوسرے برانڈ سے بہتر بھی ہے۔

اس اشتہار کے استدلال میں کوئی بنیادی غلطی نہیں، البتہ یہ اشتہار اس حماقت کی طرف اشارہ ضرور کرتا ہے کہ بعض لوگ کسی مشہور فلمی ستارے یا کھلاڑی کی زبانی کسی شے کی تعریف سن کر اس کو خریدنا شروع کر دیتے ہیں۔

بہتر / سستے اشتہارات

اب ہم ایک اور قسم کا اشتہار پیش کرتے ہیں:

برک اب پیش کرتے ہیں خریداری کے بہترین مواقع، ہر قسم کا اعلیٰ کوالٹی کا

فرنیچر روزانہ کشتیوں کے ذریعے، ٹرکوں کے ذریعے بلکہ ریل کے ذریعے بھی پہنچ رہا ہے۔ بے پناہ مال آنے کے سبب ہم اس کو فوراً بیچنے پر مجبور ہیں۔ پہلے آیئے اور پہلے بہتر انتخاب کیجئے۔ جلدی...... جلدی...... جلدی۔

اس اشتہار میں ایک دلچسپ صورتِ حال پیش کی گئی ہے۔ دکاندار کہتا ہے کہ وہ کشتیوں، ٹرکوں بلکہ ریل کے ذریعے بھی بہت سا فرنیچر منگوا رہا ہے اور اس کو سٹور کرنے کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ یوں وہ ''مجبور'' ہو گیا ہے کہ اشتہار کے ذریعے لوگوں کو اطلاع دے تا کہ وہ فوراً آ کر سستے داموں اعلیٰ فرنیچر خرید لیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ دکاندار اس قدر مال منگوا کیوں رہا ہے؟ یہ بھی دیکھئے کہ اشتہار میں اس نے فرنیچر کے بارے میں کوئی تفصیل درج نہیں کی۔ یہ کوئی سستے قسم کا سامان تو نہیں جو ماہ میں ٹوٹ پھوٹ جائے گا؟ شاید معاملہ یہی ہے۔

غیر محتاط قسم کے لوگ اس اشتہار کو پڑھتے ہی متعلقہ دکان کا رخ کر سکتے ہیں تا کہ وہ اس ''سنہری موقع'' سے فائدہ اٹھائیں، بلکہ یوں کہئے کہ دوسروں سے پہلے فائدہ اٹھائیں۔

اس قسم کی اشتہار بازی کی بنیاد مبالغہ آرائی اور جذبات کو اپیل کرنے پر ہے۔

ہندسوں کا کھیل

بعض اشتہار مندرجہ ذیل قسم کے ہوتے ہیں:

دھماکہ خیز کلیرنس سیل، تمام اشیاء پر ۲۵ فی صد زبردست رعایت، سنہری موقع سے فائدہ اٹھانے کا آخری موقع خیر، دکانداروں کے اس قسم کے دعوے کبھی کبھی درست بھی ہوتے ہیں۔ لیکن ایسے دکاندار بھی ہیں جو کلیرنس سیل کا اعلان کرنے سے پہلے قیمتیں بڑھا دیتے ہیں اور پھر اشتہار بازی کے ساتھ ہی قیمتوں میں کمی کا اعلان کر دیتے ہیں۔ یوں ''زبردست رعایت'' کے اعلانکے باوجود وہ اصل قیمتوں یا ان سے کسی قدر کم قیمت پر اشیاء کی فروخت شروع کر دیتے ہیں۔ اشتہار پڑھ کر خریداری کے لیے آنے والے کئی لوگ یہ جان جاتے ہیں کہ پرانے لیبل پر درج قیمت پر نئی قیمت درج کی گئی تھی اور اب نئی قیمت پر ڈسکاؤنٹ دیا جا رہا ہے۔

بعض سٹور محض یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ کلیرنس سیل میں وہ تمام اشیاء ۲۵ فی صد رعایت پر فروخت کرتے ہیں' لیکن اس دعویٰ کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔ خریدار بھی دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے کہ جو اشیاء وہ خرید رہے ہیں' سیل سے پہلے ان کی قیمت کیا تھی اور رعایت کے اعلان کے بعد اب کیا ہے۔

جعلی قیمتیں یہ تاثر دیتی ہیں کہ دکانداروں کے دعوے درست ہیں' لیکن اکثر دکاندار کلیرنس سیل کی آڑ میں صرف ہندسوں کی شعبدہ کاری سے کام لیتے ہیں۔ وہ قیمتوں میں حقیقی طور پر کمی نہیں کرتے اور اگر کرتے بھی ہیں تو یہ ان کے دعویٰ کے مقابلے میں بہت کم ہوتی ہے ہمارے ہاں اب اس قسم کی کلیرنس سیل کا رواج بہت ہو چکا ہے۔ خاص طور پر فروری اور اگست کے مہینوں میں بازاروں میں جا بجا آپ کو کلیرنس سیل کے اشتہار دکھائی دیتے ہیں جن میں قیمتوں میں دس فی صد سے لے کر پچاس فی صد تک بلکہ کبھی کبھی اس سے بھی زیادہ شرح سے کمی کی خوش خبری دی جاتی ہے۔ اس اعلان کے ساتھ ہی لوگ جوق در جوق دکانوں کا رخ کرتے ہیں۔

من موہنی زبان

اشتہار لکھنے والے کا اہم ترین کام یہ ہوتا ہے کہ وہ کسی عام سی شے کو بھی قابلِ قدر اور پرکشش بنا دے۔ اس لیے وہ اشتہاروں میں جذباتی کشش رکھنے والے الفاظ بے دریغ استعمال کرتا ہے۔ مثلاً بیڈروم کے فرنیچر کا اشتہار لکھتے ہوئے وہ ہمیں بتاتا ہے کہ ''یہ انوکھا اور بے مثال فرنیچر آپ کی خواب گاہ کو خواب نگر میں تبدیل کر دے گا۔ اس فرنیچر کو ''جدید'' نہ کہیے۔ یہ تو خواب گاہ کی سجاوٹ اور آسائش کا بالکل نیا تصور ہے جو پہلی بار آپ کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔''

اچھا' یہ ممکن ہے کہ یہ بیڈروم سیٹ واقعی بہت خوبصورت ہو' لیکن اس کے باوجود وہ عام سا فرنیچر ہو سکتا ہے...... بلکہ یوں کہیے کہ گھٹیا کوالٹی کا فرنیچر ہو سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر اشتہار لکھنے والا جذباتی قسم کے الفاظ استعمال نہ کرے تو وہ لوگوں کی توجہ حاصل نہیں کر سکتا۔ اس کی مجبوری ہے کہ وہ ''منہ میں پانی لانے والے الفاظ'' استعمال کرے۔ شاید اس حد تک معاملہ قابلِ برداشت رہتا ہے لیکن جب وہ صریحاً فریب دینے سے کام

لینے لگتا ہے تو پھر اس کا رویہ قابلِ اعتراض ہو جاتا ہے۔

''منہ میں پانی لانے کا طریقہ'' طریقہ کار ڈاک کے ذریعے کی جانے والی اشتہار بازی میں خاصا استعمال کیا جاتا ہے۔ ان اشتہاروں میں متعلقہ مصنوعات کی تصاویر بھی عام طور پر شامل کر دی جاتی ہیں اور یہ تصویریں حقیقی مصنوعات کی عکاسی کرنے کے بجائے بہت پر کشش ہوتی ہیں۔ دور بیٹھے لوگ جب اشتہار سے متاثر ہو کر وہ شے منگواتے ہیں تو اکثر اوقات ان کو مایوسی ہوتی ہے کیونکہ وہ شے تصویر دیکھ کر پیدا ہونے والی توقعات سے بہت مختلف ہوتی ہے۔

ڈرانے کا ہتھکنڈہ

بعض اشتہاروں میں لوگوں کو خریداری پر آمادہ کرنے کے لیے خوف زدہ کرنے کے طریقے بھی استعمال کیے جاتے ہیں۔ ان اشتہاروں میں کچھ صاف اور کبھی مبہم انداز میں یہ پیغام دیا جاتا ہے کہ اگر انہوں نے یہ شے استعمال نہ کی تو ان کو بہت سا نقصان برداشت کرنا پڑے گا۔ ایسا ہی ایک اشتہار ہم یہاں درج کر رہے ہیں۔

> نزلہ زکام سے بچئے۔
>
> پہلی چھینک یا ناک سڑکنے کا انتظار نہ کیجئے' فوراً رڈسکو استعمال کیجئے۔ خطرے کے خاتمے تک وقفے وقفے سے غرارے کرتے رہیے۔
>
> رڈسکو لاکھوں کروڑوں کی تعداد میں جراثیم کو ہلاک کرتی ہے۔ بارہ سالہ تجربات سے پتہ چلتا ہے کہ دن میں دو بار رڈسکو استعمال کرنے والے نزلہ زکام سے محفوظ رہتے ہیں یا ان پر اس بیماری کا حملہ شدید نہیں ہوتا۔

یہ اشتہار پڑھ کر خیال گزرتا ہے کہ ''ممکن ہے کہ یہ اشتہار درست ہو۔ اس بات کا پتہ کیسے چلے گا؟'' منطقی استدلال سے کام لے کر ہم اس سوال کا جواب تلاش کر سکتے ہیں۔

اشتہار میں یہ کہا گیا ہے کہ ہمیں پہلی چھینک یا ناک سڑکنے کا انتظار نہ کرنا

چاہیے۔ بلکہ فوراً رڈسکو سے غرارے شروع کر دینے چاہئیں اور جب تک خطرہ موجود رہے' غرارے وقفے وقفے سے جاری رکھنے چاہئیں' لیکن سوال یہ ہے کہ جب تک چھینک نہ آئے یا ناک نہ سڑ کے تو ہم کو بیماری کے خطرے کا اندازہ کیونکر ہوگا۔ اشتہار کا پیغام کیا یہ ہے کہ خطرے کی کسی علامت کے بغیر ہی ہمیں فوراً رڈسکو کا استعمال شروع کر دینا چاہیے۔ خیر ہم کو یہ پتہ کیسے چلے گا کہ خطرہ ختم ہو گیا ہے۔ شاید کبھی بھی نہیں۔ گویا ہمیں ساری زندگی رڈسکو خریدتے اور غرارے کرتے رہنا چاہیے۔

یہ بھی دیکھئے کہ اس اشتہار میں سائنس کا رعب بھی ڈال دیا گیا ہے۔ چنانچہ ہمارے علم میں یوں اضافہ کیا گیا ہے کہ بارہ سالہ تجربات نے اس دوائی کی افادیت کو ثابت کر دیا ہے' لیکن طویل عرصے پر پھیلے ہوئے ان تجربات کی نوعیت کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا۔ کیا یہ تجربات ممتاز سائنس دانوں نے کئے تھے...... تجربات ہوئے بھی تھے یا نہیں؟ جن فائدوں کا ذکر کیا گیا ہے' ان کے لئے کوئی معروضی شہادت موجود ہے یا وہ متعلقہ فرم کے ملازمین یا اشتہار لکھنے والوں کے ذہن کی اختراع ہیں؟ کیا محض نمکین پانی سے کئے جانے والے غرارے بھی اتنے ہی موثر نہیں ہوتے؟...... یا شاید اس دوا سے زیادہ موثر نہیں ہوتے؟

لاشعوری پیغامات

آج کے زمانے میں اکثر اشتہارات پیشہ ور تخلیقی ماہرین کی ٹیمیں تیار کرتے ہیں۔ ان میں ادیب' فوٹو گرافر' فن کار' کمپوزر' پولسٹرز' معیشت دان اور یہاں تک کہ ماہرین نفسیات اور ماہرین بشریات تک شامل ہوتے ہیں۔ یہ صاحبان مارکیٹ کا مطالعہ کرتے ہیں۔ صارفین کی ترجیحات کا جائزہ لیتے ہیں' لوگوں کو مصنوعات خریدنے پر آمادہ کرنے کے نئے نئے طریقے وضع کرتے ہیں اور معیشت کے امور پر نظر رکھتے ہیں۔ ان سب کاوشوں کا ایک ہی مقصد ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ایسے نئے طریقے نکالے جائیں جن سے لوگوں کو وہ مصنوعات خریدنے کی ترغیب دی جا سکے جن کی وہ اشتہاری مہم چلاتے ہیں۔

اس قسم کا اکثر کام معاشی فروغ میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ لیکن اس میں چند خرابیاں بھی ہیں۔ خرابیاں اس وقت پیدا ہوتی ہیں جب نقصان دہ یا فضول قسم کی

مصنوعات کو فروغ دینے کے لیے اشتہار بازی کی جاتی ہے۔ مارکیٹ میں فروخت ہونے والی دو بہت خطرناک مصنوعات سگریٹ اور الکحلی مشروبات ہیں۔ سگریٹ نوشی سے گلے کا کینسر اور دوسری بیماریاں پیدا ہوتی ہیں جب کہ الکحلی مشروبات کئی قسم کی خرابیوں کا باعث بنتے ہیں۔

پاکستان میں شراب پر تو خیر کئی برسوں سے مکمل پابندی عائد ہے۔ اس لیے اس کے اشتہاروں کا مسئلہ پیدا نہیں ہوتا۔ سگریٹ کے اشتہار ہمارے ہاں البتہ ابھی تک ٹیلی وژن پر دکھائے جاتے ہیں۔ دنیا کے بہت سے ملکوں میں شراب اور سگریٹ کے اشتہار ٹیلی وژن پر نہیں دکھائے جاسکتے، لیکن یہ مصنوعات بنانے والی کمپنیاں اشتہار بازی کا کوئی نہ کوئی طریقہ تلاش کر لیتی ہیں۔ اس سلسلے میں لاشعوری طریقوں کا استعمال خاصا عام ہے۔ ان طریقوں کے ذریعے لوگوں کو براہِ راست پیغام نہیں دیا جاتا۔ یوں انہیں اکثر اوقات معلوم بھی نہیں ہوتا کہ وہ کوئی پیغام وصول کر رہے ہیں۔

سگریٹ اور شراب بنانے والے ادارے اب کھیلوں کی بڑی بڑی تقریبات کو سپانسر کرتے ہیں۔ ان میں موٹروں کی دوڑ، گھڑ سواری، باولنگ، گالف، کرکٹ اور ہاکی وغیرہ کے کھیل عام طور پر شامل ہوتے ہیں۔ ٹورنامنٹ یا کھیلوں کی تقریبا کا نام سگریٹ یا اس کے بنانے والے ادارے کے نام پر رکھا جاتا ہے۔ پھر بڑے بڑے بینر بنائے جاتے ہیں جن میں ٹورنامنٹ اور سگریٹ کے نام درج ہوتے ہیں۔ ٹیلی وژن پر جب یہ کھیل دکھائے جاتے ہیں تو یہ نام بھی سکرین پر آجاتے ہیں۔

اس طرح ٹورنامنٹ کی سرپرستی کرنے والے سگریٹ کو ٹیلی وژن پر مفت کوریج مل جاتی ہے۔ ساتھ ہی لوگوں کی خوشنودی بھی اس کو حاصل ہو جاتی ہے، کیونکہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ سگریٹ بنانے والی یہ کمپنی کھیلوں کی سرپرستی کر کے سماجی خدمت کر رہی ہے۔ نوجوان کھیلوں کے پروگرام زیادہ دلچسپی سے دیکھتے ہیں۔ وہ سگریٹ کے نام سے مانوس ہو جاتے ہیں۔ کبھی سگریٹوں میں ان کو دلچسپی پیدا ہوتی ہے تو وہ اس خاص برانڈ کے سگریٹ منتخب کرنے کی طرف زیادہ مائل ہوتے ہیں۔ اس طرح کی اشتہار بازی کا ایک لاشعوری پیغام یہ ہے کہ اگر سگریٹوں کو بہترین کھلاڑی قبول کرتے ہیں تو پھر وہ دوسروں کے لیے برے کیسے ہو سکتے ہیں۔

کسی سٹیڈیم کی پچھلی دیوار پر بھی آپ کو کسی سگریٹ یا شراب کے کسی برانڈ کا نام لکھا ہوا نظر آ سکتا ہے۔ تماشائی اس کو دیکھ سکتے ہیں اور کبھی کبھی ٹیلی وژن کیمرہ بھی وہاں تک پہنچ سکتا ہے۔ اس طرح بھی یہ نام لاکھوں انسانوں تک پہنچ جاتا ہے۔

ٹیلی وژن کا کوئی سا اشتہار لیجئے اور اس کے لاشعوری پیغام کا تجزیہ کیجئے۔ مثلاً کسی بیئر کا اشتہار یوں ہوسکتا ہے کہ کسی مشہور ٹیم کے کھلاڑی کٹھن مقابلے کے بعد بیئر پیتے ہوئے ستا رہے ہیں۔ بیئر کا نام تمام بوتلوں پر نمایاں دکھائی دے رہا ہے اور لیبلوں کا رُخ کی طرف ہے۔ علاوہ ازیں یہ نام اشتہار میں کئی بار بولا جاتا ہے۔ اشتہار میں ہر شے کا مقصد لاشعوری پیغام پہنچانا ہوتا ہے اور اس کے مخاطب خاص طور پر نوجوان ہوتے ہیں کیونکہ ان کے کچے ذہنوں کو متاثر کرنا نسبتاً آسان ہوتا ہے۔ پیغام کچھ یوں ہوتا ہے کہ ''کھیل (یا پارٹی) کے بعد جواں مرد بیئر پی کر آرام کرتے ہیں۔ یہ ہے وہ ماڈل جس کی آپ کی نقل کرنی چاہیے۔''

عام تاثر کے برخلاف بیئر بے ضرر مشروب نہیں ہے۔ کافی مقدار میں اسے پی لیا جائے تو نشہ طاری ہو جاتا ہے۔ بیئر کے نشے میں کئی ڈرائیوروں سے حادثے ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا ہمیں بیئر پینے کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے اور اس کے اشتہار ٹیلی وژن پر پیش کرنے کی اجازت ہونی چاہیے؟

لاشعوری اشتہار اب فلموں کے ذریعے پیش کیے جانے لگے ہیں...... اداکاروں کو مختلف مصنوعات استعمال کرتے ہوئے دکھایا جاتا ہے اور ان مصنوعات کے نام نمایاں انداز میں سامنے لائے جاتے ہیں' مثلاً ہیرو سامنے آتا ہے اور شراب کی بوتل کھول کر پسندیدگی کے انداز میں جام منہ کو لگاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی شراب کی بوتل کا لیبل کیمرے کی روشنی میں آ جاتا ہے۔ گویا اس کا تحت الشعوری پیغام یہ ہوا کہ ہیرو صاحب فلاں شراب پیتے ہیں' لہٰذا دوسروں کو بھی ان کی پیروی کرنی چاہیے' عموماً اس قسم کے اشتہارات کے لیے متعلقہ مصنوعات بنانے والے فلمسازوں کو معاوضہ ادا کرتے ہیں۔

اشتہاروں میں تصاویر بھی لاشعوری پیغام دینے کے لیے استعمال کی جاتی ہیں' چنانچہ سگریٹوں کے اشتہار آپ نے دیکھے ہوں گے۔ ان میں عموماً کسی خوبصورت دوشیزہ کو مختصر لباس زیب تن کیے' سمندر کے کنارے بیٹھے دکھایا جاتا ہے۔ پس منظر میں نیلگوں

سمندر اور شاندار کشتیاں نظر آتی ہیں...... اور ہاں قریب ہی چند کھلنڈرے بھی دکھائے جاتے ہیں جو اس حسینہ کی توجہ کے طالب ہوتے ہیں۔ جب کوئی جواں عورت یہ اشتہار دیکھتی ہے تو اس کے دل میں امنگ پیدا ہوتی ہے کہ کاش میری زندگی بھی اس جیسی ہوتی۔ لیکن کم بخت سگریٹ یہاں بھی موجود ہوتا ہے اور وہ اس ماڈل کی نازک انگلیوں میں سے توجہ کھینچ لیتا ہے۔ ساتھ ہی لاشعوری پیغام بھی پہنچ جاتا ہے...... سبھی حسین لوگ سگریٹوں کے شیدائی ہوتے ہیں۔

۱۹۹۰ء میں امریکہ کے صحت اور انسانی خدمات کے امور کے وزیر، ڈاکٹر لوئس سلی وان، نے کئی سگریٹ ساز کمپنیوں پر یلغار کر دی تھی۔ وہ کھیلوں کی تقریبات کی سرپرستی کے ذریعے اشتہار بازی کے مخالف تھے اور ساتھ ہی ساتھ ان کمپنیوں کی طرف سے کئی نئے برانڈ کے سگریٹوں میں سے ایک کے اشتہار کے ہدف سیاہ فام نوجوان تھے اور دوسرے اشتہار میں جواں سال کارکن عورتوں کو ہدف بنایا گیا تھا۔ نئے برانڈ کے سگریٹ متعارف کروانے کی ڈاکٹر سلی وان کی طرف سے مخالفت کا نتیجہ یہ ہوا کہ متعلقہ کمپنی نے ایک برانڈ بند کر دیا اور دوسرے برانڈ کی تیاری ملتوی کر دی۔ اگر یہ منصوبے جاری رہتے تو ہدف بننے والے گراہوں کی توجہ حاصل کرنے کے لیے لاشعوری انداز میں پیغام دینے والے اشتہار بھی ضرور پیش کئے جاتے۔

اشتہاری صنعت لاشعوری پیغامات دینے کے طریقوں کی تلاش میں رہتی ہے۔ مثلاً چند سال پہلے ایک تجربہ یہ کیا گیا کہ فیچر فلم کے دوران ایک پراڈکٹ کا نام اور اس کی تصویر کی جھلک سکرین پر دکھائی گئی۔ یہ جھلک اس قدر مختصر وقت کے لیے تھی کہ شعوری سطح پر اسکو دیکھنا دشوار تھا۔ بس وہ ایک جھلک ہی تھی، یہ تجربہ کرنے والوں کا خیال یہ تھا کہ اس طرح سے فلمیں اور ٹیلی وژن دیکھنے والوں تک پیغام پہنچایا جا سکتا ہے۔ خوش قسمتی سے یہ تجربہ کامیاب نہ ہوا۔ لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اشتہاری ماہرین ہر وقت نت نئے طریقوں کی جستجو میں رہتے ہیں۔ وہ ضرر رساں اشتہاروں کو زیادہ سے زیادہ موثر بنانے کے طریقے ڈھونڈ ہی لیں گے۔ ان کی کامیابی سے ہماری انفرادی آزادی کو نقصان پہنچے گا۔

منطقی استدلال کے ذریعے ہم لاشعوری پیغامات کا توڑ نہیں کر سکتے۔ وجہ یہ ہے

کہ وہ فکر کی شعوری سطح سے بچ کر ذہن کی گہرائی میں اتر جاتے ہیں۔ پھر لاشعوری احساسات کے ذریعے متعلقہ مصنوعات کے بارے میں ہماری رائے بناتے ہیں۔ البتہ اگر عام لوگ اشتہاروں میں سے لاشعوری پیغامات کو شناخت کرنا اوران کا تجزیہ کرنا سیکھ جائیں تو پھر وہ اس قسم کی مہموں سے امکانی نقصان دہ اثرات سے نسبتاً محفوظ رہ سکتے ہیں۔

دیگر گمراہ کن اشتہارات

گمراہ کن اشتہاروں کی کوئی کمی نہیں۔ دنیا میں ہر جگہ اس قسم کی اشتہاری زبان ہوتی ہے۔ پاکستان کے اردو اخبارات میں ''ضرورتِ رشتہ'' کے اشتہار خاص طور پر گمراہ کن قسم کے ہوتے ہیں۔ اس میں شادی کے خواہش مند ہر مرد کو خوش حال' کامیاب فرد' خاندانی اور خوبرو بنایا جاتا ہے جبکہ ہر دوشیزہ کو خوبصورت' سمارٹ' سلیقہ شعار اور خاندانی کے روپ میں پیش کیا جاتا ہے۔ جائیداد کی خرید وفروخت سے متعلق اشتہارات بھی ایک سروے کے مطابق عموماً گمراہ کن ہوتے ہیں۔ ان میں حقائق کو چھپایا جاتا ہے اور یا پھر توڑ مروڑ کر پیش کیا جاتا ہے۔

گمراہ کن اشتہارات کی چند مثالیں یہاں ہم امریکن صارفین کی انجمن کے جریدہ Consumer Reports سے پیش کرتے ہیں۔

(۱) ایک اشتہار میں بڑے بڑے حروف میں درج ہے کہ ''ہم یہ شاندار نیوی گیٹر' قسم کی ایل سی ڈی گھڑی صرف ۲ ڈالر میں کیوں فروخت کر رہے ہیں؟ یہ کوئی چھپائی کی غلطی نہیں ہے۔''

جب اس اشتہار کی تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ یہ ایک سادہ سی ایل سی ڈی گھڑی تھی نہ کہ نیوی گیٹر گھڑی' جیسا کہ دعویٰ کیا گیا تھا۔

(۲) ایک بڑے کرسمس درخت کا اشتہار دیا گیا تھا جس پر ۵۲ انچ کے الفاظ درج تھے۔ اس سے یہ تاثر ملتا تھا کہ یہ درخت ۵۲ انچ لمبا ہے۔ لیکن اشتہار میں نیچے چھوٹے چھوٹے حروف میں بتایا گیا تھا کہ یہ اسکی لمبائی نہیں بلکہ محیط کی پیمائش ہے۔ ۵۲ انچ کے گھیر میں اسکی اصل لمبائی صرف ۲۶ انچ تھی۔ یوں اس کو کرسمس درخت کے طور پر استعمال کرنے کے بجائے زیادہ مناسب بات یہ تھی کہ اس کو بچوں کا کھلونا سمجھا جائے۔

(۳) ایک اشتہاری کارڈ لوگوں کو بھیجا گیا جس پر وہ عبارت درج تھی کہ ''مبارک باد! ہماری قومی پروموشن میں حصہ لینے کے سبب آپ کو مندرجہ ذیل چار میں سے ایک ایوارڈ کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔'' یہ چار ایوارڈیوں تھے (۱) ایک کار (۲) ۵۰۰۰ ڈالر کا چیک (۳) ایک فرکوٹ اور (۴) ایک ہزار ڈالر کا بونڈ۔ مزید معلومات حاصل کرنے کے لیے کارڈ پر ایک ٹیلی فون نمبر درج تھا۔

اس نمبر پر فون کرنے سے معلوم ہوا کہ پوسٹ کارڈ پر درج اطلاع محض فراڈ تھی۔ اصل میں وہی لوگ ایوارڈ کے انتخاب میں شریک کئے جائیں گے جو کارڈ بھیجنے والی کمپنی کی ۲۹۹ ڈالر کی مصنوعات خریدیں گے۔ کارڈ پر اس امر کا کوئی اشارہ درج نہ تھا۔ گویا کار جیتنے کا امکان چھ لاکھ میں سے صرف ایک تھا۔

جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں اس قسم کی اشتہاری فریب کاری کا رواج کم وبیش ہر جگہ ہے۔ ایک مقبول اردو اخبار میں شائع ہونے والا مندرجہ ذیل اشتہار ملاحظہ کیجئے۔

ڈرائیونگ سیکھیے۔

مناسب فیس خود تجویز کریں۔ سٹوڈنٹس رعایت' پک ڈراپ ایمرجنسی مرمت معلومات' تعلیم یافتہ اور بااخلاق انسٹرکٹرز۔

اس اشتہار میں رابطے کے لیے دو فون نمبر بھی درج تھے۔ اس میں کشش کی بات یہ تھی کہ فیس' ڈرائیونگ سیکھنے کے امیدواروں کو خود تجویز کرنا تھی۔ کم ازکم اشتہار میں یہی کہا گیا تھا۔ ایک خاتون بتاتی ہیں کہ اشتہار دیکھ کر انھوں نے فون کیا اور معلومات حاصل کرنا چاہیں تو سب سے پہلے ان کو یہ بتایا گیا کہ ڈرائیونگ سیکھنے کی فیس پانچ ہزار روپے سے ایک پیسہ کم نہ ہوگی۔

ایسا ہی ایک اور اشتہار حسبِ ذیل تھا:

مناسب فیس میں مہارت کے ساتھ ڈرائیونگ سکھا کر خواتین کو ان کی ادا شدہ فیس کا نعم البدل فراہم کرنے والا ادارہ۔

اس اشتہار کے ساتھ بھی رابطے کے لیے فون نمبر دیا گیا تھا۔ درج شدہ فون نمبر پر رابطہ کر کے جب یہ پوچھا گیا کہ یہ ادارہ خواتین کو ان کی ادا ز شدہ فیس کا نعم البدل کس طرح فراہم کرتا ہے تو جو خاتون ادارے کی ترجمان تھیں' وہ نعم البدل کے مفہوم سے بھی

بے خبر نکلیں۔

ہمارے اخباروں میں اب ٹیوشن کے اشتہار بھی شروع ہو گئے ہیں۔اس سلسلے میں ایک اشتہار دیکھئے۔

''ایک کال سے تمام تعلیمی مسائل حل، تمام امتحانات کی سپیشل تیاری۔بس ایک بار رابطہ کیجئے اور پھر دیکھئے ہماری تدبیر''۔ غالباً اس اشتہار پر تبصرہ کرنے کی ضرورت نہیں۔آپ جان گئے ہوں گے کہ جو لوگ محض ایک کال پر ہر قسم کے تعلیمی مسائل حل کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں، وہ کس قدر مبالغہ آرائی سے کام لے رہے ہوں گے۔

یہاں گمراہ کن اشتہارات کی اور بھی بہت سی مثالیں درج کی جاسکتی ہیں۔لیکن آپ کو خود بھی اس قسم کے کئی اشتہار پڑھنے یا دیکھنے کا موقع ملا ہو گا۔

چند اہم نکات

اس کتاب میں ہم نے استدلال میں مغالطے پیدا کرنے والے بہت سے منابع کی نشاندہی کی ہے۔ بعض قارئین کے دل میں اس سے انسانی علم کے بارے میں زیادہ ہی شکوک وشبہات پیدا ہو سکتے ہیں۔ وہ پوچھیں گے کہ پھر آخر کس قدر علم واقعی سچا ہے۔ اس قسم کا تکنیکی رویہ حقیقت پسندانہ نہ ہوگا۔ کیونکہ فیصلے کرنے سے پہلے اگر ہم کو ہر واقعہ اور ہر نتیجہ کی چھان پھٹک کرنی پڑے تو پھر ہم آگے کی طرف قدم نہیں اٹھا سکیں گے۔ خوش قسمتی سے روزمرہ کے مسائل حل کرنے کے لیے ہم جس سوچ بچار سے کام لیتے ہیں اس کا بیشتر حصہ بہت موثر ہوتا ہے اور اس میں بنیادی قسم کے ردوبدل کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

روزمرہ کا موثر استدلال

ذرا دیکھئے تو زبان کے ذریعے ابلاغ کی بے حد پیچیدہ مہارت سیکھتے ہوئے بچے کس قدر موثر انداز میں استدلال کرتے ہیں۔ جو چھوٹی ''غلطیاں'' وہ کرتے ہیں' اصل میں وہ مشاہدات کے درست استخراج ہیں۔ ان کی زبان سیدھی سادھی ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ گرائمر کی الجھنوں اور باریکیوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ جب ان کا مشاہدہ بڑھتا ہے اور استقرائی استدلال کی صلاحیت فروغ پاتی ہے تو پھر وہ ان الجھنوں اور باریکیوں پر بھی عبور حاصل کرتے جاتے ہیں۔ یوں وہ مختلف الفاظ کے مختلف معانی پر توجہ دیتے ہیں۔ محاورے کے معنی کا تعین اس کے سیاق وسباق سے کرنا سیکھتے ہیں اور جدید زبان کی بہت سی دیگر پیچیدگیوں پر گرفت حاصل کرتے ہیں۔ اصل میں ہم سب اسی انداز کے اعلیٰ درجے کے استدلال اور علم کے ذریعے روزمرہ کی زندگی سے مطابقت

پذیری سیکھتے ہیں۔ یہ عمل اس قدر خودکار ہوتا ہے کہ ہم ان ذہنی افعال سے بے خبر رہتے ہیں جن کے ذریعے یہ عمل جاری رہتا ہے۔

اگر ہمیں اپنے استدلال میں شامل ہر واقعہ اور نتیجہ کی جانچ پڑتال اور تصدیق کرنی پڑے، تو ہم ذہنی طور پر ماؤف ہو کر رہ جائیں۔ لہٰذا یہ خاص سوال کہ ''آپ کو کیسے پتہ ہے کہ یہ رات ہے'' صرف خاص مواقع تک ہی محدود رہتا ہے۔ ان مواقع میں بحث و مباحثے اور وہ لمحات شامل ہیں جب تضادات نمایاں ہوتے ہیں۔ ہاں کوپرنیکس اور گلیلیو جیسے بڑے مفکر کبھی کبھار ''تسلیم شدہ'' حقائق کے بارے میں سوالات اٹھاتے ہیں اور ان کا جواب بھی دیتے ہیں۔ اس طرح انسانی علم تیزی سے آگے بڑھتا ہے۔

تجریدات کی دنیا

دس ہزار سال پہلے ہمارے آباؤ اجداد چھوٹے چھوٹے دور افتادہ گروہوں کی صورت میں زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کے مسائل ٹھوس اور فوری قسم کے ہوتے تھے۔ فطرت کی قوتوں کے ساتھ ان کا براہِ راست مقابلہ رہتا تھا۔ پیٹ بھرنے کے لیے خوراک، پناہ کے لیے جگہ اور بہت سے خطرات کے مقابلے میں زندہ رہنا ان کے سب سے بڑے مسائل تھے۔

اس کے برعکس ہماری آج کی دنیا میں کئی شعبوں اور پیشوں میں بہت سے تجریدی تصورات پر عبور ناگزیر ہے اور یہ ان تصورات سے بالکل مختلف ہیں جن سے ہمارے آباؤ اجداد کو سابقہ پڑتا تھا۔ ذرا اندازہ کیجیے کہ کوئی بڑا پل بنانے کے لیے ایک انجینئر کو کس قسم کے تجریدی مسائل حل کرنے پڑتے ہیں، یا ڈاکٹر کو مرض کی تشخیص میں یا کسی کامیاب بنک کے مینجر کو اپنے کاروبار کا انتظام کرنے کے لیے کس قدر پیچیدہ تجریدی تصورات سے کام لینا پڑتا ہے۔ شاعر تجریدی استعارے تخلیق کرتا ہے اور وکیل عدالت میں اپنا کیس پیش کرنے کی تیاری میں کئی تجریدی تصورات سے عہدہ برآ ہوتا ہے۔ استاد بھی اپنا لیکچر تیار کرتے ہوئے اس مرحلے سے گزرتا ہے۔ مزید براں جمہوری معاشرے کے شہری ہونے کی حیثیت سے ہم سب کو کئی تجریدی پالیسیوں کے بارے میں اپنی رائے قائم کرنا پڑتی ہے۔ ان میں بجٹ، ماحول، تعلیم، امن اور جنگ سے متعلق پالیسیاں شامل

ہوتی ہیں۔

یوں ہماری دنیا میں تجریدات کے گھیر میں آ کر حقائق دھندلا جاتے ہیں۔ استدلال کے مقدمات درہم برہم ہو جاتے ہیں اور ہم ایسے نادرست نتائج تک جا پہنچتے ہیں جو مفید ہونے کے بجائے الٹا نقصان دہ ثابت ہوتے ہیں۔

ہم یہ تجریدی علم مختلف اطلاعاتی وسائل سے حاصل کرتے ہیں۔ یہ وسائل دور دراز کے واقعات سے متعلق بالواسطہ اطلاعات ہم تک پہنچاتے ہیں۔ اسی طرح دوسروں کے مشاہدے میں آنے والے اعداد و شمار بھی ہم تک پہنچتے ہیں۔ ہم اپنی اکثر تجریدی معلومات مدرسوں میں اساتذہ سے حاصل کرتے ہیں۔ ہم کتابیں، اخبارات اور رسائل پڑھتے ہیں جو تجریدی تصورات سے لدے پھندے ہوتے ہیں۔ فلموں اور ٹیلی وژن کے ذریعے ہر قسم کے لاشعوری پیغام ہم تک پہنچتے ہیں۔ زیادہ طاقتور کمپیوٹروں اور زیادہ تجریدی اطلاعات کے ذریعے اطلاعاتی انقلاب پھیلتا ہی جا رہا ہے۔

بعض استدلالی غلطیوں کے مضمرات آج کی دنیا میں زیادہ خطرناک اور مہنگے ہوتے جا رہے ہیں۔ ہم نے اس کتاب میں تھری مائل آئی لینڈ کے نیوکلیئر پلانٹ کے حادثے کا ذکر کیا تھا جو ایک غلط فیصلے کا نتیجہ تھا۔ یقین کیجیے کہ اس ایک غلطی کے نتیجے میں ۳۰۰۰۰۰۰۰۰۰ روپے کا نقصان ہوا تھا۔ الاسکا کے سمندر میں ایک تیل بردار جہاز کے داخلے کی غلطی کے نتیجے میں جزوی صفائی پر مندرجہ بالا رقم سے کم از کم دوگنا رقم خرچ ہوتی تھی۔ لیکن شاید یہ معمولی باتیں ہیں۔ کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ ہماری آج کی دنیا میں کسی معمولی غلط فہمی کے سبب ایسی ہولناک ایٹمی جنگ بھی شروع ہو سکتی ہے جو کرۂ ارض سے زندگی اور تہذیب دونوں کا نام و نشان مٹا دے گی۔

تجریدی فکر کی اہلیت ''تنقیدی فکر'' کی اساس ہے اور یہ اہلیت جدید دنیا سے ہم آہنگی کے لیے ناگزیر ہے۔ آج کی جدید دنیا کے بہت سے مسائل حل کرنے کے لیے ہمیں اس اہلیت کی ضرورت پیش آتی ہے۔

کھلے ذہن کا اہم کردار

اور کچھ نہیں تو یہ کتاب ہمیں اس امر کی تنبیہہ ضرور کرتی ہے کہ ہمیں اپنے حقائق

اور نتائج کے بارے میں مکمل طور پر یقین نہیں ہونا چاہیے۔ ہمیں اپنے ذہن کھلے رکھنے چاہئیں جو ہماری غلطیوں کی نشاندہی کر سکیں۔ جب استثنائی صورتیں اور تضادات نمودار ہوتے ہیں تو ہم ذہنی کوفت محسوس کرتے ہیں۔ جب ہم چاہتے کچھ ہیں اور ہوتا کچھ ہے یا پھر جب ہم ''جانتے'' ہیں کہ فلاں بات ہونی چاہیے' لیکن وہ نہیں ہوتی یا جب کوئی شخص ہماری کسی پکی رائے سے اختلاف کرتا تو پھر ہمیں ان امور کے بارے میں پوری سنجیدگی سے غور و فکر کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس قسم کے تضادات ہمیں جتلاتے ہیں کہ حقائق یا نتائج غلط ہو سکتے ہیں۔ تب ہمیں ان خامیوں' کوتاہیوں اور مغالطّوں کا تعین کرنا پڑتا ہے۔ جو استدلال اور مسائل حل کرنے کے عمل میں رکاوٹ بنتے ہیں۔

تسلیم شدہ حقائق' نتائج اور آرا کو چیلنج کرنے والا دانش ور معاشرے میں تعمیری اور مثبت کردار ادا کرتا ہے۔ وہ ہمیں یاد دلاتا ہے کہ اہم امور کو آنکھ بند کر کے قبول نہیں کرنا چاہیے۔ حقائق بدلتے رہتے ہیں' آرا اور نتاء بھی بدلنے چاہئیں' لہٰذا ہمیں اپنے ذہن بند نہیں رکھنے چاہئیں۔

بعض دانش ور البتہ پسند ہوتے ہیں۔ وہ ہر حقیقت اور تسلیم شدہ فیصلے کو چیلنج کرنے کے درپے رہتے ہیں۔ وہ ہمیں حیرت میں ڈال کر خوش ہوتے ہیں اور اپنی ذہانت کا سکہ بٹھانا چاہتے ہیں لیکن اس رویے سے فائدہ کم اور نقصان زیادہ ہوتا ہے۔ اس سے معاشرتی اور نفسیاتی انتشار کا خدشہ پیدا ہوتا ہے۔

سائنس نے ہم لوگوں کو بہت سا نیا علم مہیا کیا ہے اور وہ معقول حد تک قابلِ اعتماد بھی ہے۔ اس نے سائنس کے طریق ہائے کار سے ہم بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ سائنس نے ہمیں حقائق اکٹھے کرنے ان کی جانچ پڑتال کرنے' تصدیق کرنے اور ان سے نتائج اخذ کرنے کے عمل میں معروضی رویہ اختیار کرنے کی اہمیت کا درس دیا ہے۔ اس نے ہمیں ایسے آلات مہیا کئے ہیں جن کے ذریعے ہم حقائق و نتائج کے درست یا غلط ہونے کا تعین کر سکتے ہیں۔ سائنس نے سچائی کا احترام بڑھایا ہے اور ساتھ ہی چالبازی اور بددیانتی کی تحقیر میں شدت پیدا کی ہے۔ سائنسی رویے اور طریقے انسانی علم میں اضافہ کرتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ مشکل مسائل سے عہدہ برآ ہونے کی ہماری اہلیت کو بھی تقویت دیتے ہیں۔

مندرجہ ذیل بنیادی اصول یاد رکھیے

کھلے ذہن کے بغیر سوچ واضح نہیں ہوتی۔ کشادہ ذہن لوگ مندرجہ ذیل اہم اصولوں کو پیشِ نظر رکھتے ہیں۔

☆ حقائق اور خاص طور پر عمومی حقائق کو ضروری جانچ پڑتال اور تصدیق کے بغیر درست تسلیم نہیں کرنا چاہیے۔ بہتر بات یہ ہے کہ جانچ پڑتال اور تصدیق زیادہ لوگ کریں۔

☆ جب کبھی غلط یا مبہم حقائق اور مغالطہ آمیز استدلال کی طرف اشارہ کرنے والے تضادات نمایاں ہوں تو رک جایئے' غور کیجئے اور جائزہ لیجئے۔

☆ تعصّبات اکثر اوقات ہمارے ذہن پر پردہ ڈال دیتے ہیں اور مسائل کے حل میں رکاوٹ بنتے ہیں۔

☆ تحریری یا زبانی الفاظ کے ذریعے ابلاغ سہل نہیں۔ ہمیں ان طریقوں سے خبردار رہنا چاہیے جن کے ذریعے' زبان یا نحو کے غلط استعمال سے ابلاغ میں مغالطے پیدا ہوتے ہیں۔

☆ حقائق یا مقدمات غلط یا مبہم ہوں' حد سے زیادہ تعمیم کاری سے کام لیا جائے' نتائج کی طرف چھلانگ لگائی جائے یا استدلال دوری (سرکلر) یا غیر منطقی ہو تو پھر عقلی فکر کا عمل بھٹک جاتا ہے۔

☆ بہت سے افراد یا گروپ حقائق کی شعبدہ بازی' حقائق سے عاری جذباتی اپیلوں' لاشعوری پیغام رسانی یا اس کتاب میں بیان شدہ دوسرے طریقے استعمال کر کے ہمارے نقطہ نظر اور عمل پر اثر انداز ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔

تاریخ کا سبق یہ ہے کہ ہم مخالف آرا کے معاملے میں رواداری سے کام لیں۔ مخالف نقطہ نظر میں عموماً کسی نہ کسی حد تک سچائی ہوتی ہے۔ ہمارا کام یہ ہے کہ ہم متفقہ نکات تلاش کریں اور

پھر مل جل کر سماجی اور سیاسی مسائل حل کرنے کے لیے ان کو تعمیری انداز میں بروئے کار لائیں۔

اس وقت کرہ ارض پر پانچ ارب سے زیادہ انسان آباد ہیں۔ یہ سب لوگ پانچ چھ بڑے اور سینکڑوں چھوٹے مذاہب پر ایمان رکھتے ہیں۔ دنیا میں ہزاروں قسم کی مختلف ثقافتیں اور پسِ منظر ہیں۔ ان میں سے ہر کوئی کسی نہ کسی حد تک برتری کا دعویدار ہے۔ آج کے نئے طرز کے سماج میں امن اور ماحول کے سنگین مسائل حل کرنے کے لیے ایک دوسرے کو سمجھنا' ایک دوسرے کے نقطہ نظر کا احترام کرنا اور اختلافات کی صورت میں مصالحت پر آمادہ رہنا بے حد ضروری ہے۔

یہ اہم مقصد صرف واضح سوچ کے ذریعے ہی حاصل ہوسکتا ہے۔